غالب کے کلام میں الحاقی عناصر



بترمیم و اضافہ

نادم سیتاپوری

مدینہ پبلشنگ کمپنی، بندر روڈ کراچی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ؕ

غالب کے کلام میں الحاقی عناصر

(بترمیم و اضافہ)

نادم سیتاپوری

ناشر

مدینہ پبلشنگ کمپنی بندر روڈ کراچی

پہلا پاکستانی ایڈیشن ـــــ ترمیم و اضافہ کے ساتھ

ناشر ـــــ مدینہ پبلشنگ کمپنی بندر روڈ کراچی

مطبع ـــــ مشہور آفسٹ لیتھو پریس کراچی

قیمت ـــــ بارہ روپے ~~دس~~ روپیہ



اس پہ گزرے نہ گماں ریو و ریا کا زنہار   غالب بُرا نہ مان جو واعظ بُرا کہے

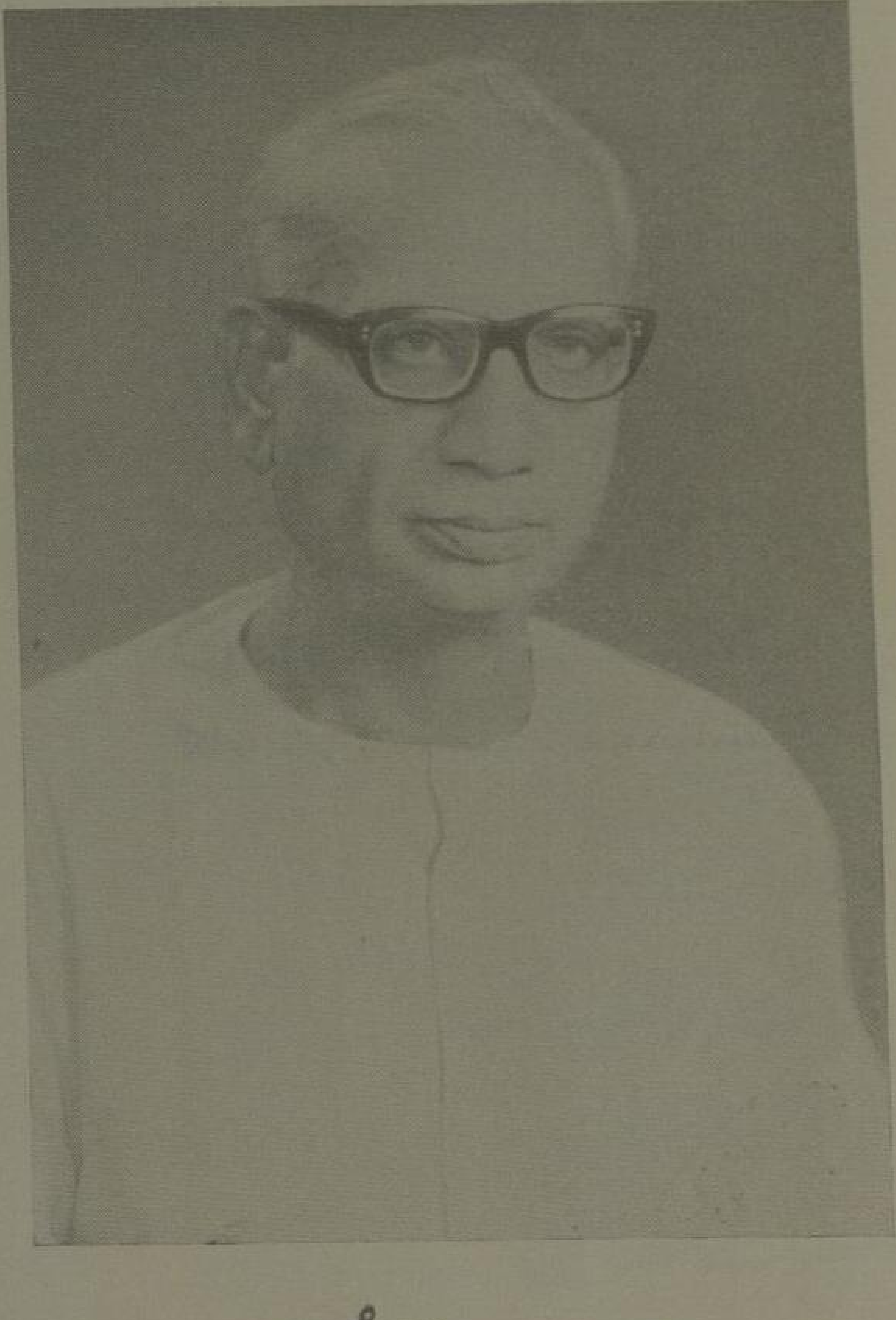
غالبِ خاک نشین اہلِ خرابات سے ہے   ایسا بھی کوئی ہے کہ سب اچھا کہیں جسے؟

یہ مسائلِ تصوف۔ یہ ترا بیان غالب

تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

جنابِ ڈاکٹر ممتاز حسن
(ستارۂ پاکستان) کے نام

نادم سیتاپوری



نادم سیتاپوری

عنوانات

مولانا عبدالماجد دریابادی

پیشِ لفظ

اپنی دینی بداعتقادی کی زندگی کی طرح ادبی، شعری، علمی زندگی میں بھی انقلابات بارہا دیکھے۔ کبھی میرؔ کا معتقد رہا کبھی داغؔ کا۔ برنرڈشا کا کبھی مخالف رہا کبھی دلدادہ۔ نثر کبھی شررؔ کی دلآویز نظر آئی کبھی سرشار کی۔ وقس اعلیٰ ہذا۔

لیکن غالبؔ سے عقیدت اِن سارے انقلابات سے محفوظ رہی۔ بچپن سے جو عظمت دل پر غالب کی بیٹھی وہ آج تک چلی آرہی ہے۔ جس سِن میں مولوی محمد اسمٰعیل مرحوم میرٹھی کی ریڈریں پڑھتا تھا غالبؔ اس وقت جیسے محبوب تھے ویسے ہی آج بھی ہیں۔ فرق صرف اتنا ہوا ہے کہ کسی دور میں ان کا کلام فلاں قسم کا وجد آفریں تھا اور کسی دور میں فلاں دوسرے قسم کا۔ نفس محبوبیت ان کے کلام کی ہر دور میں قائم رہی۔

اُردو میں میری پسند کے شاعر ایک دو نہیں بلا مبالغہ بیسیوں کی تعداد میں ہیں لیکن اگر مجھ سے کہا جائے کہ جنگل بیابان میں جاکر کہیں معتکف ہو جاؤ اور اپنے ساتھ کسی ایک اُردو شاعر کا دیوان لے جاسکتے ہو ـــ تو میں اس دفتر بے پایاں سے انتخاب صرف ایک دیوان غالبؔ کا کروں گا اور اپنے ہر ذوق کی تسکین اسی ایک حکمت، معرفت، شوخی، ظرافت، سوز و گداز، رفعت تخیل و حسن تعلیل کے مجموعہ سے کرلوں گا۔

غالبؔ ہماری تاریخ شعر و ادب۔ تہذیب و ثقافت کا ایک مستقل در

اہمنٹ باب ہے۔ غالبؔ کی خدمت کرنا عین اپنے شعر و ادب۔ تہذیب و ثقافت کی خدمت ہے۔ مبارک ہے وہ جو اس خدمت کی توفیق پاتا ہے۔

نادمؔ صاحب (سیتا پوری) پرانے غالب دوست۔ غالب فہم۔ غالب سنج ہیں۔ ان کے ذوق و طبع سلیم پر اعتماد کر کے اور مسودہ کتاب کو دیکھے بغیر یقین رکھتا ہوں کہ انھوں نے جو کچھ بھی لکھا ہوگا سوچ سمجھ کر، تلاش و کاوش کے بعد اور ذمہ داریوں کے پورے احساس کے ساتھ لکھا ہوگا۔

ان کی یہ تازہ تراوش قلم یقیناً غالبیات کے ذخیرے میں ایک دلچسپ اور قابل قدر اضافہ ہوگی۔

اس کے بعد مسودہ (کتاب) کی بھی جھلک سرسری در سرسری دیکھنے کو مل گئی۔ عین اس وقت جب وہ پریس کو جا رہا تھا — یہ تو داستان ہی دوسری نکلی۔ بالکل معاملہ "ایں گل دیگر شگفت"، تھا۔

تحقیق کے کوچے سے تو میں ہو کر بھی نہیں گذرا۔ البتہ یہ کہہ سکتا ہوں کہ داستان ہے بڑی دلچسپ اور بڑی ہی سبق آموز۔!

حرفے چند

غالبؔ کے کلام کے ساتھ دوسروں کا ہمرنگ کلام کس طرح گھل مِل کر کلام غالبؔ کا جزو بن گیا؟ یہ بحث سخت بھی ہے اور دشوار تر بھی! کیونکہ اس مسئلہ کو بہت سے غالب پسندوں نے "ذوق و وجدان" کا سوال بنالیا ہے اور جس طرح کسی کے معتقدات کو محض عقلی دلائل سے زیر نہیں کیا جاسکتا اسی طرح کسی کی وجدانی کیفیات میں دخیل ہونا بھی آسان نہیں ہے۔ غالبؔ کے کلام نے وجدان اور محسوسات کی جن منازل کو طے کیا ہے اس نے سخن فہمی اور سخن شناسی کا ایک نیا مزاج پیدا کردیا جس کا بہت کچھ دار و مدار دقیقہ سنجی اور نکتہ رسی کے ساتھ ساتھ فارسی تراکیب کے استعمال پر بھی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ غالبؔ کا ہمرنگ کلام جو ان کے نام سے موسوم ہوگیا ہے۔ اس کی پرکھ زیادہ تر داخلی اسباب کی بنا پر کی جاتی ہے اور خارجی عوامل و اسباب کو یک قلم نظرانداز کردیا جاتا ہے۔

ان اوراق میں کوشش کی گئی ہے کہ غالبؔ کے کلام میں الحاقی عناصر کی چھان بین زیادہ تر خارجی اسباب کی بنا پر کی جائے واقعاتی اور تاریخی حیثیت سے جن اشعار کی اصلیت مشکوک و مشتبہ نظر آئی اسی کلام کو الحاقی کلام قرار دیا گیا ہے نکتہ سنج، فارسی تراکیب اور پرشکوہ الفاظ کا سہارا لے کر میں نے خود رنگِ سخن کی بنیاد پر اسے کلام غالبؔ قرار دینے میں بہت کچھ احتیاط سے کام لیا ہے۔

غالب کے کلام میں الحاقی عناصر کی بحث بالکل نیا موضوع ہے جس پر پہلی بار تحقیقی نگاہ سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ تحقیق کی اہم ذمہ داریوں کو سنبھالنے میں میری کوششیں کس حد تک کامیاب رہیں؟ اس کا فیصلہ تو اربابِ نظر ہی کریں گے! مجھے صرف اس قدر عرض کرنا ہے کہ میں نے حتی الامکان اس موضوع کے ساتھ دیانتدارانہ اشتراک و تعاون سے دریغ نہیں کیا ہے۔

اپنے نہایت ہی قابلِ احترام دوست حضرت مولانا امتیاز علی خاں عرشی رامپوری کا میں سب سے زیادہ سپاس گذار ہوں جنھوں نے اپنے عالمانہ اور مخلصانہ مشوروں سے قدم قدم پر میری رہنمائی فرمائی اور بعض ایسی ضروری کتابیں بھی مجھے استفادے کے لئے مرحمت فرمائیں جن کے بغیر اس کام کا پایۂ تکمیل تک پہونچنا دشوار تھا خصوصاً حضرت مولانا نے مجھے اپنا وہ خاص نسخہ "دیوان غالب" (نسخۂ عرشی) بھی بھیجدیا جو نئے ایڈیشن کے لئے زیر تصحیح ہے اور اس پر مولانا اپنے قلم سے جابجا ترمیم و تنسیخ فرما رہے ہیں۔

اسی طرح عزیزی جناب اکبر علی خاں صاحب ایڈیٹر ماہنامہ "نگار" رام پور نے کچھ یادداشتیں بھی مرتب کر کے بھیجیں اور اپنا ایک غیر مطبوعہ مضمون "ضمیمہ نسخۂ عرشی" بھی — اور ان کے اس عزیزانہ و مخلصانہ تعاون کا میں ممنون ہوں۔

برادر معظم حضرت مولانا عبدالماجد دریا آبادی کی بزرگانہ شفقت کا شکریہ ادا کرنا بھی ضروری ہے جنھوں نے اپنے علمی مشاغل میں سے ایک اچھا خاصا حصہ اس مسودہ کی ورق گردانی میں صرف کیا۔ کاش موصوف کے پاس اتنا وقت ہوتا کہ چھپنے سے پہلے اس مسودے کو اطمینان سے ملاحظہ فرما سکتے۔

دیرینہ رفیق اور عزیز دوست جناب محمد آفاق نقوی سیتاپوری کا نام اس فہرست میں صرف اسی اعتبار سے نہیں آرہا ہے کہ انھوں نے اس کتاب کے مسودے کو آخری مراحل میں ایک ہم ذوق کی نگاہ سے دیکھکر اپنے دوستانہ مشورں

سے نوازا، یا اس کتاب کے سلسلے میں جگہ جگہ تقابلی کام میں بھی میری مدد فرمائی بلکہ ان کی اعلیٰ صلاحیتیں اپنے ہم عمر ماموں برادرم سید رئیس احمد جعفری ندوی کی طرح میرے لئے ہمیشہ "انجمن کار" رہیں۔ اور ہم دونوں نے ایک ساتھ مل بیٹھ کر ادبی اُتار چڑھاؤ کو ہمیشہ ایک زاویۂ نگاہ سے دیکھا۔ سوچا اور پرکھا اور بڑے سے بڑے ادبی مسئلہ میں ہم دونوں کبھی ایک دوسرے سے جُدا نہیں رہے۔!

پیش نظر "پاکستانی ایڈیشن" جناب حکیم محمد تقی صاحب دہلوی (مدینہ پبلشنگ کمپنی کراچی) کے تعاون واشتراک سے پیش کیا جارہا ہے۔ اس میں کچھ اہم اضافے بھی ہیں اور معمولی سی ترمیم بھی۔ امید تو یہی ہے کہ پہلے ایڈیشن میں جو کمی رہ گئی تھی وہ اس جدید ایڈیشن میں ضرور پوری ہوگئی ہوگی برادرم حضرت صہبا لکھنوی (ایڈیٹر ماہنامہ افکار کراچی) کا ممنون ہوں جنھوں نے اس دوسرے ایڈیشن کی اشاعت کے سلسلے میں قدم قدم پر مجھ سے اشتراک کیا ــــ اور احمد طاہر صاحب کے تعاون سے تصحیح کتابت میں میری مدد فرمائی جس کے لئے میں ان دونوں کا شکر گذار ہوں۔

نادم سیتاپوری

مطالعات

۱۔ غالب نامہ شیخ محمد اکرم۔ مطبوعہ مرکنٹائل پریس لاہور ۱۹۳۶ء
۲۔ یادگار غالب (حالی) سرورق غائب ہے۔
۳۔ تذکرہ آب حیات۔ مطبوعہ مطبع مفید عام لاہور۔ ۱۸۸۷ء
۴۔ تذکرہ آب بقا (خواجہ عشرت لکھنوی) مطبوعہ نولکشور پریس لکھنؤ (طبع اوّل)
۵۔ تذکرہ تلامذۂ غالب (مالک رام) شائع کردہ مرکز تصنیف و تالیف نکودر۔ ۱۹۵۸ء
۶۔ مرقع غالب (خیر بہوروی) مطبوعہ اسرار کریمی پریس الہ آباد
۷۔ افادات مہدی (مہدی الافادی) مطبوعہ سرفراز پریس لکھنؤ۔
۸۔ مرزا رسوا کے تنقیدی مراسلات مطبوعہ مسلم ایجوکیشنل پریس (علی گڑھ)
۹۔ تنقیدات عبدالحق۔ مطبوعہ شمس الاسلام پریس حیدر آباد دکن۔ ۱۹۳۴ء
۱۰۔ لطائف الشعراء، مفتی انتظام اللہ خاں شہابی مرحوم۔ مطبوعہ فاروقی پریس دہلی
۱۱۔ احوال غالب۔ ڈاکٹر مختار الدین احمد آرزو۔ مطبوعہ دہلی پرنٹنگ ورکس دہلی۔ ۱۹۵۳ء

۱۲۔ کلیات میر (مولانا عبدالباری آسی مرحوم) مطبوعہ نولکشور پریس لکھنؤ ۱۹۴۱ء

۱۳۔ دیوان جی۔ (ظریف لکھنوی) مطبوعہ الواعظ صفدر پریس لکھنو ۱۹۴۹ء

۱۴۔ مکمل شرح کلام غالب (مولانا عبدالباری آسی مرحوم)
مطبوعہ اشاعت العلوم پریس لکھنؤ

۱۵۔ نشاط غالب۔ (وجاہت علی سندیلوی) مطبوعہ سرفراز پریس لکھنؤ
۱۹۶۴ء

۱۶۔ دیوان غالب اردو (قلمی) مخطوطہ ۱۴؍جنوری ۱۸۷۴ء

۱۷۔ 〃 مطبوعہ نولکشور پریس لکھنؤ۔ اگست ۱۸۷۷ء

۱۸۔ 〃 مطبوعہ نامی پریس لکھنؤ۔ جنوری ۱۸۹۱ء

۱۹۔ 〃 〃 مارچ ۱۸۹۸ء

۲۰۔ 〃 〃 جنوری ۱۹۲۶ء

۲۱۔ 〃 〃 نومبر ۱۹۳۰ء

۲۲۔ 〃 مطبوعہ مطبع صدر مجلس لکھنؤ۔ اپریل ۱۸۸۲ء

۲۳۔ 〃 مطبوعہ نول کشور پریس لکھنؤ۔ ۱۳۰۴ھ

۲۴۔ 〃 〃 فروری ۱۹۰۳ء

۲۵۔ 〃 〃 جون ۱۹۲۵ء

۲۶۔ 〃 〃 جنوری ۱۹۴۷ء

۲۷۔ 〃 〃 اگست ۱۹۵۷ء

۲۸۔ 〃 〃 اگست ۱۹۶۰ء

۲۹۔ 〃 (نظامی بدایونی) مطبوعہ نظامی پریس بدایوں ۱۹۲۲ء

۳۰۔ 〃 〃 〃 〃 ۱۹۲۷ء

۳۱۔ 〃 (حسرت موہانی) مطبوعہ انوار المطابع لکھنؤ ۱۹۲۲ء

۳۲۔ 〃 اردو (طاہر ایڈیشن) مطبوعہ لیبل آرٹ پریس دہلی ۱۹۳۶ء

۳۳۔ دیوان غالب اُردو شائع کردہ تاج کمپنی لمیٹڈ لاہور۔ ۱۹۳۸ء

۳۴۔ " " (نسخہ مالک رام) شائع کردہ آزاد کتاب گھر دہلی۔
۱۹۵۷ء

۳۵۔ " " (نسخہ عرشی) شائع کردہ انجمن ترقی اُردو
علی گڈھ ۱۹۵۸ء

۳۶۔ " " (نسخہ حمیدیہ) مرتبہ مفتی انوار الحق مرحوم (سرورق غائب ہے)

۳۷۔ شرح طباطبائی (نظم طباطبائی) مطبوعہ مطبع مفید الاسلام
حیدر آباد دکن ۱۳۱۸ھ

۳۸۔ حل کلیات غالب (شوکت میرٹھی) مطبوعہ شوکت المطابع میرٹھ
اکتوبر ۱۸۹۹ء

۳۹۔ مراۃ الغالب (بیخود دہلوی) مطبوعہ محبوب المطابع دہلی ۱۹۲۴ء

۴۰۔ ہدیۂ سعیدیہ (قاضی سعید الدین احمد) مطبوعہ مطبع مسلم یونیورسٹی
علی گڈھ۔ ۱۹۲۶ء

۴۱۔ گنجینۂ تحقیق (بیخود موہانی) نظامی پریس لکھنؤ۔ ۱۹۳۲ء

۴۲۔ ماہنامہ سخن ور لکھنؤ (مدیر مولانا عبدالباری آسی) جون ۱۹۳۴ء

۴۳۔ ہفت روزہ فتنہ و عطر فتنہ گورکھپور۔ ۳۰ مئی ۱۹۰۶ء

۴۴۔ " " ۳۰ جولائی ۱۹۰۶ء

۴۵۔ " " یکم مئی ۱۹۰۷ء

۴۶۔ علی گڈھ میگزین (غالب نمبر) ۱۹۴۸ء - ۱۹۴۹ء

۴۷۔ اُردوئے معلیٰ دہلی (غالب نمبر) شمارہ اول و دوم ۱۹۶۰ء

۴۸۔ جلد روزنامہ ہمدرد دہلی ۱۹۱۳ء

۴۹۔ رسالہ شعور حیدر آباد پاکستان۔ شمارہ ۵-۶

۵۰۔ ماہنامہ آجکل دہلی۔ اگست ۱۹۵۲ء

۵۱۔ سہ ماہی فکر و نظر علی گڈھ۔ جنوری ۱۹۶۱ء

۵۲۔ ماہنامہ "ماہ نو" کراچی۔ جولائی ۱۹۶۴ء

۵۳۔ ماہنامہ "نیرنگ" رامپور۔ اگست ۱۹۲۶ء

۵۴۔ ماہنامہ معارف اعظم گڈھ۔ نومبر ۱۹۳۰ء

۵۵۔ ہفت روزہ سرفراز لکھنؤ ۱۷ر مئی ۱۹۵۳ء

۵۶۔ نقوش لاہور (آپ بیتی نمبر) ۱۹۶۴ء

۵۷۔ ماہنامہ نیا دور لکھنؤ۔ جون ۱۹۵۹ء

۵۸۔ " اکتوبر ۱۹۵۹ء

۵۹۔ " ستمبر ۱۹۶۰ء

۶۰۔ ہماری زبان علی گڈھ۔ ۸ر مئی ۱۹۶۰ء

۶۱۔ " ۱۵ر مئی ۱۹۶۰ء

۶۲۔ " یکم جون ۱۹۶۰ء

۶۳۔ " ۸ر اگست ۱۹۶۰ء

۶۴۔ " یکم اگست ۱۹۶۱ء

۶۵۔ " ۱۵ر مارچ ۱۹۶۲ء

۶۶۔ " یکم اپریل ۱۹۶۲ء

۶۷۔ انتخاب غالب (مولانا عبدالرزاق راشد) مطبوعہ چشتیہ پریس حیدرآباد دکن ۱۳۴۵ھ

۶۸۔ سہ ماہی "اردو" کراچی۔ غالب نمبر۔ مارچ ۱۹۶۹ء

۶۹۔ سہ ماہی "صحیفہ" لاہور۔ غالب نمبر (حصہ اول) مارچ ۱۹۶۹ء

۷۰۔ ماہنامہ آجکل دہلی۔ جون ۱۹۶۹ء

۷۱۔ ماہنامہ آجکل دہلی۔ جولائی ۱۹۶۹ء

۷۲۔ دیوان غالب (اردو) مرتبہ مولانا غلام رسول مہر۔ غلام علی اینڈ سنز لاہور۔ ۱۹۶۷ء

۷۳۔ ترجمہ پنج آہنگ شائع کردہ انجمن ترقی اردو پاکستان ۱۹۶۹ء
۷۴۔ ماہنامہ "مبصر" لکھنؤ بابتہ مئی ۱۹۲۹ء
۷۵۔ "غالب" از مولانا مہر (چوتھا ایڈیشن)
۷۶۔ اودھ پنچ لکھنؤ۔ ۱۹ اگست ۱۹۲۵ء
۷۷۔ عروس ادب۔ مطبوعہ نگار مشین پریس لکھنؤ۔ ۱۹۲۷ء
۷۸۔ نثر ریاض خیر آبادی۔ مطبوعہ اعظم اسٹیم پریس حیدر آباد دکن
۷۹۔ ماہنامہ۔ العصر لکھنؤ۔ اگست و ستمبر ۱۹۱۳ء
۸۰۔ اصلاحات غالب۔ اعجاز پرنٹنگ پریس حیدر آباد دکن۔
۸۱۔ چراغ سخن۔ نولکشور پریس لکھنؤ۔ دسمبر ۱۹۲۱ء
۸۲۔ ماہنامہ "ماہ نو" ماہ فروری ۱۹۵۳ء
۸۳۔ ماہنامہ "ماہ نو" کراچی۔ ماہ فروری ۱۹۵۶ء
۸۴۔ ماہنامہ افکار۔ کراچی (غالب نمبر) فروری۔ مارچ ۱۹۶۶ء
۸۵۔ ماہنامہ افکار۔ کراچی (غالب نمبر) فروری۔ مارچ ۱۹۶۹ء

اسد سے غالبؔ تک

نقش فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا
(غالبؔ)

محب محترم مولانا عرشی دیوان غالب (نسخۂ عرشی) کے مقدمہ میں تحریر فرماتے ہیں۔

"ابتداً میرزا صاحب" اسد تخلص کرتے تھے، بعد ازاں اپنے نام اسداللہ کی مناسبت سے غالب لکھنے لگے۔ چنانچہ منشی شیو نرائن کو اپریل ۱۸۵۹ء میں تحریر کیا ہے۔

"میں نے تو کوئی دو چار برس ابتدا میں اسد تخلص رکھا ہے ورنہ غالب ہی لکھتا رہا ہوں۔"

لیکن — یہ دو چار برس، صحیح تخمینہ نہیں۔ کیونکہ وہ اپنی شعر گوئی کی پہلی منزل" بیدلی رنگ" کے زمانے میں" اسد" ہی لکھتے رہے ہیں۔ البتہ فارسی میں سرے سے غالب تخلص ہی استعمال کیا ہے۔ جس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ انھوں نے فارسی کے لئے تخلص پسند کیا تھا، بعد میں ریختہ کے اندر بھی لکھنے لگے۔" (صفحہ ۸ و ۹ نسخۂ عرشی)

جناب مالک رام کا ارشاد ہے۔

"شروع میں انھوں نے تخلص" اسد" کیا تھا۔ لیکن یہ صرف چند برس کے لئے! ہوا یہ کہ لوگ ایک اور بزرگوار" میر امانی اسد" (شاگرد میرزا سودا) کا کلام معجز نظام، ان سے منسوب کرنے لگے چونکہ وہ پرانی طرز کے شاعر تھے اور یہ روش میرزا کو ایک آنکھ پسند نہیں تھی

اس لئے وہ اس اقتباس پر بہت جز بز ہوتے لیکن کچھ کرتے بھی نہ بنتی۔ آخر تخلص بدل کر "غالب" کرلیا۔ (اردوئے معلیٰ ص ۲۷۴، ۲۷۵ خطوط غالب (۱) ص ۳۹۵ بنام شیو نرائن) جو حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے لقب "اسد اللہ الغالب" کی وجہ سے سامنے کی چیز تھی۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ اس کے بعد انھوں نے اسد تخلص بالکل ہی استعمال نہیں کیا۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ اس کے بعد جب کبھی ضرورت محسوس ہوتی وہ بے تکلف اسد لکھ لیتے تھے۔ مثلاً ۱۸۶۶ء میں جب انھوں نے ایک پرانی غزل نواب کلب علی خاں والی رام پور کی نذر کی تو مقطع بدل کر اس میں اسد تخلص ڈال دیا۔ حالانکہ پہلے اس میں غالب تھا۔ (دیوان ص ۱۳۵) اسی طرح وہ غزل جس کا مطلع ہے ؎

ممکن نہیں کہ بھول کے بھی آرمیدہ ہوں
میں دشت غم میں آہوئے صیاد دیدہ ہوں

یہ انھوں نے ۱۸۶۷ء میں نواب امین الدین خاں والی لوہارو کے واسطے لکھی تھی اس میں تخلص اسد ہے (دیوان ص ۲۸۴)

(صفحہ ۱۰ و ۱۱ دیوان غالب مرتبہ مالک رام)

غالبیات پر کام کرنے والوں میں اس مسئلہ پر کچھ زیادہ اختلاف نہیں ہے کہ غالب کی شاعری کا آغاز "ریختہ" ہی سے ہوا؟ اس سے پہلے ان کا فارسی کا کوئی کلام اگر ملتا ہے یا اسی دور میں انھوں نے فارسی کی جو ایک آدھ غزل کہی بھی ہے تو برائے نام۔ اس سے باقاعدہ طور پر کسی مخصوص رنگ کی نشاندہی نہیں ہوتی۔

جس ماحول میں غالب نے آنکھ کھولی اور ان کے مزاج میں جس قسم کی انفرادیت اور تنوع تھا اس نے ان کے مزاج میں ایک خاص قسم کے باغیانہ شعور کی نشو و نما کی۔ اور ان کی بلند و ارفع صلاحیتوں نے شعور کی پختگی قبول کرنے سے پہلے ہی یہ محسوس کرلیا کہ اس دور میں اپنی انفرادیت اور خود رُبائی کو قائم و برقرار رکھنے کے لئے "وبائے عام میں مرنے" سے احتراز ضروری ہے۔ تصوف کے گہرے

مسائل کو انھوں نے اپنی نگاہ میں رکھا لیکن خانقاہوں کے کجکلاہی جاہ و جلال کے آگے سر تسلیم خم نہیں کیا۔ اُمرائے وقت اور شاہان عصر کے قصائد تو لکھے مگر تشبیب کی بزم آرائیوں میں مدح و ستائش کا توازن اس طرح قائم کر دیا کہ قصیدے کی فنی خصوصیات زیادہ ابھر آئیں۔ مشہور نقاد جناب آل احمد سرور نے غالبؔ کا ارتقائی تجزیہ کرتے ہوئے لکھا ہے۔

"غالبؔ جب جوان ہوئے اور شعر کہنے لگے تو اپنے گرد و پیش میں انھیں ذہنی آسودگی نہ ملی (بلکہ) اپنے اشعار میں ملی۔ ان اشعار میں کوہ کندن و کاہ برآوردن بھی ہے۔ الہام بھی اور اہمال بھی۔ ان سے غالب کی انفرادیت ظاہر ہوتی ہے، پہلے دور کے اشعار میں نظر زیادہ ہے نظارہ کم! مگر نظر کی موجودگی سے آگے کے روشن نظاروں کا علم ہوتا ہے ان اشعار میں ایک رومانیت جھلکتی ہے جو اس زمانے کے کلاسیکل معیاروں سے مطمئن نہیں ہے لیکن۔ جیسے ابھی زندگی کے رومان کے بجائے خیالی طلسمات پسند آئے ہیں۔ غالبؔ بیدلؔ کے چکر سے نکلنے کے باوجود بیدلؔ کی رمزیت کو نہ چھوڑ سکے اس رمزیت نے ان کی شاعری میں عجیب عجیب گل کھلائے یہ معمولی بات نہیں ہے کہ بیدلؔ کے بعد غالب حزیںؔ، ظہوریؔ، عرفیؔ اور نظیریؔ کی طرف متوجہ ہوئے اور میرؔ کی طرف سب سے آخر میں! یہ ترتیب ان کی شاعری کے ارتقا میں بڑی اہمیت رکھتی ہے۔"

غالبؔ کو ایک تندرست جسم۔ رگوں میں دوڑتا ہوا لہو! اور ایک بےچین طبیعت فطرت سے حاصل ہوئی۔ جوان ہونے پر انھیں ایک طبقے کی مشکلات کا علم ہوا۔ جاگیردارانہ نظام کے ایک ممتاز فرد ہونے کی وجہ سے ان میں وضعداری شان امتیاز۔ حسن پرستی، انانیت، کینہ پروری آئی! بچپن کی فارغ البالی زندگی کا ایک "آئیڈیل" بن گئی جسے حاصل کرنے کی کوشش میں وہ ساری عمر لگے رہے پنشن کی تگ و دو۔ محض مالی جد و جہد نہیں ہے۔

"ایک خاندانی حق کو حاصل کرنے کی کوشش بھی ہے قصیدہ گوئی محض خوشامد

نہیں ہے کمال فن کا مظاہرہ بھی ہے یہی وجہ ہے کہ وہ تشبیب میں بڑے بڑوں سے آگے نکل جاتے ہیں۔ گو مدح میں افتاں خیزاں نظر آتے ہیں۔ شاہی کے اس آخری دور میں وہ پہلے "انفرادیت پرست" تھے۔ اور انفرادیت پرستی کا دور ابھی آیا نہ تھا۔ شاہی کے اس دور کو باقی رکھنے کے لئے جس مذہبی جذبہ کی مدد مل جاتی تھی غالب وہ مدد نہ دے سکتے تھے ان کے یہاں مذہبیت نہ گہری ہے نہ زیادہ اہم! وہ ہندوستانی تصوف ایک آزادی ماورائیت اور وحدانیت تو لے لیتے ہیں مگر اس کی طرف بھی زیادہ توجہ نہیں کرتے۔ ہاں ان کے یہاں جو "وسیع المشربی" ہے وہ ان کی انسان دوستی کو ظاہر کرتی ہے۔ ان کے دوستوں میں انگریز ہندو، شیعہ، سنی، کٹر مولوی اور پرانے رند مشرب سب شامل ہیں۔ وہ ان سب میں مل جاتے ہیں مگر ان سے علیحدہ بھی ہیں۔ عورت اور شراب ان کے "نشاط زندگی" کو بڑھاتے ہیں۔ یہ ان کی زندگی نہیں ہیں اردو شاعری میں ان کی مہذب رندی ایک نئی روایت کا آغاز کرتی ہے"

(علی گڑھ میگزین غالب نمبر بابتہ ۴۹-۱۹۴۸ء)

فارسی فرہنگ و لغات کے مستند عالم ہوں یا نہ ہوں۔ لیکن غالب کو فارسی زبان و ادب سے جو ازلی اور فطری لگاؤ تھا اس نے اپنے معاصرین میں انھیں ایک ممتاز مقام ضرور دے دیا تھا۔ فارسی شعر و ادب پر ان کی گہری نگاہ تھی اور ان کے وسیع مطالعہ کو بیدل، اسیر، شوکت، اور حزیں کی رمزیت نے اتنا متاثر کیا ہے کہ انھوں نے اسی رنگ کو اپنی شاعری کی اساس و بنیاد بنا لیا۔

اردو ریختی یا ریختہ اس وقت تک جس سطحیت سے دوچار ہو چکی تھی! اسے میر و سودا وغیرہ نے بہت حد تک سنوارنے کی کوشش کی تھی۔ لیکن نئی زبان کے ترکیبی عناصر ہندوستان کے جس متضاد لسانی مسائل سے دست و گریباں تھے اس کے تقاضے اظہار خیال اور قوت بیان کی راہ میں حائل تھے۔ نئی زبان کی ترویج و ترقی کی عوامی ضرورتیں "رانی کیتکی" (انشاء) جیسی غیر مفرس اور غیر معرب تصانیف کا مطالبہ کر رہی

تھیں۔ میرؔ، دردؔ، آتشؔ اور انیسؔ کی عام فہم زبان چاہتی تھیں لیکن فکر جدید اور اساتذہ فارسی کی رمزیت کی پہنائیوں کا تقاضا کچھ اور تھا۔ مگر اُردو زبان کی کم وسعتی سدِ راہ تھی۔ مجبوراً فارسی کا سہارا لینا پڑا۔ جو اس دور کے شعری مزاج سے ہم آہنگ نہ ہو سکی چنانچہ یہ رنگ اس زمانہ میں قبول عام نہ حاصل کر سکا۔ بہت ہی محدود حلقے تک اس کی رسائی ہوئی۔ مگر ہوئی تو اس دھوم دھام سے کہ قدر و منزلت کے ہفت افلاک ان پر کھل گئے حالانکہ ان سخن فہموں کی تعداد انگلیوں پر گننے والی تھی۔

"غالب نامہ" کے مولف جناب شیخ محمد اکرام نے غالب کے پہلے دور کا تعین ۱۸۰۷ء سے ۱۸۲۱ء تک کیا ہے اور مولانا عرشی نے اس کی صراحت حسب ذیل الفاظ میں کی ہے:

"میرزا صاحب کی شاعری کا آغاز ریختہ سے ہوا۔" گل رعنا" کے دیباچے میں تحریر فرماتے ہیں۔

"در آغاز خار خار جگر کاوی سوختم ہمہ صرف نگارش اردو زبان بود۔"

نساخ کو لکھتے ہیں:۔

"خاکسار نے ابتدائے سن تمیز میں اردو زبان میں سخن سرائی کی۔"

شاکر کو تحریر فرماتے ہیں:۔

"ابتدائے فکر وسخن میں .... ریختہ لکھتا تھا۔"

نواب شمس الاُمرا وزیر اعظم حیدر آباد (دکن) کو ایک فارسی خط میں لکھا ہے:۔

"در آغاز ریختہ گفتی و بہ اردو زبان غزل سرائی بود۔"

۲۵ سال کی عمر تک زیادہ تر اُردو ہی میں کہتے رہے۔ بعد ازاں فارسی زبان سے فطری لگاؤ کی بنا پر فارسی میں کہنے لگے۔ شاکر کو تحریر کیا ہے:۔

"۱۵ برس کی عمر سے ۲۵ برس کی عمر تک مضامین خیالی لکھا کیا۔ دس برس میں دیوان جمع ہو گیا۔"

نواب شمس الامراء کو رقمطراز ہیں:۔

"تا پارسی زبان ذوق سخن یافت ازاں وادی عنان اندیشہ بر یافت .... کما بیش سی سال ست کہ اندیشہ پارسی سگال ست؟

یہ خط اپریل ۱۸۵۳ء سے پہلے لکھا گیا تھا۔ اس لئے کہ پنج آہنگ کے اس ایڈیشن میں جو مذکورہ بالا تاریخ کو دہلی کے "مطبع دار السلام" سے چھپ کر شائع ہوا تھا یہ خط شامل ہے اور اس میں غالبؔ نے دعویٰ کیا ہے کہ وہ گزشتہ ۳۰ سال سے فارسی میں فکر سخن کرتے ہیں اگر ہم اسے ۱۸۵۲ء کا تسلیم کر کے مجموعے میں سے ۳۰ سال وضع کر دیں تو ریختہ گوئی کے خاتمے اور پارسی سگالی کے آغاز کا سال ۱۸۲۲ء قرار پائے گا۔ اور چونکہ وہ ۱۷۹۷ء میں پیدا ہوئے تھے اس لئے اس وقت ان کی عمر ۲۵ سال کی ہوگی جو شاگرد کے نام کے خط میں ذکر کی جا چکی ہے۔ (صفحہ ۱۴ و ۱۵ دیوان غالبؔ نسخہ عرشی)

اور شیخ محمد اکرام رقمطراز ہیں:-

"اس دور میں ان اشعار کا انتخاب ہے جو ۲۵ سال کی عمر سے پہلے لکھے جا چکے تھے اور "نسخہ حمیدیہ"، (بھوپال) کے متن میں موجود ہیں۔ ہم نے ان اشعار کو تمام کا تمام درج کرنے کے بجائے فقط انتخاب دینے پر اس لئے اکتفا کیا ہے کہ اس دور کے اشعار کو مفتی انوار الحق نے بھی باقی اشعار سے علیحدہ (نسخہ بھوپال میں) شائع کیا ہے۔" (صفحہ ۱۶۶۔ غالبؔ نامہ)

غالبؔ کی اردو شاعری کا دوسرا دور سن ستاون سے شروع ہو کر ان کے آخری لمحۂ زیست پر تمام ہوا۔ مولانا عرشی لکھتے ہیں:-

"۲۵ سال کی عمر کے بعد میرزا صاحب فارسی زبان کی نظم و نثر کی طرف زیادہ متوجہ ہو گئے اور تقریباً ۲۵-۳۰ سال تک آتش پارسی ہی سے اپنے دل و دماغ کو گرم و آسودہ رکھتے رہے اس زمانہ میں ریختہ کہنے کا بھی اتفاق ہوا لیکن فارسی کے مقابلے میں اس کی مقدار نہ ہونے کے برابر ہے۔ اسلئے انھوں نے اس پوری مدت میں اپنے آپ کو فارسی نگار کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔ ۱۸۵۰ء میں قلعے سے تعلق پیدا ہوا تو شاہ ظفر کی بدولت ان کی ریختہ گوئی نے دوبارہ جنم لیا اور شاہی مشاعروں کیلئے مختلف طرحوں میں طبع آزمائی کرنے لگے! غدر کے بعد دلی پر آلام و مصائب کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ بادشاہ جلاوطن

کئے گئے اور ان کے ہوا خواہ یا شہر بہ شہر مارے مارے پھرنے لگے اور یا پھانسی پر لٹکا دیئے گئے اِن ستم رسیدہ دلی والوں میں میرزا صاحب کے سرپرست بھی تھے، احباب بھی اور شاگرد بھی ان کی جدائی نے میرزا صاحب کا دل توڑ دیا اور وہ شعر و شاعری کو خیرباد کہہ کر زندگی کے دن پورے کرنے لگے ....!

تاہم اس زمانے میں بھی صاحبان کرم کے خیال سے کچھ کہنا پڑتا تھا لیکن ایسے اشعار کی تعداد بہت تھوڑی ہے اس لئے انھیں پچھلے دور کا تتمہ خیال کرنا چاہیئے۔" (صفحہ ۱۵-۱۶- دیوان غالبؔ نسخہ عرشی)

مشکل پسندی۔ پیچیدہ خیالی اور ابہام گوئی کا جو رنگ غالبؔ نے اختیار کیا تھا اپنے عہد میں بہت کچھ نامقبول رہا۔ لیکن رفتہ رفتہ "یہی طرز سخن وری" ان کے فن کا طرۂ امتیاز بن گیا۔ فارسی کی پیچیدہ ترکیبیں بھی انھوں نے دھیرے دھیرے ترک کیں۔ پیچیدہ خیالی کو آسان لفظوں میں سمونا شروع کیا۔ سہل ممتنع بھی کہا۔ میرؔ کا رنگ بھی اپنایا لیکن کبھی اپنی فکر شاعری پر ذہنی انتشار طاری نہیں ہونے دیا۔ اور ان کے فن کی یہی پختہ کاری دراصل ان کے آرٹ اور فن کی جان ہے۔

تصوّف کے پیچیدہ مسائل ہوں یا "لذّت کام و دہن" کی کیف آوری، شاہد و شراب کی رنگین بیانی ہو یا زندگی کی پیچیدہ روی! غالبؔ نے عام روش اور قدیم طرز سے ہٹ کر ایک نیا انداز فکر اختیار کیا۔ گل و بلبل، شمع و پروانہ، لب و رخسار، صیاد و چمن۔ مشرقی شاعری کی ان روایات قدیمہ سے انحراف تو شاید ممکن نہ تھا۔ لیکن انھوں نے عامیانہ روی اور قدیم طرز فکر کے بندھے ٹکے اسلوب سے دور رہ کر ان میں ایک جدت پیدا کی۔ ندرت سموئی رمزیت و اشاریت سے کام لیا۔ اور اس طرح پر اپنے لئے ایک نیا راستہ نکال لیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ غالبؔ کے کلام کا ایک حصّہ آج بھی مفکرین کی "شرح نگاری" کا محتاج ہے۔ لیکن اس کے باوجود یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ غالبؔ نے ہمارے سوچنے اور سمجھنے کے انداز کو فکر انگیزی کی نئی شاہراہوں سے روشناس کرایا۔

اردو شعراء کے کلام کی جتنی شرحیں اب تک لکھی گئیں ان کا زیادہ تر تعلق غالبؔ ہی سے ہے۔ اپنے اپنے تعمق غور و فکر کے لحاظ سے شارحین غالبؔ نے ان کی پیچیدہ خیالی

کی نئی نئی طرح سے شرحیں کیں اور اس کے ساتھ ساتھ نئی تنقید نے ان کے کلام میں نئی قدروں کی زندگی کے احساس کی جستجو کی جوان کے معراج کمال کا کھلا ہوا ثبوت ہے۔

غالب کے کلام کی ترویج و اشاعت میں خود ان کی جد و جہد کا سب سے بڑا ہاتھ ہے اور اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ غالب نے اپنے فن اور شخصیت کو پہنچوانے کے لئے اس دور میں جو طریقے اختیار کئے ان کے معاصرین میں کسی دوسرے کی رسائی شاید ہی وہاں تک ہوئی ہو۔ انھوں نے اپنی ایک ایک غزل بلکہ ایک ایک شعر کی نشر و اشاعت جس خوبصورتی کے ساتھ کی وہ انھیں کا حصّہ تھا ان کے خطوط میں ان کے فن کا پروپگنڈہ بھی ملتا ہے اور شخصیت کا بھی! اپنی زندگی کے روز مرّہ کو انھوں نے مختلف زاویوں سے اپنے دوستوں اور شاگردوں تک پہنچانے میں کبھی بخل سے کام نہیں لیا۔ اور اس "عہد تاریک" میں جب ارباب کمال اور اصحاب علم ہرکس و ناکس کو اپنا مخاطب بنانے میں اپنی توہین محسوس کرتے تھے غالب نے ہمیشہ وسیع النظری سے کام لیا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے احباب اور تلامذہ کا حلقہ اتنا وسیع ہو گیا کہ اسے کسی علاقے یا صوبے تک محدود نہیں کیا جا سکتا جس نے جہاں سے انھیں خط لکھا انھوں نے فوراً ہی اس کے خط کا جواب دیا۔ جس نے غزل یا قطعہ مانگا جہاں تک ہو سکا کبھی انھوں نے بخل سے کام نہیں لیا شاگردوں کے ساتھ پرانے زمانے کے استادوں کی طرح کبھی انانیت نہیں برتی چھوٹوں سے پیار و محبت کا برتاؤ کیا۔ اور بزرگوں کی بزرگداشت میں کبھی کمی نہیں ہونے دی۔ اور یہی ان کی شخصیت اور فن کی مقبولیت کا ایک بڑا راز تھا۔

غالب کا کلام جا بجا قلمی بیاضوں میں بھی ملتا ہے۔ اس کے علاوہ اب تک مندرجہ ذیل (مکمل یا نامکمل) قلمی دیوان بھی دستیاب ہوئے جن میں قابل ذکر اردو دواوین حسب ذیل ہیں:۔

۱۔ نسخہ حمیدیہ بھوپال	مکتوبہ	۱۲۳۷ھ	مطابق	۱۸۲۱ء
۲۔ نسخہ شیرانی	"	۱۲۴۲ھ	"	۱۸۲۶ء
۳۔ نسخہ گل رعنا	"	۱۲۴۵ھ	"	۱۸۲۹ء
۴۔ نسخہ رامپور قدیم	"	۱۲۴۸ھ	"	۱۸۳۳ء

۵. نسخۂ بدایوں	مکتوبہ	۱۲۵۴ھ	مطابق	۱۸۳۸ء
۶. نسخۂ پٹنہ	"	۱۲۶۱ھ	"	۱۸۴۵ء
۷. نسخۂ لاہور	"	۱۲۶۸ھ	"	۱۸۵۲ء
۸. نسخۂ رامپور جدید	"	۱۲۷۱ھ	"	۱۸۵۵ء
۹. انتخاب غالب	"	۱۲۸۳ھ	"	۱۸۶۶ء

(صفحہ ۱۱۵ و ۱۱۶ نسخۂ عرشی)

اُردو کے مکمل یا نامکمل دیوان اور انتخاب کے ان قلمی نسخوں کے علاوہ ایک دو اُردو دیوانوں کا اور بھی ذکر سننے میں آیا ہے مثلاً ۱۸۴۵ء کے ایک اردو مخطوطے کی نشاندہی (ماہنامہ ماہ نو کراچی فروری ۱۹۵۹ء) میں جناب خلیل الرحمٰن داؤدی نے کی ہے یا کچھ متفرق کلام پروفیسر سید مسعود حسن ادیب کے کتب خانے میں محفوظ ہے اور متفرق اشعار کی دریافت تو اس کثرت سے کیگئی ہے کہ اسے ایک علیٰحدہ موضوع کی اہمیت حاصل ہوگئی ہے۔ غالب کی زندگی ہی میں ان کے اردو دیوان کے پانچ اڈیشن چھپ گئے تھے جن کی تفصیل درج ذیل ہے۔

۱. پہلا ایڈیشن	مطبوعہ	مطبع سید الاخبار دہلی	۱۲۵۷ھ	مطابق	اکتوبر ۱۸۴۱ء
۲. دوسرا ایڈیشن	"	مطبع دار السلام دہلی	۱۲۶۳ھ	"	۱۸۴۷ء
۳. تیسرا ایڈیشن	"	مطبع احمدی دہلی	۱۲۷۸ھ	"	۱۸۶۱ء
۴. چوتھا ایڈیشن	"	مطبع نظامی کانپور	۱۲۷۸ھ	"	۱۸۶۲ء
۵. پانچواں ایڈیشن	"	مطبع مفید خلائق آگرہ	۱۲۸۰ھ	"	ستمبر ۱۸۶۳ء

مشکل گوئی اور ابہام پسندی کے ناقدری کے باوجود غالب شاید اس دور کا پہلا اُردو شاعر تھا جس کے دیوان کے پانچ ایڈیشن اس کی زندگی میں چھپ گئے پھر یہی نہیں ہوا بلکہ اس کا کلام قلمی دیوانوں اور جا بجا بیاضوں میں محفوظ کرلیا گیا جس کے مصدقہ نمونے آج بھی "نوادر خانوں" میں جگمگاتے نظر آتے ہیں۔

فن کے ساتھ ان کی شخصیت سے لگاؤ پیدا ہونا فطری بات تھی چنانچہ ان کی شخصیت کے بہت سے گوشے بھی سامنے آئے لیکن "شخصیت سازی" فرط عقیدت

میں ڈوبے ہوئے نئے زاویوں سے اپنا دامن نہ بچاسکی۔ یہاں تک کہ غالبؔ کی نظم کی طرح ان کے نثری نمونوں کو بھی الہامی قرار دے دیا گیا اور تضاد بیانی کو نئی نئی تاویلات میں سموکر ان کی تحریرات سے تذکرہ و تاریخ کی تردید ایک فن کی شکل میں ابھر آیا۔ نقدنگاری کے اس نئے مزاج کی زد سے نہ تو آزاد بچ سکے اور نہ حالیؔ! چنانچہ "آبِ حیات"، کی یہ روایت آج تک اسی "فرطِ عقیدت کا نشانہ بنی ہوئی ہے کہ "۔ غالبؔ کے متداول (اردو) دیوان کا اِنتخاب علّامہ فضلِ حق اور میرزا خانی خان کوتوال دہلی نے کیا۔" ؟

"آبِ حیات" کی اس روایت کی تکذیب و تردید کے لئے جدید تحقیق و تنقید نے جو زاویے بنائے ہیں ان کا بنیادی تصور تو دراصل مولانا شبلی کا وہی ایک فقرہ ہے کہ "آزاد اگر گپ بھی ہانک دیتا ہے تو وحیٔ (آسمانی) معلوم ہوتی ہے۔" لیکن تردید و تکذیب کے لئے بیشتر غالبؔ کے تحریری بیانات کا سہارا لیا جاتا ہے اور ان کی اختلاف بیانی اور تضاد کی اس طرح تاویلیں کی جاتی ہیں۔ جیسے کسی الہامی کتاب کی حقانیت و صداقت کی مقدس بلندیوں تک پہونچنے کی جدوجہد کی جارہی ہو!

اگر اس واقعہ کو حقیقت سے دور کا بھی لگاؤ ہے کہ غالبؔ کی ابہام گوئی اور مشکل پسندی کو ایک زمانے میں شدید نامقبولیت سے دوچار ہونا پڑا۔؟ اور غالبؔ نے اپنی بساط بھر اس ماحول کا مقابلہ بھی کیا؟ اور اسی کے ساتھ ساتھ اگر ان حقائق سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ

> "اگر مولوی فضلِ حق (خیرآبادی) اور ان کے رفقاء کی صحبت کا فقط اتنا ہی اثر ہوتا کہ وہ شاعری میں اپنی غلط روش کو چھوڑ کر ایک معتدل راہ پر آجاتے تو یہ بھی کچھ معمولی بات نہیں تھی۔ مگر اس سے بھی زیادہ قابل قدر کام غالبؔ کی "اخلاقی اصلاح" کا ہوا۔! ان کی اس زمانہ کی اخلاقی حالت کا ذکر ہوچکا ہے اگر وہ اسی ڈگر پر قائم رہتے تو اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ ان کے دل و دماغ کا کیا حشر ہوتا۔"
>
> (صفحہ ۴۳۔ ذکرِ غالبؔ (جناب مالک رام) تیسرا ایڈیشن)

ان کے علاوہ مولوی فضلِ حق۔ نواب امین الدین اور نواب حسام الدین حیدر خاں کے نام میرزاؔ کی تصانیف میں آئے ہیں۔ جب میرزا تیس برس کی عمر میں دہلی سے کلکتہ گئے تو انھوں نے ایک مثنوی میں تینوں کا نام لیکر یاد کیا ہے۔

زار باب وطن جو کم سرتن را	کہ رنگ و رونق اند ایں چمن را
چوں خود را جلوہ سنج ناز خواہم	ہم از حق "فضل حق" را باز خواہم
چو حرز بازوئے ایماں نویسم	حسام الدین حیدر خاں نویسم
چو پیوند قبائے جاں طرازم	"امین الدین احمد خاں" طرازم

اُن میں سے مولوی فضل حق غالبؔ کے سب سے بڑے "محب اور محسن" تھے انھوں نے نہ صرف مرزا کی شعر و سخن کے میدان میں رہنمائی کی جو ان کا اصل دائرہ عمل تھا بلکہ ان کی مالی مشکلات دور کرنے کی بھی کوشش کی۔ اور مرزا کے تعلقات اس دربار (رامپور) سے وابستہ کرائے جو غدر لبعد مرزا کی زندگی کا سب سے بڑا سہارا تھا۔" (صفحہ ۵۴ غالب نامہ جناب محمد اکرم)

الٰہی بخش خاں کے علاوہ مولوی فضل حق خیر آبادی جیسی سخن فہم اور پاکیزہ ذوق ہستی سے بھی غالبؔ نے اس زمانے میں بہت کچھ حاصل کیا اور ان لفظی و معنوی تنقیدوں سے پرہیز کرنے لگے جو ان کے ابتدائی کلام میں بیدل کی تقلید کا نتیجہ تھا۔

اگر مولوی فضل حق سے ملاقات نہ ہو جاتی تو شاید میر تقی میرؔ کی پیشگوئی کی دوسری شق پوری ہو جاتی جس میں انھوں نے کہا تھا کہ یہ لڑکا بھٹک جائے گا۔" (صفحہ ۱۸-۱۹ سرگزشت غالب (جناب ڈاکٹر محی الدین زور قادری)

غالب شناسوں کے گہرے مطالعہ کا یہ نچوڑ غالبیات کے سلسلے کا اہم تجزیہ قرار دیا جا سکتا ہے جس میں غالبؔ کے فن اور شخصیت کے ہر گوشے کو پرکھا گیا ہے جانچا گیا ہے اور اس سلسلے میں جو کچھ لکھا گیا ہے بہت حد تک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے لیکن اس عمیق جائزے کے بعد بھی بدنام آزاد کی ایک روایت شبلی کے اس لطیف فقرے کے اردگرد گھوم رہی ہے جو یقیناً از راہ بے تکلفی انھوں نے آزاد کے متعلق کہہ دیا ہوگا۔

"وہ (آزاد) تحقیق کا مرد میدان نہیں۔ تاہم ادھر ادھر کی "گپیں" ہانک دیتا (ہے) تو "وحی" معلوم ہوتی (ہیں)" (صفحہ ۲۲۷ افادات مہدی)

چنانچہ آج بھی محتاط سے محتاط محقق "آب حیات" کی تنقید میں متوازن نظر

نہیں آتا "آبِ حیات" کی یہ روایت کہ غالب کا مروجہ اردو دیوان علامہ فضل حق خیرآبادی اور مرزا خانی خاں کی نظر انتخاب کا رہین منت ہے "غالبیات" کے سلسلے کی اہم کڑی ہو یا نہ ہو مگر کم از کم "آبِ حیات" پر غیر متوازن تنقید کا اچھا خاصہ مواد ضرور ہے۔! اتنا ضروری کہ! اس کے خلاف لکھتے وقت یہ بھلا دیا جاتا ہے کہ غالب کے ندیم خاص حالی نے بھی بہ الفاظ دگر اس واقعہ کا ذکر "یادگارِ غالب" میں کیا ہے اور لکھا ہے :-

"ان کے سوا جب "مولوی فضل حق" سے مرزا کی رسم و راہ بہت بڑھ گئی اور مرزا کو اپنا خالص اور مخلص دوست اور خیر خواہ سمجھنے لگے تو انھوں نے اس قسم کے اشعار پر "روک ٹوک" کرنی شروع کی یہاں تک کہ انھیں کی تحریک سے انھوں نے اپنے اردو کلام میں جو اس وقت موجود تھا دو ثلث کے قریب نکال ڈالا۔ اور اسکے بعد اس روش پر چلنا بالکل چھوڑ دیا۔" (صفحہ ۱۰۴ یادگارِ غالب)

اس انتخاب کی نوعیت کیا ہوگی؟ اس کے بارے میں تو آگے چلکر کچھ عرض کروں گا اس وقت تو صرف اس انداز تنقید کا ذکر کرنا ہے جو "آبِ حیات" کی اس روایت پر برسہا برس سے ہو رہی ہے۔

دیوان غالب کے مشہور شارح مولانا عبدالباری آسی الدنی مرحوم "آبِ حیات" کی اس روایت کی "تکذیب" میں تحریر فرماتے ہیں۔

"مرزا خانی (خاں) ہوں یا "مولانا فضل حق" میرا ہرگز یہ خیال نہیں ہے کہ مرزا ایسے غیور طبع نے اپنے جگر پاروں کو ان کے حوالے کر کے ان کی زندگی اور موت کو ان کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا ہوگا۔ غلط ہے اور بالکل غلط ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ان دونوں نے صلاحیں دی ہوں اور مرزا نے ان کی دوستانہ صلاح کو مانا بھی ہو مگر یہ انتخاب خود مرزا ہی نے کیا ہے جیسا کہ ان کی اس عبارت سے ظاہر ہے جو اوپر نقل کر آیا ہوں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مرزا خانی کو تو ان قتیل کے شاگرد تھے اور مرزا کو قتیل سے کبھی عقیدت نہیں تھی بلکہ آخر میں تو وہ ان کو نہایت ہی برا سمجھتے تھے ان کو کیا اپنا کلام دکھاتے اور کیا ان سے اپنا انتخاب کراتے۔ یہی وجہ ہے کہ مولانا حالی نے باوجود "تقلید روایت" آزاد

کے مرزا خانی کے شریک اصلاح ہونے کا ذکر نہیں کیا ہے۔

رہے مولانا فضل حق خیرآبادی، وہ فاضل بے عدیل تھے۔ عالم تھے، مولوی تھے منطقی تھے مرزا کے دوست بھی تھے غرض سبھی کچھ تھے۔ مگر یہ میں نہ مانوں گا کہ مرزا کے مشیر شعر وسخن تھے اور مرزا ایسے سیدھے سادے اور بھولے تھے کہ چپکے سے اپنا دیوان اٹھا کے ان کے حوالے کر دیا کہ جو تمھارا جی چاہے کرو۔ جس شعر کو چاہو کاٹ کر پھینک دو اور جس کو چاہو رکھو۔ اردو میں تو "مولوی فضل حق" کے نام مرزا کا شاید کوئی خط ہی نہیں ہے فارسی میں کچھ خطوط پائے جاتے ہیں۔ جن میں سے ایک میں شاید کچھ شعر و شاعری کا بھی ذکر ہے ورنہ وہی رسمی دوستی، دوستانہ خطوط۔ا جن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ زمانہ کی رسم کے موافق مولانا فضل حق بھی فارسی ہی کے شیدا تھے۔ ایک "مولوی" سے بڑی مشکل کے ساتھ یہ توقع ہوتی ہے کہ وہ اس زمانے میں اردو کا اتنا زبردست ماہر ہو کہ مرزا ایسے شخص کے کلام کا انتخاب کرے اور کرے تو پھر مرزا بے چون و چرا اس پر ایمان بھی لے آئیں "ہرگز نہیں" "ان ہذا لشئ عجیب"۔ مرزا الٰہی بخش خاں معروف ایسے شاعر کی طرف (غالب) کبھی توجہ نہیں کرتے۔ جو ان کے خسر بھی تھے۔ بلحاظ سن اور مشق بھی ان سے زیادہ تھے۔ مومن سے ان کو ہم چشمی کا دعویٰ ہے مگر با ایں ہمہ وہ ایسے آدمیوں کو اپنا کلام حوالے کر دیتے ہیں جو نہ مشہور ہیں نہ شعر وسخن میں معروف ہیں نہ ادب اردو میں ان کا کوئی درجہ ہے! بات یہ ہے کہ آزاد کا دوسری باتوں کی طرح مرزا پر یہ بھی ایک "رنگین اتہام" ہے جس سے ان کے کلام کو مشکل اور بے معنی بنا کر ان پر یہ تہمت لگائی ہے کہ یہ کائنات انتخاب دوسروں کی ہے مرزا کا اس میں کچھ نہیں۔ انھیں اچھے برے کی تمیز ہی نہ تھی۔

خود میرے والد مرزا غالب کے دیکھنے والوں میں تھے۔ ان کے کمالِ فن کے پورے "رازداں" تھے وہ جب آزاد کا "آب حیات" والا لطیفہ دیکھتے تھے کہ مرزا نے مولوی فضل حق سے انتخاب کرایا تو غصہ کے مارے سرخ ہو جاتے

تھے اور فرماتے تھے کہ کیا بہتان باندھا ہے۔!

وال صاحب بیان کرتے تھے کہ مرزا اصلاح دیکر بعض شاگردوں سے ایک ہندو تمبولی" کی نسبت تو ضرور یہ کہتے تھے کہ ذرا اس کو بھی سنا لینا اور باقی کسی کو وہ کچھ نہیں سمجھتے تھے۔ صہبائی کو ملّائے مکتبی"۔ آزردہ کو ایک حکران ذوق کو بادشاہ کا استاد۔ مومن کو لڑاکو جانتے تھے۔ اور ذرا بھی ان کی پرواہ نہ تھی"۔ (صفحات ۹ لغایۃ ۱۱ مکمل شرح دیوان غالب)

مولانا آسی کی "تیز و تند گرمی گفتار" گویا دلائل و براہین کا ایک اتھاہ سمندر ہے جس میں بیک قلم انھوں نے آزاد کی کذب بیانی پر بھی تبصرہ کیا ہے اور انھیں غالب پر اس رنگین اتہام کا مجرم بھی گردانا ہے۔ کہ انھوں نے یہ روایت صرف اس لئے گڑھی ہے کہ غالب کے کلام کو مہمل اور بے معنی ثابت کریں۔! مولانا آسی نے اس عبارت آرائی میں زور کلام پیدا کرنے کے لئے بہت سی ایسی باتیں بھی کہہ ڈالی ہیں۔ جو انھیں نہ کہنی چاہیئے تھیں "چھوٹا منہ بڑی بات" کی مثل اس پر صادق آئے یا نہ آئے لیکن ذمہ داری کا تقاضا یہی تھا کہ کہنے سے پہلے انھیں یہ سوچنا ضرور چاہیئے تھا کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں؟ اس سے پہلے کیا کہہ آئے ہیں؟ اور اس کے بعد انھیں آگے چلکر کیا کہنا ہے۔؟

مولانا آسی کی متذکرہ بالا عبارت کا تذکرہ کرنے سے پہلے میں مولانا کی وہ عبارت نقل کر دینا ضروری سمجھتا ہوں جس کی سرحد تحریر مرقومہ بالا عبارت سے ملتی ہے اس عبارت کو تحریر فرمانے سے قبل مولانا نے غالب کی ابہام گوئی اور مشکل پسندی پر تبصرہ کرتے ہوئے کسی نقاد، محقق یا مورخ کی کوئی عبارت نقل نہیں کی ہے بلکہ خود تحریر فرماتے ہیں!

"ممکن ہے کہ میرے اس انتخاب سے اہل نظر مطمئن نہ ہوں مگر میں اس قسم کے کلام کو غالب کا رنگ خاص سمجھتا ہوں اس کے ماسوا وہ کلام ہے جس میں یا تو اشکال ہے اور یا تخیل اس قدر پیچیدہ ہے کہ خود غالب بھی قبر سے اٹھ کر آئیں تو پہروں ان کو بھی ان کے معنوں میں غور کرنے کی ضرورت پڑے اور دانتوں میں انگلی دبائے دیر تک سوچتے رہیں کہ بار خدایا یہ میں نے کیا کہا تھا؟ اور یا پھر وہ اتنا سہل ہے کہ غالب کے نام کے سامنے کچھ وزنی نہیں معلوم ہوتا؟

.... مرزا کی مشق سخن جاری تھی تو معاصرین کو اس کے سننے کا اتفاق ایک بے معنی سی بات تھی۔ سب نے ان کے رنگ کو دیکھا اور اندازہ کیا کہ یہ کیا کہتے ہیں؟ تو اپنی اپنی جگہ پر تو سب نے صدائے واویلا اور دادرِیغا بلند کی۔ مگر نازک بات سمجھنے کے لئے نازک سمجھ اور غور و تامل کی بھی ضرورت ہے۔ تعمق نظر اور فکر و اندیشہ کی بھی احتیاج ہے اور یہ صورت حال جلسوں اور مشاعروں میں مفقود ہے وہاں تو یہ ہوتا ہے کہ پڑھئے اور آگے بڑھیئے، کوئی سمجھنے کی کوشش بھی کرے غور بھی کرے تو وقت کہاں ہے؟ اور فرصت کسے میسّر ہے۔ یہی ہوا۔ مرزا کے انداز کلام کو دیکھکر یہ تو سب سمجھ ہی گئے کہ جو کچھ ہے وہ ہے جو اور کہیں نہیں رہا سمجھنا اس کے لئے ذرا دشواری پیدا ہوئی نہ اتنا غور و فکر کر سکے نہ سمجھ سکے بعض نے صورت دیکھی۔ آواز سنی اور خاموش ہو گئے۔ بعض نے سرگوشیاں شروع کر دیں اور بعض مطلق العنانوں نے یہ بھی کہدیا کہ ؎

اگر اپنا کہا تم آپ ہی سمجھے تو کیا سمجھے!
مزا کہنے کا جب ہے اک کہے اور دوسرا سمجھے
کلام میرؔ سمجھے اور زبانِ میرزا سمجھے
مگر ان کا کہا! یہ آپ سمجھیں یا خدا سمجھے

رفتہ رفتہ یہ ہوا کہ مشاعروں میں، صحبتوں میں، جلسوں میں، محفلوں میں مرزا کی مشکل گوئی کے چرچے ہونے لگے اور کہا جانے لگا کہ اچھا تو کہتے ہیں مگر بھئی بہت مشکل کہتے ہیں۔ بعض نے دبی دبی زبان سے یہ بھی کہہ دیا کہ کیسا اچھا اور کیسا برا۔ جو کہتے ہیں "مہمل" ہوتا ہے اور جو فرماتے ہیں بے معنی ہوتا ہے۔ مرزا کے کانوں تک بھی یہ آواز پہونچی بیچارے اپنی کاوش کی یہ داد پاکر کلیجہ تھام کے رہ گئے۔ جی میں آیا کہ لاؤ اس روش کو چھوڑ کر اس شاہ راہ پر چلیں جس پر سب آنکھیں بند کئے چلے جا رہے ہیں۔ کچھ بھی ہو۔ جہاں سب وہیں ہم۔ "مرگ انبوہ جشنے دارد" کی صورت

ہے مگر معنی فہم طبیعت اور جدت آفریں دماغ نے صلاح دی کہ دنیا جو کہے کہنے دو تم جو کچھ کررہے ہو کئے جاؤ۔ ایک دن آئے گا چلانے والے شرما کر آپ ہی خاموش ہو جائیں گے اور تلافی مافات پر شرمائیں گے اس ہنگامۂ کشاکش میں یہ کہہ خاموش ہو گئے ؎

مشکل ہے زبس کلام میرا اے دل　　سن سن کے اسے سخنوران کامل
آسان کہنے کی کرتے ہیں فرمائش　　گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل

اس پر بھی ناانصافیوں کی شورش کم نہ ہوئی اور ناسمجھوں کا ماتم کم نہ ہوا۔ مرزا کو پھر سوچنا پڑا کہ اس روش کو بدلنا چاہیئے یا نہیں؟ مگر غیور طبیعت نے ہاں سے "نہیں" کی اور یہی صلاح دی کہ کہنے والوں اور تماشہ دیکھنے والوں کی باتوں پر نہ جاؤ جو جس کا جی چاہے کہنے دو ؎

ہفت اختر نہ چرخ خود آخر بچہ کا زند

کو ذہن میں رکھو۔ مجبوراً انھوں نے ذرا بلند آواز کے ساتھ پھر لوگوں کے سامنے یہ شعر کہہ کر پڑھ دیا کہ ؎

نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا
گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی

یہ تو اتنا کہہ کر خاموش ہو گئے مگر بات نہ دبی۔ شدہ شدہ یہ خبر ان کے دلی دوستوں تک پہونچی"۔ (صفحات ۶ تا ۸ مکمل شرح دیوان غالب آسی)

پھر اس کے بعد غالبؔ کے ذہن و شعور سے یہ ضد اور ہٹ کے بادل کیسے چھٹے مولانا آسیؔ کی رواں قلم نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا اور اس کی کوئی وضاحت انھوں نے نہیں فرمائی کہ جس ماحول کی تدریجی مرقع کشی انھوں نے کی ہے اس نے آگے چل کر غالبؔ کے دل و دماغ کو کس طرح اس مشکل پسندانہ رجحان سے نکلنے کی راہ دکھائی؟

مولانا آسیؔ کی اس عبارت کا خاتمہ صرف انھیں الفاظ (یہ تو اتنا کہہ کر خاموش ہو گئے مگر بات نہ دبی شدہ شدہ یہ خبر ان کے دلی دوستوں تک پہونچی) پر ہوا اور اس کے بعد آزاد کی اس "مردود روایت" کا تسلسل قائم کر دیا گیا۔ تائیدی شکل میں نہیں تردیدی صورت میں؟

غالب پر "رنگین ابہام" لگانے کی جو تہمت آزاد پر لگائی گئی ہے اگر اسے واقعیت سے کوئی علاقہ بھی ہو تو کیا خود مولانا آسی کے یہ الفاظ غالب پر "مہمل گوئی" کی کھلی ہوئی چوٹ نہیں ہیں؟

"اس کے ماسوا وہ کلام ہے جس میں یا تو اشکال ہے اور تخیل اس قدر پیچیدہ ہے کہ خود غالب بھی قبر سے اٹھ کر آئیں تو پہروں ان کو بھی ان کے معنوں میں غور کرنے کی ضرورت پڑے اور دانتوں میں انگلی دبائے دیر تک سوچتے رہیں کہ بار خدایا۔؟ یہ میں نے کیا کہا ہے؟"

آزاد کی یہ روایت کہ علامہ فضل حق وغیرہ نے غالب کے اردو کلام کا انتخاب کیا اگر اس سے یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے (بقول آسی) "کہ غالب میں اچھے بُرے کی تمیز ہی نہ تھی"، تو ان کے "اسلوب فکر" پر یہ کھلی ہوئی چوٹ یا طنز۔! سمجھ میں نہیں آتا کہ ارباب نظر اس سے کیا نتیجہ نکالیں گے۔

علامہ فضل حق کے متعلق مولانا آسی کا یہ ارشاد کہ "وہ ایک بڑے مولوی تھے" اردو شعر و ادب سے انھیں کوئی لگاؤ نہیں تھا۔ غالب سے ان کے صرف وضعدارانہ اور گھریلو قسم کے تعلقات تھے (یعنی بالکل "غیر ادبی قسم کے") یہاں تک کہ علامہ کے نام جو خطوط پائے جاتے ہیں وہ فارسی کے ہیں اور وہ بھی خانگی قسم کے۔ اور دہلی بھر میں اگر کوئی "سخن فہم" تھا تو وہ صرف ایک "ہندو ممبولی" (جس کا نام و نشان تک معلوم نہیں۔)

جہاں تک مولانا آسی کے والد گرامی (خلیفہ حسام الدین احمد الدنی) کے غالب کے کمال فن کے پورے "راز داں" ہونے کا تعلق ہے اس کے ثبوت کے لئے اگرچہ ان کے نام غالب کے کسی خط کی ضرورت نہیں محسوس کی گئی۔ اور نہ کوئی دوسرے مستند ثبوت کی حاجت؟۔ پھر بھی علامہ خیرآبادی سے غالب کے اردو خطوط کا مطالبہ! جن کے جمے جمائے گھر پر انقلاب سن ستاون کے بعد انگریزوں نے جھاڑو پھیر دی تھی۔ ان کا دلی کا کتب خانہ تو غدر میں تباہ ہوا۔ خیرآباد میں جو کچھ تھا اس پر حکومت نے جابرانہ قبضہ کر کے کوڑیوں کے مول نیلام کر دیا۔ اس جبر و استبداد کا خاتمہ صرف اس

گھر کی جائیداد منقولہ ہی تک محدود نہیں تھا بلکہ ان کا عظیم محل تک نیلام کردیا گیا اور اب تختۂ زمین کے سوا وہاں کچھ بھی نہیں ہے۔

حضرت شاہ رفیع الدینؒ اور حضرت شاہ عبدالقادرؒ عالم دین ہونے کے باوجود قرآن پاک کے ایسے عام فہم اردو ترجمے کرسکتے ہیں جنھیں آج ایک مکتبۂ خیال قدیم اردو نثر کا اعلیٰ ترین نمونہ سمجھتا ہے لیکن علم کی یہی فضیلت علامہ خیرآبادی جن کی زندگی کا بڑا حصہ دلّی کی نتھری ستھری ادبی فضا میں گذرا جنھوں نے آخری مغل تاجدار بہادر شاہ ظفر کے ساتھ "قلعۂ معلّی" کی چہار دیواریوں میں اپنا بچپن بتایا جنھوں نے سب سے پہلے "ریختۂ اُردو"[۱] کی اصطلاح کو جنم دیا؟ اور شعر و ادب سے ان کی یہ کم آگاہی کہ "ایک ہندو تمبولی" ان سے زیادہ سخن فہم و سخن شناس تھا؟

"ناطقہ سر بگریباں ہے ......"

غالب کے انتخاب کلام کا معاملہ میرے نزدیک اتنا اہم نہیں تھا جس "پر آبِ حیات" کی اس روایت کو بنیاد بنا کر علامہ خیرآبادی یا دوسری مقتدر ہستیوں کے بارے میں ان عامیانہ خیالات کا اظہار کیا جاتا۔ اگر یہ تسلیم ہی کرلیا جائے کہ غالب کا مروجہ اُردو دیوان علامہ خیرآبادی اور چند دوسرے بزرگوں نے انتخاب کیا تو میں نہیں سمجھتا کہ اس سے غالب کی فنکارانہ عظمت و توقیر کو کونسی ٹھیس لگ گئی۔ اسی طرح اگر یہ شخصیات انتخاب کلام کے معاملے میں بے تعلق پائی جائیں تو اس سے ان شخصیات کی علمی فضیلت

---

[۱] خزینۃ العلوم فی متعلقات منظوم میں منشی درگا پرشاد نادر نے لکھا ہے۔
"ریختہ بمعنی گرے ہوئے کے ہیں۔ پس جو زبان اپنی اصلی حالت سے گر جائے اس کو زبان ریختہ بولتے ہیں چنانچہ جیسے فارسی زبان میں عربی کے لغت شامل ہوئے اسے زبان ریختہ فارسی کہتے ہیں اسی طرح حسب تقریر بالا ریختہ ہندی، کو زبان اردو سمجھتے ہیں (صفحہ ۴۱ خزینۃ العلوم مطبوعہ مفید عام لاہور ۱۸۷۹ء)
خزینۃ العلوم کی متذکرہ بالا عبارت کے حوالے سے پروفیسر محمود شیرانی تحریر فرماتے ہیں۔
"اس عقیدے کے برخلاف مولوی فضل حق خیرآبادی اپنے رسالہ تحقیق الفتویٰ میں اسی زبان اُردو کو "ریختہ اردو" کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ ان کے الفاظ ہیں "چہ فرمایند علماء دین متین مفتیان مخلصین از اہل صدق الیقین در حق کسے کہ یکے سالہ بر زبان اُردو ریختہ در بیان بعض مسائل اعتقادیہ برائے تلقین عوام کرداد فارست ہم نداند تا ریف دارد۔" اس طرح دیکھا جاتا ہے کہ ریختہ ہندی اور ریختہ اُردو میں کوئی فرق نہیں رہا اور حضرت نادر کا نظریہ غلط ہوگیا" (ماہنامہ نیرنگ رام پور اگست ۱۹۲۶ء صفحہ ۱۲)

اور ادبی ذوق کی بلندی کو کیا نقصان پہونچ سکتا ہے؟ اسی لئے مجھے حیرت ہوتی ہے جب مولانا عرشی رامپوری اور جناب مالک رام جیسے ذمہ دار اور محتاط بزرگوں کو نتیجتاً مولانا آسی مرحوم سے متفق الخیال پاتا ہوں۔ مولانا عرشی ارشاد فرماتے ہیں:-

"مولانا آزاد دہلوی کا بیان ہے کہ مولوی فضل حق خیرآبادی اور میرزا خانی کوتوال دہلی نے میرزا غالب کے دیوان ریختہ کا انتخاب کیا ہے لیکن اولاً تو نسخہ بھوپال، نسخہ شیرانی، گل رعنا اور نسخہ رامپور کا مطالعہ اس کی توثیق نہیں کرتا دوسرے خود میرزا صاحب نے اس انتخاب کی ذمہ داری اپنے سر لی ہے دیوان ریختہ کے دیباچہ میں فرماتے ہیں:۔

"ہمارا نگارندہ ایں نامہ را آن درسراست کہ پس از انتخاب دیوان ریختہ بگرد آوردن سرمایۂ دیوان فارسی برخیز۔"

نواب شمس الامراء اور شاکر کے محولہ بالا خطوط میں بھی یہی لکھا ہے۔ میرزا صاحب علّامہ خیرآبادی کے علم و فضل اور بلند پایۂ ذوق سخن سنجی کے بے حد معترف تھے چنانچہ جب انھوں نے عرفی شیرازی کے مشہور قصیدے ؎

اے متاع درد در بازار جاں انداختہ

کا جواب لکھا تو اس کی نقل مولانا کے ملاحظہ کے لئے بھیجی اور لکھا:۔

"دریں روزہا ہوائے آن درسراست کہ بیتی چند در توحید" مجیبا المعرفی گفتہ آید، چوں کوشش اندیشہ بجائے رسید کہ نہ عرفی نہ محل ماند و نہ مرا جائے ناگزیر آں ابیات را بر کسے عرضہ میدارم کہ چوں منی صد و چوں عرفی صد ہزار را سخن پرورش تواند کرد و پایہ ہر یک بہ ہر یک تواند نمود۔"

منتخب دیوان ریختہ کا محوّلہ دیباچہ علامہ خیرآبادی کی زندگی میں لکھا گیا ہے اگر وہ اس مجموعہ کے منتخب ہوتے تو ناممکن تھا کہ میرزا غالب اپنے علامہ دہر فرید عصر دوست کے نام کو چھپا جاتے بلکہ اس کے برخلاف علّامہ جیسی شخصیت کا نام تحریر کر کے انتخاب کی برتری اور پاکیزگی پر مہر توثیق ثبت کرتے۔

مزید برآں شیفتہ نے "گلشن بے خار" میں لکھا ہے:۔

"دیوانش را بعد تکمیل و ترتیب دگر نیست! فراواں ابیات انہ آں حذف و ساقط کردہ۔ قدرے قلیل انتخاب زدہ۔"

یہ تذکرہ میرزا صاحب کی نظر سے گذر چکا تھا۔ اور انھوں نے نہ صرف اس کی تقریظ لکھی تھی بلکہ اس کی بعض کوتاہیوں کی طرف مرتب کی توجہ بھی منعطف کی تھی۔ اگر میرزا صاحب اپنے کلام کے خود منتخب نہ ہوتے تو شیفتہ کیوں لکھتے!

"اور بفرض محال وہ سنی سنائی لکھ بھی دیتے تو میرزا صاحب اس پر نکتہ چینی کیوں نہ کرتے؟" (صفحات ۲۱ لغایتہ ۲۳ دیوان غالب اردو نسخہ عرشی)

جناب مالک رام کا نظریہ بھی یہی ہے:۔

"سب سے پہلے شیفتہ نے ہمیں خبر دی کہ ان (غالب) کا موجودہ دیوان دراصل ان کے بڑے مجموعہ کا انتخاب ہے" (گلشن بے خار صفحہ ۱۳۹) مولوی کریم الدین نے بھی یہی لکھا ہے اور "گلشن بے خار" کا بھی حوالہ دیا ہے۔ (طبقات الشعراء ہند صفحہ ۳۷۷) لیکن اس واقعہ کی پوری تفصیل مولانا محمد حسین آزاد کے یہاں ملتی ہے۔ فرماتے ہیں:۔

"سن رسیدہ اور معتبر لوگوں سے معلوم ہوا کہ حقیقت میں ان کا دیوان بہت بڑا تھا۔ یہ منتخب ہے مولوی فضل حق صاحب اور مرزا خاں عرف مرزا خانی کوتوال شہر۔ مرزا صاحب کے دلی دوست تھے۔ ہمیشہ باہم دوستانہ جلسے اور شعر و سخن کے چرچے رہتے تھے۔ انھوں نے اکثر غزلوں کو سنا اور دیوان کو دیکھا تو مرزا صاحب کو سمجھایا۔ کہ یہ اشعار عام لوگوں کی سمجھ میں نہیں آئیں گے۔ مرزا نے کہا اتنا کچھ کہہ چکا اب تدارک کیا ہو سکتا ہے؟ انھوں نے کہا کہ خیر! ہوا، سو ہوا، انتخاب کرو اور مشکل شعر نکال ڈالو۔ مرزا صاحب نے دیوان حوالہ کر دیا۔ دونوں صاحبوں نے دیکھکر انتخاب کیا۔ وہ یہی دیوان ہے جو کہ آج ہم عینک کی طرح آنکھوں سے لگائے پھرتے ہیں۔" (آب حیات صفحہ ۵۱۷)

یہ تو یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ آزاد نے جو کچھ لکھا ہے وہ کہاں تک

درست ہے اور کیا واقعی انھیں دونوں صاحبوں نے دیوان کا انتخاب کیا تھا؛ لیکن اس میں شبہ نہیں کہ انتخاب ضرور ہوا تھا۔ خود مرزا نے بھی ایک خط میں اس واقع کی طرف اشارہ کیا ہے۔ مولوی عبدالرزاق شاکر کو لکھتے ہیں :۔

"قبلہ! ابتدائے فکرِ سخن میں بیدلؔ و اسیرؔ و شوکتؔ کے طرز پر ریختہ لکھتا تھا چنانچہ ایک غزل کا مقطع یہ تھا ؎

طرزِ بیدلؔ میں ریختہ لکھنا
اسد اللہ خاں قیامت ہے

۱۵ برس کی عمر سے ۲۵ برس کی عمر تک مضامین خیالی لکھا کیا دس برس میں بڑا دیوان جمع ہوگیا۔ آخر جب تمیز آئی تو اس دیوان کو دور کیا۔ اوراق یک قلم چاک کئے۔ دس پندرہ شعر واسطے نمونے کے دیوان حال میں رہنے دیئے" (عودِ ہندی صفحہ ۱۵۲)

محض حسنِ اتفاق سے اصل دیوان جس سے یہ انتخاب کیا گیا تھا، دست بردِ زمانہ سے محفوظ رہ گیا۔ اس کا ایک قلمی نسخہ بھوپال کے ریاستی کتب خانہ میں تھا۔ جہاں سے یہ ۱۹۲۱ء میں "نسخۂ حمیدیہ" کے نام سے شائع ہوا"

(صفحات ۱۲ لغایتہ ۱۴ دیوان غالب مرتبہ مالک رام)

مولانا عرشیؔ نے کسی حد تک یقین کے ساتھ اور جناب مالک رام نے مبہم الفاظ میں "آبِ حیات" کی متذکرہ بالا روایت سے اختلاف کا اظہار کیا ہے۔ اور ان دونوں نے اپنی رائے کی اساس و بنیاد غالبؔ کی مختلف تحریرات کو قرار دیا ہے۔ جن کے بارے میں "تضاد بیانی"، ہی نہیں کہیں کہیں یہ بھی شبہ ہونے لگتا ہے کہ شاید دانستہ طور پر بعض حقائق کو چھپانا ہی انھوں نے قرین مصلحت سمجھا ہو!

جناب مالک رام نے دیوان غالبؔ کے آغاز ہی میں ان کی اس تضاد بیانی کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے۔

"بعض اور مسائل کی طرح یہ مسئلہ بھی بحث طلب ہے کہ غالبؔ نے شعر کہنا کب شروع کیا اس بارے میں خود ان کی اپنی تحریریں بھی بہت مختلف ہیں۔

ایک جگہ لکھتے ہیں۔

"روش ترک این کہ در دہ سالگی آثار موزونی طبع پیدائی گرفت۔"

(کلیات نثر غالب ص ۲۴۹ خط بنام شاہزادہ سلطان محمد بہادر)

دیوان فارسی کے خاتمے میں لکھا ہے۔

"از روزے کہ شمارہ سنین عمر از جاد فرا ترک رفت و رشتہ حساب زحمت بازد ہمیں گرہ بخود بر گرفت اندیشہ در رہ وارد گام فراخ برداشت وگر بود و مناک باد بہ سخن بیہودن آغاز نہاد۔"

اس کے مقابل دوسری جگہ فرماتے ہیں:۔

"بارہ برس کی عمر سے کاغذ۔ نظم و نثر میں مانند اپنے نامۂ اعمال کے سیاہ کر رہا ہوں۔"

(اردوئے معلیٰ میں ص۴۰۳ خطوط غالب (۱) ص ۷۷، ابنام قدر بلگرامی)

انھیں کو ایک دوسرے خط میں لکھتے ہیں۔

"پندرہ برس کی عمر سے شعر کہتا ہوں۔" اُردوئے معلیٰ ص ۴۱۹ خطوط غالب (۱) ص ۹۵۔

شاکر کو بھی یہی لکھا ہے:۔

"پندرہ برس کی عمر سے پچیس برس کی عمر تک مضامین خیالی لکھا کیا۔"

(عود ہندی ص ۱۵۰ ابنام مولوی عبدالرزاق شاکر)

یہ مختلف بیانات جن میں دس، گیارہ، بارہ اور پندرہ برس کی عمر کو شعر گوئی کے آغاز کا زمانہ بتایا گیا ہے، ظاہر ہے کہ یہ سب کے سب درست نہیں ہو سکتے۔" (صفحہ ۷۰، ۸ دیوان غالب (مالک رام)

اس "تضاد" کو اگر سرسری اندازے کی معمولی غلطی ہی سمجھ لیا جائے تو مقدار اشعار کے تحت مولانا عرشی نے مرزا کے جس مبالغہ کا تذکرہ فرمایا ہے یہ بھی غور طلب ہے کہ آیا مرزا کا یہ بیان کس حد تک مبالغے کی تعریف میں آتا ہے۔

"نواب شمس الامرا کے نام ایک خط میں مرزا صاحب نے ظاہر کیا ہے کہ پہلا دیوان "طاق نسیاں" پر رکھدیا گیا اور شاکر کو لکھا ہے کہ اس کے اوراق

یک قلم چاک کرکے صرف دس پندرہ شعر نمونے کے لئے دیوان حال میں رہنے دیئے لیکن فی الحقیقت یہ مبالغہ ہے اس لئے کہ نسخہ شیرانی کے متن کی غزلوں میں سے بڑی تعداد موجودہ دیوان میں پائی جاتی ہے اس سے قطع نظر میرزا صاحب نے قدیم دیوان کے تین قصیدوں میں سے دو انتخاب میں شامل کر لئے ہیں۔ ان کے اشعار کی تعداد ۷۷ تھی۔ اس میں سے ۵۱ شعر آج بھی منتخب دیوان کے اندر موجود ہیں۔

یہ کھلا ثبوت ہے اس امر کا کہ منتخب اشعار کی واقعی تعداد دس پندرہ سے کہیں زیادہ تھی اور دیوان کا طاق نسیاں پر رکھ دینا یا اس کا یک قلم چاک کر دینا صرف "مبالغہ" تھا۔" (صفحہ ۲۲-۲۳ دیوان غالب نسخۂ عرشی)

اوراق چاک کر دینے کے واقعہ کو جناب مالک رام نے "نادرست" اور مولانا عرشی نے "مبالغہ آرائی" سے تعبیر کیا ہے۔ فرط عقیدت کا تقاضہ یہی ہے کہ ان خوش نیت ہستیوں کی تقلید میں "غلط بیانی" کی سوئے زنی سے اپنے دل دماغ کو بھی صاف رکھنے کی کوشش کی جائے حالانکہ غالب کے ایرانی استاد عبد الصمد کا افسانہ بھی کچھ غیر دلچسپ نہیں ہے مولانا عرشی نے دیوان غالب کے مقدمہ میں اسکی تفصیلات بھی بلا کم و کاست دیدی ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ میرزا صاحب کو دستگاہ خلیفہ محمد عظیم کے توسط سے ملی تھی مگر ان کے یہاں ایک ایرانی دوست (استاد) کا ذکر آیا ہے۔ فرماتے ہیں:

"شت ہرفرد نام پارسی نژاد فرزانہ بود از تخمہ ساسانیاں پس از گرد آذردن دانش کیش اسلام گزیدہ و خود را عبد الصمد نامیدہ۔ دو سال ہجزار دو بست دلبست و شش ہجری بطریق سیاحت ہند آمدہ اکبر آباد پیکر پذیر فتن خود آموختن من ہمدران شہر خجستہ بہر بودہ است ۔ دو سال بہ کلیہ احزان من آسودہ است و من آئین معنی آفریں و کیش یگانہ بینی از وے فرا گرفتہ ام۔ بر نہاد و لے آفریں باد و بر رواں آبادا۔

اس گرامی استاد کی تعلیم سے استفادے کے متعلق فرماتے ہیں۔

"اگر فرزانہ فرز بود آمیین عبد الصمد راہ نمودی نامہ نگار نیز یکے از

نگرندگان بودن نہ خود راہ است سپچودی ونہ دیگراں را آگہی افزودی۔

اس کی استعداد علمی کے بارے میں لکھتے ہیں۔

"فارسی زبان سے لگاؤ اور شعر وسخن کا ذوق فطری و طبعی تھا۔ ناگاہ ایک شخص کہ ساسان پنجم کی نسل میں سے منطق و فلسفہ میں" مولوی فضل حق مرحوم" کا نظیر اور مومن و موحّد و صوفی تھا میرے شہر میں وارد ہوا اور لطائف فارسی بست اور غوامض فارسی آمیختہ بہ عربی اس سے میرے حالی ہوئے۔ سونا کسوٹی پر چڑھ گیا۔ ذہن عوج نہ تھا۔ زبان دری سے پیوند ازلی اور استاد بے مبالغہ جاماسپ عہد در ز۔ جمہر عصر تھا حقیقت اس زبان کی دل نشین و خاطر نشان ہوگئی۔"

مفتی محمد عباس لکھنوی کو قاطع برہان کا ایک نسخہ تحفہ میں بھیجنے کے بعد تحریر کیا ہے

"علم و ہندسہ سے عاری ہوں لیکن بچپن سے محو سخن گذاری ہوں۔ مبدأ فیاض کا مجھ پر احسان عظیم ہے۔ ماخذ میرا صحیح اور طبع میری سلیم ہے فارسی کے ساتھ ایک مناسبت ازلی و سرمدی لایا ہوں۔ بمطابق اہل پارس کے منطق کا بھی مزہ ابدی لایا ہوں۔ مناسب خداداد تربیت استاد، حسن و قبیح ترکیب پہچانے، فائدہ کے غوامض جاننے لگا۔

نامہ غالب میں ارشاد فرماتے ہیں:۔

"زباندانی فارسی میری ازلی دستگاہ اور یہ عطیہ خاص منجانب اللہ ہے فارسی زبان کا ملکہ مجھ کو خدا نے دیا ہے مشق کمال میں نے استاد سے حاصل کیا ہے"

نواب خلد آشیاں کی خدمت میں عرض کیا ہے۔

"بدو فطرت سے میری طبیعت کو زبان فارسی سے ایک لگاؤ تھا چاہتا تھا کہ فرہنگوں سے بڑھکر کوئی ماخذ مجھ کو ملے۔ بارے مراد بر آئی۔ اور اکابر پارس میں سے ایک بزرگ یہاں وارد ہوا اور اکبر آباد میں فقیر کے مکان پر دو برس رہا اور میں نے اس سے حقائق و دقائق زبانِ پارسی کے معلوم کئے اب مجھے اس امر خاص میں نفس مطمئنہ حاصل ہے۔"

"تیغ تیز" میں بھی عبدالصمد کا ذکر کیا ہے فرماتے ہیں :۔

"بعد ایک مدت کے جب میں دلی آرہا اور" مولوی فضل حق مغفور" سے بعد ملاقات ربط بڑھا، ایک روز عجیب اتفاق، ہرمزد کا ذکر درمیان آگیا اور اس کے ذکر کے آنے کی تقریب معنی صمد اور اردند کے اتحاد کی شرح"

(صفحات ۵-۶-۷ دیوان غالبؔ نسخہ عرشی)

قاطع برہان۔ تیغ تیز۔ اردوئے معلیٰ اور نامۂ غالبؔ کے نصف درجن کے قریب یہ اقتباسات جو مولانا عرشی نے نقل فرمائے ہیں۔ ان کے کس جملے۔ لفظ یا حرف سے یہ ترشح ہوتا ہے کہ مرزا آسان ٹچکلوں میں کسی طنز و مزاح کی آبیاری کر رہے ہیں؟ یا بھونڈے الفاظ میں کسی کو بے وقوف بنانے کا مہلک پروگرام ان کے پیش نظر ہے؟ حاشا و کلا! ہرگز نہیں، کبھی نہیں۔ وہ مذاق بھی کرتے تو اپنے خداوند نعمت (نواب رامپور) کے ساتھ۔ یا مفتی محمد عباس کے ساتھ جنھیں ان کے الفاظ میں آقا زادے کا مرتبہ حاصل تھا۔ لیکن کسے معلوم تھا کہ واقعہ کچھ اسی نوعیت کا ہے؟ چنانچہ مولانا عرشی کے الفاظ میں "مصلحت بینی" کے اس راز کی طلسم کشائی بھی خود مرزا کے ہاتھوں ہوئی اور اس طرح پر :۔

"ان بیانوں سے" بظاہر" یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ مرزا صاحب کو زبان فارسی سے طبعی مناسبت اور فطری لگاؤ تھا۔ حسن اتفاق سے ۱۲۴۶ھ (۱۸۱۱ء) میں جب کہ مرزا صاحب کے مکان پر ٹھہرا اس مدت میں میرزا صاحب نے خالص اور آمیختہ بہ عربی فارسی کے حقائق و دقائق کی اس سے تحصیل کی۔ کمال مشق سے اس امر خاص میں "نفس مطمینہ" حاصل کیا۔ اور طبعی ذوق کے سونے کو استاد کی تعلیم کی کسوٹی پر چڑھا کر کندن بنالیا لیکن فی الحقیقت یہ شخصیت "افسانہ" تھی جسے" از راہ مصلحت" مرزا صاحب نے پیش کر دیا تھا۔ چنانچہ اس راز کی خود ہی طلسم کشائی کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

"مجھ کو مبدا فیاض کے سوا کسی سے تلمذ نہیں ہے عبدالصمد محض ایک

فرضی نام ہے چونکہ مجھ کو لوگ "بے استاد" کہتے تھے۔ ان کا منھ بند کرنے کو میں نے ایک فرضی اُستاد گڑھ لیا ہے"۔ (صفحہ ۲ دیوان غالبؔ نسخہ عرشی)

مبالغہ ہو یا مصلحت! متذکرہ بالا حوالوں سے یہ ثابت ہے کہ غالبؔ کی تحریرات (صرف خطوط ہی نہیں) تضاد بیانی اور غلط نگاری کے اسقام و عیوب سے پاک و صاف نہیں ہیں۔ اور ان کے فن کی بلندی کو سامنے رکھ کر ان کی شخصیت کے بارے میں کسی عظیم و بلند عمارت کو تعمیر کرنا سخت دشوار ہے۔

غالبؔ کے آرٹ اور فن کے ساتھ اس عہد کو جو فطری لگاؤ اور عظیم عقیدت ہے اس کی ترجمانی اور نمائندگی کے لئے انھیں نجانے کیوں "مافوق الفطرت" ثابت کرنے کی کوشش کی جاتی ہے؟ اور ان کے فن کو شخصیت سے ہم آہنگ کرنے کے لئے اسے بالکل بھلا دیا جاتا ہے کہ وہ بھی ہمارے جیسے ایک انسان تھے۔ ایسے ہی جن سے غلطیاں بھی ہوں گی اور قصور بھی جنھیں اس دنیا کے اتار چڑھاؤ نے مصلحت بینی بھی سکھائی ہوگی اور غلط نگاری کا سلیقہ بھی دیا ہوگا۔ جن کی بشری کمزوریوں میں "شب ماہ" و "جام سرور" کا کیف بھی ہوگا اور اس کی ناگوار تلچھٹ بھی۔

غالبؔ نہ مولوی تھے نہ عالم دین، نہ صوفی صافی تھے۔ نہ پیر طریقت، انھوں نے کبھی پیغمبری اور امامت کا دعویٰ بھی نہیں کیا۔ اپنے وجود پر بھی انھیں کبھی یہ بھی شبہ نہیں گذرا کہ ان کا فن رشد و ہدایت کی فیض رسانیوں سے منوّر کیا گیا ہے۔ یا ان کے کلام کو وحیٔ الٰہی کا درجہ حاصل ہے پھر ان کی شخصیت کو سمجھنے کے لئے صرف ان کی تحریرات کو اساس و بنیاد قرار دے دینا؛ اور ان کی غلط بیانیوں کو خوش نیتی کے ساتھ "مبالغہ" یا "مصلحت" سے تعبیر کر کے دوسروں کے بیانات کو حقائق سے الگ کر دینا۔ نہ غالبؔ کی شخصیت کی تعمیر جدید کو کوئی فائدہ پہنچا سکتا ہے اور نہ ان کے لازوال فن کو۔ غالبؔ نے اگر اپنے دیوان کے دیباچے میں اس انتخاب کو صرف اپنی ہی سخن شناسی تک محدود رکھا۔ تو اس میں کچھ مصلحتیں بھی ہو سکتی ہیں۔ اور بے ضرورت عبارت آرائی سے احتراز بھی جو شخص "بے استادا" کی طنز سے مرعوب ہو کر ایک فرضی اُستاد کی طویل کہانی سن و سال کے تعین کے ساتھ گڑھ سکتا ہے تو اس کے ذہن و شعور میں یہ ایسا واہمہ بھی جگہ

پاسکتا ہے کہ "دیکھو اگر علامہ خیرآبادی۔ میرزا خانی خان اس انتخاب کے مسئلے میں آج آڑے نہ آتے تو میرزا صاحب کی ساری قلعی کھل جاتی۔ انتخاب کا مسئلہ کچھ آسان نہ تھا۔ اور ..... اور ..." مگر اس کے باوجود مرزا خائف تھے۔ اس دنیا کی کجروی سے۔ اور حفظ ماتقدم کے طور پر انھیں دنیا کا منہ بند کرنے کے لئے یہ بھی کہنا پڑا کہ ؎

شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک طرف تو انھوں نے اپنی سخن فہمی اور سخن شناسی کی لاج رکھنے کے لئے اس کے اظہار کی ضرورت نہیں سمجھی کہ اس انتخاب سے علامہ خیرآبادی یا کسی دوسرے شخص کو دور کا لگاؤ ہے دوسری طرف انھیں اس کا بھی ڈر تھا کہ اگر اس کے بعد بھی اس انتخاب پر کوئی انگشت نمائی ہوئی تو کم از کم میرا یہ اعتراف ضرور سپر بن جائے گا کہ ؎

شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے

کسی شخصیت کے مختلف گوشوں کو پرکھنے کے لئے اس کی نفسیات اور ماحول کو نظرانداز نہیں کیا جا سکتا؟ غالبؔ کی "شخصیت سازی" کے وقت ہمارے لئے اس سے انحراف ممکن نہیں کہ غالبؔ کی "رند مشربی" اور اس عہد کی دلّی کے ماحول کو نظرانداز کر دیں تو ہم غالبؔ کو آسانی کے ساتھ نہیں سمجھ سکتے! جس طرح غالبؔ کا فن گہرائی اور گیرائی میں ڈوبا ہوا ہے اسی طرح ان کی شخصیت بھی اتنی اوتھلی یا سطحی نہیں جس کا جائزہ محض ان کی تحریرات کے مختلف نمونوں کو سامنے رکھ کر لیا جا سکے؟ جاگیر کے مقدمہ میں اپنے حریف "خواجہ حاجی خاں" سے شکست کھانے کے بعد ان کا دماغ اس کے اثرات سے بہت دنوں تک ماؤف و مسموم رہا۔ اپنی بعض تحریرات میں انھوں نے "خواجہ حاجی خان" کے بیٹے خواجہ امان کو اپنا بھتیجا تسلیم کر لیا جس سے ان کا کوئی نسبی تعلق نہیں تھا۔ بلکہ جاگیر کے معاملہ میں اصل تنقیح ہی یہی تھی کہ "خواجہ حاجی خان" کا کوئی نسبی تعلق غالبؔ سے ہے یا نہیں؟

اسی مقدمے کے سلسلے میں انھیں اپنے حقیقی بھانجوں (مرزا عباس بیگ اور مرزا مغل) سے بھی شکایت تھی کیونکہ اس مقدمہ میں مرزا اکبر بیگ بدخشی اور

ان کے حقیقی بھائی جواد الدولہ مرزا افضل بیگ نے ان کا ساتھ نہیں دیا تھا۔ اور جب غالبؔ پر برا وقت پڑا تو مرزا عباس بیگ اور مرزا اسمٰعل نے ان کی کوئی مدد نہیں کی! حالانکہ مرزا عباس بیگ کو انگریزوں کی خیر خواہی کے سلسلہ میں ایک بہت بڑا تعلقہ "سیتاپور" کے ضلع میں مل چکا تھا اور ان کی مالی حالت اتنی اچھی تھی کہ اگر چاہتے تو اپنے بوڑھے اور مجبور ماموں کو پچاس روپیہ مہینہ تو آسانی کے ساتھ بھیج ہی سکتے تھے؟ علم وادب سے بے بہرہ بھی نہیں تھے غالبؔ کے شاگرد میر غلام حسنین قدر بلگرامی کو زندگی بھر درباری شاعر کی حیثیت سے تنخواہ دیتے رہے لیکن مرزا عباس بیگ اور اس خاندان کے چند افراد کے نام غالبؔ کے جو خطوط ملتے ہیں ان کا لفظ لفظ دیکھ ڈالئے شفقت بزرگانہ سے بھرے پڑے ہیں۔ نہ شکوہ کا ایک لفظ ہے نہ شکایت کا۔؟ اور نہ ان کی کسی تحریر سے یہ ثابت کیا جاسکتا ہے کہ انھوں نے مرتے دم تک ان کے بارے میں ایک لفظ کسی کو لکھا ہو ــــ!

"قادرنامہ" جدید تحقیق کی روشنی میں تو بلاشک وشبہ غالبؔ کی تصنیف تسلیم کیا جاچکا ہے ــــ مگر اب سے چند سال پہلے بعض ارباب نظر نے صرف اس بنیاد پر اسے غالبؔ کی فہرست تصانیف سے خارج کردیا تھا کہ غالبؔ کے خطوط میں اس کے کچھ اجزاء ملتے ہیں مکمل طور پر کسی خط میں موجود نہیں ہے چنانچہ جناب تحسین سروری اپنے سیر حاصل مضمون "قادرنامہ غالبؔ" میں لکھتے ہیں :۔

"اکثر لوگ غالب کی ہر بات کی تصدیق ان کے فارسی اور اُردو میں خطوط سے چاہتے ہیں۔ اور جس بات کا ذکر غالب کے کسی خط میں ہوتا ہے اس کو مستند و مصدقہ سمجھتے ہیں۔ اور چونکہ غالبؔ نے اپنے کسی خط میں "قادرنامہ" کا ذکر نہیں کیا ہے اس لئے اس کو غالبؔ کی تصنیف ہی نہیں ماننے لگے۔ لیکن میرے خیال میں یہ ان کی زیادتی ہے اور جو طریقہ اختیار کیا گیا ہے وہ صحیح نہیں"۔! (صفحہ ۱۲۵۔ رسالہ شعور شمارہ ۵۔۶ حیدرآباد پاک)

"قادرنامہ" کے جو قدیم ترین نسخے اس وقت تک سامنے آئے ہیں ان میں مطبع سلطانی دہلی کا چھپا ہوا ایڈیشن سب سے زیادہ پرانا خیال کیا جاتا ہے جس کے سر ورق

پر یہ عبارت درج ہے۔

"قادر نامہ تصنیف کیا ہوا نجم الدولہ مرزا اسد اللہ خاں بہادر تخلص بہ غالب در مطبع سلطانی واقع قلعہ مبارک ۱۲۷۲ھ میں چھپا۔"

جہاں تک مروجہ اُردو دیوان غالب کے اِنتخاب کا سوال ہے اس کی تمہید اختتام یا دیباچوں میں غالب نے اگر اس واقعہ کا تذکرہ نہیں کیا کہ "یہ اِنتخاب علامہ خیرآبادی اور چند دوسرے دوستوں کی سخن فہمی کا رہین منت ہے" تو اس سے نہ غالب کی نیت پر حرف گیری کی جاسکتی ہے اور نہ اسے آزاد اور حالی کی روایات کی تردید کے طور پر بطور استدلال کے استعمال کیا جاسکتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اب سے سو سوا سو سال پہلے ایسی باتوں کو کوئی اہمیت ہی حاصل نہیں تھی۔ اس دور کے ارباب کمال اور اہل علم کا "استغناء" ایسی چھوٹی چھوٹی باتوں کو نظر میں بھی نہیں لاتا تھا اور نہ پیش لفظ اور دیباچوں میں تالیفی یا تصنیفی تعاون واشتراک کے شکریہ ادا کرنے کا باقاعدہ رواج پڑا تھا۔ شخصی اقتدار کے زمانہ میں اور اس کے بعد بھی بہت دنوں تک مصنفین یا مؤلفین آغاز کتاب میں یا اختتام پر صرف اپنے ان "خداوندان نعمت" کا شکریہ ادا کرتے تھے جن کی علمی قدردانیوں کی چھاؤں میں انھیں زندگی گذارنا پڑتی تھی۔ کہیں کہیں تذکروں میں ان کے مآخذ کا ذکر بھی ملتا ہے اور ترجموں میں اصل کتاب کے مصنف یا مؤلف کا نام تصنیفی کاموں میں جس قسم کا تعاون واشتراک اس زمانے میں حاصل کیا جاتا تھا اس کی نوعیت زیادہ تر "استفادے" کی ہوتی تھی۔

استاد یا انھیں کے ہم مرتبہ اہل علم سے اس قسم کے مشورے لئے جاتے تھے جن کا ذکر احتراماً کردیا جاتا تھا۔ بزرگوں اور مخلص دوستوں کے شکریہ ادا کرنے کا رواج تو بدلی ہوئی نئی قدروں کی پیداوار ہے اور وہ بھی اس جدید تہذیب کا عطیہ! پرانے زمانے میں اس قسم کے "شکریہ" کو وقار بزرگی کے منافی اور خلوص کی توہین سمجھا جاتا تھا پھر "انتخاب" بات ہی کب ایسی تھی جس کا ذکر غالب کسی تزک و احتشام کے ساتھ کرتے؟

۱؎ اس ایڈیشن کا تذکرہ بھی جناب تحسین سروری نے اپنے مذکورہ بالا مضمون میں کیا ہے (ناوم سیتاپوری)

چند دوستوں نے مشورہ دیا کہ فلاں فلاں غزلیں یا اشعار دیوان سے خارج کردینا مناسب ہیں اور ان کے مشورے کو غالب نے قبول کرلیا؛ اگر ان دوستوں میں سے کسی نے دیوان سامنے رکھ کر اس پر نشانات بھی لگا دیئے ہوں تو اس سے غالبؔ کی فنی عظمت کو کیا نقصان پہنچا؟ خصوصاً علامہ خیر آبادی جیسی شخصیت! جس کے علم وفضل نے غالبؔ کو سب سے زیادہ متاثر کیا تھا جن کی عظمت اور وقعت ان کے دل میں اتنی تھی کہ انھوں نے اپنے فرضی یا (حقیقی) استاد کے علم وفضل کا تذکرہ کرتے ہوئے اس کی تمثیل انھیں "علامہ خیر آبادی" سے دی۔

بے تکلفی اور یگانگت دونوں میں اتنی تھی کہ ــــــ!

"جب مرزا اوّل بار مثنوی لکھ کر مولانا (فضل حق خیر آبادی) کے پاس لائے تو مضمون مذکور اس اخیر شعر پر ختم کرکے لائے تھے۔ مولانا (فضل حق) نے فرمایا کہ ــــ!

"یہ تم نے کیا بکا ہے" ــــ کہ متعدد عالموں میں متعدد خاتم ہو سکتے ہیں" (یادگار غالبؔ صفحہ ۷۲-۷۳)

انتخاب یا مشورۂ انتخاب تو بہت ہی معمولی بات ہے ــ اگر حالی کا یہ بیان غالبؔ کے کمال فن کو مجروح نہیں کرسکتا تو ان کے دیوان کے چند شعر قلمزد کردینے سے غالب کی توقیر میں کون سی کمی ہو سکتی ہے۔؟

"مرزا کے ایک فارسی قصیدے کی تشبیب کا یہ شعر ہے۔

ہم چناں در مشق عیب ثبوتے دارند

بوجودے کہ ندارد ز خارج اعیان

مرزا صاحب خود مجھ سے کہتے تھے کہ میں نے "ثبوتے" کی جگہ "نمودے" لکھا تھا" مولوی فضل حق" کو جب یہ شعر سنایا تو انھوں نے کہا ــــ "اعیان ثابتہ" کے لئے نمود کا لفظ نامناسب ہے۔ اس کی جگہ "ثبوت" بنادو چنانچہ طبع ثانی میں انھوں نے بجائے "نمود" کے "ثبوت" بنا دیا ہے۔

(صفحہ ۷۹ - یادگار غالبؔ)

آزاد اور حالی نے تھوڑے بہت فرق کے ساتھ "انتخاب دیوان" کے اس واقعہ کو لکھا ہے۔ آزاد نے کسی قدر تفصیل کے ساتھ یہ تحریر فرمایا ہے "کہ مرزا صاحب نے دیوان حوالہ کر دیا ـــ اور حالی کہتے ہیں کہ علامہ خیر آبادی کی تحریک پر انھوں نے دو ثلث کے قریب (اشعار) نکال دیئے۔؟ آزاد نے علامہ خیر آبادی کے ساتھ مرزا خانی خاں کا بھی نام لیا ہے اور حالی نے صرف علامہ خیر آبادی کا ذکر کیا ہے۔

جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں حالی نے "آب حیات" کی اس روایت کو دیکھ کر "یادگار غالب" میں اس کا مجملاً ذکر تو کر دیا لیکن اس واقعہ کی کوئی خاص اہمیت ان کی بھی نظر میں نہیں تھی اور وہ یہ قطعاً نہیں سمجھتے تھے کہ کسی وقت "انتخاب دیوان" کا یہ مسئلہ غالب کے وقار کا سوال بنا دیا جائے گا۔ غالب اور علامہ خیر آبادی کے جیسے گہرے تعلقات تھے اسے دیکھتے ہوئے "آب حیات" کی روایت کو صرف اس لئے غلط نہیں کہا جا سکتا کہ خود غالب نے "اپنی کسی تحریر میں اس کا تذکرہ نہیں کیا ہے؟"

مولانا عرشی نے "آب حیات" کی متذکرہ روایت کے سلسلے میں سب سے پہلے جو استدلال فرمایا ہے وہ میری فہم ناقص میں نہیں آیا۔ مولانا تحریر فرماتے ہیں۔

> "مولانا آزاد کا بیان ہے کہ مولوی فضل حق خیر آبادی اور میرزا خانی کوتوال دہلی نے مرزا غالب کے دیوان ریختہ کا انتخاب کیا ہے۔ لیکن اولاً تو نسخۂ بھوپال نسخۂ شیرانی۔ گلِ رعنا اور نسخۂ رامپور کا مطالعہ اس کی توثیق نہیں کرتا۔
>
> دوسرے خود مرزا صاحب نے اس انتخاب کی ذمہ داری اپنے سر لی ہے ....."
> (صفحہ ۲۱۔ دیوان غالب نسخۂ عرشی)

جہاں تک "مرزا کے اس انتخاب کی ذمہ داری اپنے سر لینے کا سوال ہے بہت کچھ عرض کیا جا چکا ہے مگر نسخۂ بھوپال۔ نسخۂ شیرانی۔ گل رعنا اور نسخۂ رامپور کے مطالعہ سے اس انتخاب کا تعلق کس حد تک ہے؟ اس مسئلہ کو حل کرنے کے لئے سب سے پہلے لفظ "انتخاب" کی بحث آ جاتی ہے خصوصاً مرزا کے اس "ذوق اشاعت" کے پیش نظر!

"اپنی قلمرو سخن کے آئین یعنی دو دادین فارسی اور اردو کو مرزا صاحب

زندگی بھر دستی اور مشینی دونوں ذرائع سے شائع کرتے رہے اس لئے ان کے فارسی و اردو کلام کے "خود اشاعت" نسخے خاصی تعداد میں ملتے ہیں۔ بظاہر یہ خیال ہوتا کہ وہ جس دیوان کو اپنے "نخلستان فرہنگ کا برگِ حشیش" قرار دیتے تھے اس کی اشاعت میں بمقابلہ دیوان فارسی کم سرگرم کار رہے ہوں گے لیکن — واقعہ اس کے بالکل برخلاف ہے۔ اطراف ملک سے اسی "برگِ حشیش" کی مانگ زائد آتی تھی اور اسی لئے اس کی ترمیم تصحیح۔ نقل اور تزئین میں انھیں مشغولیت بھی زیادہ رہتی تھی۔" (صفحہ ۷۰۔ دیوان غالب نسخہ عرشی)

ظاہر ہے کہ غالب کو اپنے کلام کی ترویج و اشاعت سے دلی لگاؤ تھا اور یہی وجہ ہے کہ انھوں نے وقتاً فوقتاً اپنا کلام دوسروں تک پہنچانے میں حتی المقدور کوئی کمی نہیں کی۔ غالب کے مختلف مخطوطات کی ترتیب تدوین اور اختلاف نسخ کے جو نمونے مولانا عرشی نے تیار کئے ہیں۔ ان سے صاف ظاہر ہے کہ غالب کے فراہم کردہ ان نسخوں میں یکسانیت نہیں ہے۔ ترتیب و تدوین کے علاوہ کہیں کہیں کمی بیشی بھی کیگئی ہے — مختلف اوقات میں انھوں نے اپنے کلام پر نظر ثانی کی۔ کچھ حصہ نکالا اور بعض جگہ اضافہ کیا — اس نظر ثانی کو "انتخاب" کا درجہ دیا جاسکتا ہے — لیکن اس انتخاب کو "مروجہ دیوان" کے اس "انتخاب" سے خلط ملط نہیں کیا جاسکتا جس کا تذکرہ آزاد اور حالی نے کیا ہے۔

مولانا عرشی نے نسخۂ بھوپال۔ نسخۂ شیرانی۔ گل رعنا اور نسخۂ رامپور کی تقریبی تاریخ ترتیب یا اشاعت" کا جو سن وار نقشہ ترتیب دیا ہے وہ ذیل میں نقل کیا جارہا ہے۔

نام نسخہ	تقریبی تاریخ ترتیب یا اشعار
۱۔ نسخۂ بھوپال	۱۲۳۷ھ = ۱۸۲۱ء
۲۔ نسخۂ شیرانی[۱]	۱۲۴۲ھ = ۱۸۲۶ء
۳۔ گل رعنا	۱۲۴۵ھ = ۱۸۲۹ء
۴۔ نسخۂ رامپور[۲]	۱۲۴۸ھ = ۱۸۳۳ء

[۱] مولانا عرشی نے اس کی ترتیب یا کتابت کا سن ۱۸۲۶ء تحریر فرمایا ہے (صفحہ ۱۱۵۔ دیوان غالب نسخہ عرشی) جناب محمد اکرم نے "غالب نامہ" (ص ۱۵۴) میں اسے ۱۸۸۶ء کا مخطوطہ قرار دیا ہے۔

ان چار نسخوں میں اختلاف سنین کے ساتھ ساتھ تعداد اشعار میں کمی بیشی بھی ہے سب سے کم اشعار "گل رعنا" میں ہیں جن کی تعداد مولانا عرشی نے ۴۸۴ بتائی ہے۔ جو مروجہ مطبوعہ دیوان (پہلا ایڈیشن) کی آدھی بھی نہیں ہے۔

۱۸۲۱ء۔ ۱۸۲۶ء۔ ۱۸۲۹ء اور ۱۸۳۳ء کے تمام نسخے ظاہر ہے کسی نہ کسی نوعیت سے انتخاب ہی کئے گئے ہوں گے مگر وہ انتخاب جو "آب حیات" کی روایت سے تعلق رکھتا ہے اور جس کی بنیاد پر دیوان غالب کا پہلا ایڈیشن ۱۸۴۱ء میں شائع کیا گیا جب تک کہ اس کا صحیح تعین نہ ہو جائے یہ ثابت ہونا دشوار ہے کہ نسخہ بھوپال۔ نسخہ شیرانی۔ گل رعنا یا نسخہ رام پور اس روایت کی صداقت یا تکذیب کے لئے کس طرح کارآمد قرار دیئے جا سکتے ہیں

مولانا عرشی نے اس "متداول دیوان" کے انتخاب کا زمانہ مرزا کے سفر کلکتہ سے واپسی (ستمبر ۱۸۲۹ء) کے بعد کا زمانہ قرار دیا ہے اور اس کا تذکرہ "تیسرا انتخاب متداول دیوان"، کے تحت کیا ہے؟

> "کلکتہ سے واپس آنے کے بعد مرزا صاحب نے اپنے انتخاب اوّل پر نظر ثانی کر کے ایک اور مختصر سا دیوان منتخب کر لیا ..... اس دیوان حال کے قدیم ترین مخطوطہ رامپور" کے اشعار کا مقابلہ "گل رعنا" کے حصہ اردو سے کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ "گل رعنا کے ۴۵۵ اردو اشعار میں سے تقریباً ۸۴ شعر گرائے گئے اور سابق غزلوں کے مزید شعر چن کر اور نئی غزلوں کے کل شعر جمع کر کے غزلوں کے اشعار کو ۹۷۸ کر دیا گیا تھا! (صفحہ ۲۱ نسخہ عرشی)

متذکرہ بالا عبارت سے کم از کم اتنا تو ثابت ہی ہو جاتا ہے کہ یہ انتخاب ستمبر ۱۸۲۹ء کے بعد اور ۱۸۳۶ء سے قبل (تذکرہ گلشن بے خار کی تالیف تک) ضرور مکمل ہو گیا تھا — پھر بھی اکتوبر ۱۸۴۱ء سے پہلے طبع نہیں ہو سکا۔

ان چاروں نسخوں میں صرف ایک نسخۂ رامپور ایسا ہے جس کے سن کتابت کا تعین مولانا عرشی نے ۱۸۳۳ء فرمایا ہے اور یہ اس بات کا کھلا ہوا ثبوت ہے کہ متذکرہ بالا انتخاب اس کے بعد ہی ہوا۔ اگر "متداول دیوان" کا انتخاب ہو چکا ہوتا تو

لے مولانا عرشی نے مرسلہ نسخہ میں الفاظ ۲۰ - ۲۵ قلمزد فرما کر اپنے قلم سے ۸۴ لکھا ہے۔

نسخہ رامپور اس انتخاب پر مبنی ہوتا۔ نہ کہ موجودہ شکل میں؟

اب رہا یہ سوال کہ یہ تینوں مخطوطات (نسخہ بھوپال۔ نسخہ شیرانی۔ گل رعنا۔) اپنے سن کتابت کے بعد پیش آنے والے واقعات کی پیشن گوئی کر کے "متداول دیوان" کے اس انتخاب کی نشان دہی کرتے جو ۱۸۳۸ء سے کچھ پہلے ہوا تھا۔ اتنا پہلے کہ بقول جناب مالک رام "تذکرہ گلشن بے خار" (مطبوعہ ۱۸۳۸ء) نے سب سے پہلے اس انتخاب کی خوشخبری سنائی سمجھ میں نہیں آتا کہ کسی ایسی کتاب کی "توثیق و تصدیق کا مطالبہ کسی ایسے مخطوطے سے کس طرح کیا جا سکتا ہے جس کی تکمیل کے وقت وہ کتاب عالم وجود ہی میں نہ آئی ہو۔؟ جہاں تک میں سمجھتا ہوں "متداول دیوان" کو سامنے رکھ کر تو نسخۂ بھوپال۔ نسخۂ شیرانی۔ گل رعنا اور نسخۂ رام پور کی تصدیق و توثیق تو کی جا سکتی ہے۔ لیکن مندرجہ بالا مخطوطات اس "متداول دیوان" پر اس نہج سے مہر تصدیق ثبت کرنے سے قاصر ہیں جن سے "آب حیات" کی روایت کی تائید چاہی گئی ہے۔

غالبؔ کے خطوط ہوں دیباچے۔ تقریظیں ہوں کہ اختتامی عبارتیں! بلا تائیدی ثبوت کے کم از کم انھیں ان کی شخصیت کی تعمیر میں بطور اسناد کے من عن تسلیم نہیں کیا جا سکتا! یہ صحیح ہے کہ ان خطوط سے ان کی بے تکلف نجی زندگی کی بہت سی تصویریں آنکھوں میں پھر جاتی ہیں اور ان خطوط کو سامنے رکھ کر بہت کچھ ان کے ذہنی اتار چڑھاؤ کا جائزہ لیا جا سکتا ہے پھر بھی جب تک ان کی تائید دوسری معتبر روایات سے نہ ہو نہ تو ان کی تمام تفصیلات پر کلیتاً اعتماد کیا جا سکتا ہے اور نہ انھیں بطور کسی مستند ثبوت کے پیش کیا جا سکتا ہے! خصوصاً ان کے مکاتیب! جن کے بارے میں پورے علم و یقین کے ساتھ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان کی کافی تعداد ہماری نگاہوں سے اوجھل ہے۔ علامہ فضل حق خیرآبادی کے نام غالبؔ کے جو اردو اور فارسی کے چند خطوط ابھی تک سامنے آسکے ہیں ان کی صحیح تعداد کیا اتنی ہی ہوگی؟ علامہ زندگی کے بہت سے مرحلوں پر دلی سے باہر رہے! جھجر۔ رامپور۔ الور۔ لکھنؤ۔ اور اپنے وطن خیرآباد تو سال میں کم از کم ایک بار ضرور ہی تشریف لاتے تھے۔ آموں کی فصل میں! کوئی مستند روایت تو پیش نہیں کی جا سکتی مگر قیاس یہی کہتا ہے کہ آموں کے عاشق زار

غالبؔ کو وہ اس فصل میں نہ یاد کرتے ہوں یا انھیں آموں کا تحفہ نہ بھیجتے ہوں۔ اور غالبؔ نے کبھی اس کی رسید نہ دی ہو یا دو لفظ شکریہ کے نہ لکھے ہوں۔ ۱۲۴۰ھ میں علامہ کے والد ماجد مولانا فضل امام خیر آبادی نے خیر آباد میں رحلت کی۔ غالبؔ نے ان کی وفات پر قطعہ تاریخ لکھ کر علامہ فضل حق کو بھیجا (جو ان کے مطبوعہ کلیات میں شامل ہے) لیکن غالبؔ کے کسی مجموعہ نثر میں اس تعزیت نامہ کی نقل شامل نہیں ہے جو اس قطعہ تاریخ کے ساتھ علامہ خیر آبادی کو بھیجا گیا ہوگا۔

ابو الفضل مرزا محمد عباس رفعت شروانی غالب کے دوست بھی تھے اور شاگرد رشید بھی! ان کے نام بھی غالبؔ کے چند ہی خطوط ابھی تک منظر عام پر آسکے ہیں حالانکہ ان کی تعداد یقیناً پانچ سات نہیں ہو سکتی۔ کم از کم دو تین درجن خطوط (غیر مطبوعہ) رفعت کی وفات (۱۳۱۶ھ) تک اس خاندان میں موجود تھے!

مرزا علی نقی شروانی بھوپالی مرحوم (نبیرۂ رفعت) بیان فرماتے تھے کہ دادا جان کی وفات کے بعد جب ان کا ترکہ ان کی اولاد میں تقسیم ہوا۔ کتابوں اور اثاث البیت کی طرح غالب کے یہ غیر مطبوعہ خطوط بھی اس تقسیم میں آگئے جن کا کچھ حصہ تلف ہوگیا اور نوادرات کا کافی ذخیرہ حیدر آباد دکن پہنچ گیا جن میں غالبؔ کے بہت سے غیر مطبوعہ خطوط بھی شامل تھے۔۔ اب وہ کس کے قبضے میں ہیں اس کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا۔۔!

مرزا علی نقی مرحوم (نبیرہ رفعت) میرے دوست بھی تھے اور ہم سایہ بھی! انھوں نے اس "خانوادہ علم" کی جو تلچھٹ" مجھے مرحمت فرمائی ہے اس میں نہ محض رفعت کی متعدد اصل تحریرات شامل ہیں بلکہ اس خاندان کے متعلق بہت سے معلومات افزا اوراق بھی ہیں

غالبؔ کے حقیقی بھانجے مرزا عباس بیگ "خاں بہادر" تو غدر سے پہلے ہی سیتاپور آگئے تھے۔ غدر کے بعد ان کے دوسرے بھائی مرزا جواد بیگ (عرف مرزا مغل) اور ان کے بڑے بھائی مرزا عاشور بیگ کی تمام اولاد بھی سیتا پور چلی آئی تھی۔ ان لوگوں کی طرف سے اگرچہ غالبؔ کا دل کچھ زیادہ صاف نہیں تھا پھر بھی انھوں نے کبھی اشارۃً وکنایۃً اس کا اظہار نہیں کیا اور سلسلۂ مراسلت قائم رکھا۔ دو چار خط اب

تک مل سکے ہیں جنھیں مختلف حضرات نے شائع بھی کیا ہے۔ مرزا ذوالفقار علی بیگ (بنیرہ مرزا جواد بیگ) کا بیان ہے کہ میرے والد مرزا فیض حسین بیگ مرحوم کے پاس "داداحضرت" (غالبؔ) کی ایک قلمی بیاض بھی تھی جو (غالباً) سرور جنگ بہادر (ابن مرزا مغل) حیدرآباد لے گئے تھے! اس خاندان میں غالبؔ کی بہت سی تحریرات موجود تھیں۔ جو آغا مرزا بیگ (سرور جنگ) نے وقتاً فوقتاً سیتاپور سے حیدرآباد دکن منگوالی تھیں۔ ہوسکتا ہے کہ ان کے خاندان میں ہوں۔ یہاں سیتاپور میں تو کافی جستجو کے بعد بھی ابھی تک اس سلسلہ کا ایک پرچہ بھی مجھے دستیاب نہیں ہوا۔

مرزا ذوالفقار علی بیگ بقید حیات ہیں زیادہ تر حیدرآباد دکن میں قیام رہتا ہے۔ ان کے بڑے بھائی مرزا وقار علی بیگ (سابق تعلقدار) ابھی تک سیتاپور ہی میں گوشہ نشینی کی زندگی گذار رہے ہیں۔ اگر بعض غالب شناسوں کی اس تحقیق سے انکار نہ کیا جائے کہ "نسخہ بھوپال" غالبؔ اور میاں فوجدار محمد خاں رئیس بھوپال (وفات ۱۲۹۰ھ) کے ادبی تعلقات کا درجہ رکھتا ہے؟ تو غالبؔ کی کسی بھی ایسی تحریر کا مطالبہ کیا جاسکتا ہے جس سے اس کا ثبوت ملتا ہو کہ یہ دیوان واقعی انھوں نے خود میاں فوجدار محمد خاں کو بھجوایا تھا۔ لیکن اس قسم کی کوئی تحریر ابھی تک میری نظر سے نہیں گذری اور نہ میاں فوجدار محمد خاں کے فرزند رشید میاں یار محمد خاں شوکتؔ بھوپالی نے اپنے تذکرۂ فرح بخش" (مطبوعہ ۱۲۹۸ھ) میں اپنا یا غالبؔ کا تذکرہ کرتے ہوئے کہیں بھی اس "اہم تحفہ" کا ذکر کیا ہے؟ شوکتؔ کی ایک تصنیف گلدستہ نرگس (مطبوعہ ۱۲۸۲ھ) بھی ہے جس پر خود غالبؔ نے اصلاح کی تھی اس کا اصل مسودہ میں نے دیکھا ہے۔ "اختتام" پر شوکتؔ کی ایک تحریر بھی شامل ہے لیکن اس میں بھی اس واقعہ کا کہیں ذکر نہیں ملتا؟ کیا اس کے معنی یہ سمجھے جائیں گے کہ "نسخہ بھوپال" کے بارے میں جو روایتیں بیان کی جاتی ہیں سرے سے غلط ہیں؟

میاں یار محمد خاں شوکتؔ بھوپالی غالبؔ کے شاگرد بھی تھے اور ان کے پرستار بھی! مرزا سے ملنے کے لئے دلی بھی پہنچے اور ان سے سلسلۂ مراسلت بھی قائم رکھا۔ لیکن آج ان کے نام غالبؔ کا کوئی خط نہیں ملتا؟ جو غالبؔ اور بھوپال کے اس تاریخی تعلق پر روشنی ڈال سکے۔

غالب کے احباب اور شاگردوں کا وسیع حلقہ ہندوستان بھر میں پھیلا ہوا تھا ان میں سے بہتیرے ایسے بھی تھے جنھوں نے مرزا کی صورت تک نہیں دیکھی تھی صرف خط وکتابت سے نصف ملاقات کا لطف اٹھایا کرتے تھے؟ کیا کوئی شخص یہ دعوے کرسکتا ہے کہ غالب کے وہ تمام خطوط دستیاب کر لئے گئے ہیں جو اس کثیر حلقۂ تلامذہ واحباب کو لکھے گئے تھے اور اگر ایسا نہیں ہے تو صرف اس نامکمل سلسلۂ مراسلت کے مختلف ٹکڑوں کو جوڑ کر آج غالب کی شخصیت کی مستند، مستحکم اور مضبوط تعمیر کس طرح ممکن ہے؟ متداول دیوان کا انتخاب علامہ فضل حق خیرآبادی نے کیا ہو یا خود غالب نے؛ شخصیت سازی کے جذبۂ افراط و تفریط نے اسے خواہ مخواہ غالب کے وقار کا سوال بنا دیا ہے! جہاں تک میں سمجھتا ہوں غالب کے فن کی عظمت نہ تو اس سے بڑھ سکتی ہے کہ یہ انتخاب خود ان کا کیا ہوا ہے؟ اور نہ "آب حیات" کی اس روایت سے اس پر کوئی حرف آتا ہے۔

"اِلحاق وانِتساب"

حسد سزائے کمال سخن ہے کیا کیجیے
ستم بہائے متاعِ ہُنر ہے کیا کہیے
(غالبؔ)

سرقہ و توارد کی طرح "انتساب اور الحاق" کا مسئلہ بھی بعض نازک پہلوؤں سے بہت ہی پیچیدہ اور ناہموار ہے کیونکہ اس کا بہت کچھ تعلق نیتوں کے فرق سے ہے! فارسی کا تو ذکر ہی کیا؛ خود اساتذۂ اردو کے کلام میں بہت سی مثالیں ایسی ملیں گی جنھیں "توارد" کے سوا اور کچھ نہیں کہہ سکتے! بعض مقامات پر تو پورے پورے مصرعے ٹکرا گئے ہیں۔ میر انشاء اللہ خاں انشاؔ کی کنیز "یاسمین" کا ذکر حکیم فصیح الدین رنجؔ میرٹھی (تلمیذ غالبؔ) نے اپنے تذکرہ "بہارستان ناز" میں کیا ہے اور نمونہ کلام میں "یاسمین" کی ایک غزل کے چند شعر بھی نقل کئے ہیں۔

گردش بخت سے پھر ہوں دوچار — پھر ترا راہ گذر یاد آیا
یاد آیا مجھے گھر دیکھ کے دشت — دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا
کوچ کر جائیں گے ہم دنیا سے — گر ترا وقت سفر یاد آیا
گر ہی جائیں گی نظر سے حوریں — تو مجھے خلد میں گر یاد آیا
سرمہ کھلوایا خموشی نے مجھے — وہ جو منظور نظر یاد آیا

اسی زمین میں غالبؔ کی غزل بھی ہے جس میں یہ دو شعر بھی شامل ہیں۔

کوئی ویرانی سی ویرانی ہے — دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا
دم لیا تھا نہ قیامت نے ہنوز — پھر ترا وقت سفر یاد آیا

یاسمینؔ کے دوسرے اور تیسرے شعر سے غالب کے ان دونوں اشعار کا "توارد" بہرحال توارد ہی ہے سرقہ نہیں کہا جاسکتا۔

اسی طرح غلط انتساب کی بھی مثالیں کثرت سے موجود ہیں ایک دو نہیں؛ دس بیس نہیں! سیکڑوں ہزاروں! فارسی شعرا کے کلام میں بھی۔ اُردو میں بھی۔!

ذوق کے استاد شاہ نصیرؔ دہلوی لکھنؤ پہونچے ان کے فرزند شاہ وجیہ الدین منیرؔ بھی ساتھ تھے دونوں شیخ غلام ہمدانی مصحفیؔ سے ملے! قیاس یہی ہے کہ شعر و سخن

کا چرچا بھی رہا ہوگا کچھ ان لوگوں نے سنایا ہوگا؛ مصحفی نے جب تذکرہ "ریاض الفصحا" مرتب کیا تو شاہ نصیر کے صاحبزادے شاہ منیر کو "جوان خوش فکر است (۳۱۹) لکھ کر یہ مشہور مطلع ان سے منسوب کیا۔

رخصت اے زنداں جنوں زنجیر در کھڑکائے ہے
مژدہ خارِ دشت پھر تلوا مرا کھجلائے ہے

ذوقؔ کے دیوان اور انتخابات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مطلع ذوق کے نتیجۂ فکر سے تعلق رکھتا ہے شاہ منیر کا نہیں ہے؛ خود ذوق کا لکھنؤ جانا یا مصحفی سے ملاقات کرنا ثابت نہیں! ظاہر ہے کہ یہ مطلع انھوں نے شاہ منیر کے نام سے سنا اور انھیں کے نام سے درج کر دیا۔!

علامہ شبلی نے "شعر العجم" میں "میر" کے لفظ سے دھوکا کھا کر جس طرح سنا تھا بلا تحقیق اس شعر کو میر کا "مقطع" سمجھ لیا۔!

بعد مرنے کے مری قبر پہ آیا وہ میرؔ
یاد آئی مرے عیسیٰ کو دوا میرے بعد

جناب حنیف نقوی سہوانی لکھتے ہیں ۔۔!

"یہ شعر قطعی طور پر "الحاقی" ہے۔ کلام میر سے اس کا کوئی تعلق نہیں لیکن میر تخلص کے ساتھ شہرت عام کی بنا پر جس قدر علامہ شبلی کو غلط فہمی ہوئی اسی طرح دوسرے مصنفین نے بھی یہ مقطع اور اسی کے ساتھ اس زمین کے دوسرے شعر بھی میرؔ سے منسوب کر دیئے چنانچہ اسی زمین کا یہ مطلع ....!

آ کے سجادہ نشیں قیس ہوا میرے بعد
نہ رہی دشت میں خالی مری جا میرے بعد

(ڈاکٹر) یوسف حسین خاں نے "اردو غزل" میں صفحہ ۲۳۹ پر میرؔ کے نام سے اور پھر، صفحہ ۴۹۵ پر انتخاب کلام غافل کے تحت نقل کیا ہے۔ درحقیقت یہ شعر غافلؔ لکھنوی کا ہے ۔۔ غافلؔ کا دیوان نول کشور پریس سے شائع ہو چکا ہے۔ (صفحہ ۲۶۔ ماہنامہ نیا دور لکھنؤ۔ اکتوبر ۱۹۵۹ء)

تمھارے لوگ کہتے ہیں کمر ہے
کہاں ہے. کس طرح کی ہے کدھر ہے

حنیف صاحب تحریر فرماتے ہیں [1]

"یہ شعر تحریر و تقریر میں بالعموم جرأت سے منسوب کیا جاتا رہا ہے چنانچہ واجد علی شاہ اختؔر (آخری تاجدار اودھ) نے رقص و موسیقی سے متعلق اپنی ایک تصنیف "بنی" میں انھیں کے نام سے نقل کیا ہے لیکن حقیقت "تذکرہ ہندی" مؤلفہ مصحفی صفحہ ۸ "تذکرہ ریختہ گویاں" فتح علی خاں گردیزی صفحہ ۱۰۔ "مخزن نکات" قائم چاندپوری صفحہ ۱۶ "گلشن ہند"۔ میرزا علی لطف صفحہ ۲۸۔ اور "نکات الشعراء" میر تقی میرؔ صفحہ ۱۳ کے مطالعہ سے واضح ہوتی ہے ان تذکروں میں یہ شعر میاں نجم الدین عرف شاہ آبرو کی ملکیت قرار دیا گیا ہے مصحفی نے اپنے تذکرہ میں آبرو کی اس غزل کے دو شعر اور بھی نقل کئے ہیں جس میں مقطع بھی شامل ہے۔ کثرت استعمال کی وجہ سے زیر بحث شعر کے مصرعہ اول میں بعض لفظی اختلافات پیدا ہو گئے ہیں جو چنداں اہم نہیں ہیں" (نیا دور لکھنؤ۔ اکتوبر ۵۹ء)

یہی چند مثالیں نہیں۔ نیک نیتی کی اور بہت سی مثالیں ملتی ہیں۔ ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی نے اپنے تحقیقی مقالے (دلی کے دبستان شاعری) میں یہ دو شعر میر حسن سے منسوب کئے ہیں۔

کئے اضداد پیدا۔ قدرتاً معلوم ہو شے کی
جہنم کے مقابل خلدِ جاوداں کیا پیدا

کوئی بانی ہے بیشک محفل زیبائے عالم کا
نہ ہو یوں منتظِم مجلس نہ جتبک مجلس آرا ہو

---

[1] آب حیات طبع (۱۸۸۷ء) میں یہ شعر اس طرح پر درج ہے۔
صنم سنتے ہیں تیرے بھی کمر ہے   کہاں ہے کس طرف کو ہے کدھر ہے!

اور اس شعر کو شیخ امام بخش ناسخ کے نام سے تحریر فرمایا ہے۔

بلند و پست عالم کا بیاں تحریک کرتا ہے
قلم ہے شاعروں کا یا کوئی رہرو ہے بھٹکا

حالانکہ مندرجہ بالا دونوں شعر میر حسن کے نہیں۔ بلکہ راسخ عظیم آبادی کے ہیں — اور یہ آخری شعر خواجہ آتش کے مطبوعہ کلیات میں موجود ہے۔

انجمن ترقی اردو (ہند) کے شائع کردہ "انتخاب کلام میر" میں مندرجہ ذیل مطلع کو ڈاکٹر مولوی عبدالحق مرحوم نے میرؔ کا مطلع قرار دیا ہے۔!

یہ جو چشم پر آب ہیں دونوں　　ایک خانہ خراب ہیں دونوں

لیکن حنیفؔ نقوی صاحب کی تحقیق یہ ہے کہ —!

"قدرت اللہ قاسم نے" مجموعہ ۲۱۳ پر اور مولوی کریم الدین نے تذکرہ (طبقات) شعرائے اردو" صفحہ ۲۴۸ پر لالہ بال مکند حضورؔ (شاگرد خواجہ میر درد) کے کلام میں نقل کیا ہے میرے پیش نظر اس وقت "کلیات میر" کے دو نسخے ہیں ایک نول کشور پریس کا شائع کردہ ہے اور دوسرا ڈاکٹر عبادت بریلوی کا مرتبہ — ان دونوں نسخوں میں اس مطلع کی عدم موجودگی سے قاسم اور کریم الدین کے خیال کی تصدیق اور دوسرے مصنفین کے انتساب کی تردید ہو جاتی ہے۔"

(ماہنامہ نیا دور لکھنؤ۔ اکتوبر ۱۹۵۹ء)

قاتل ہماری لاش کو تشہیر دے ضرور　　آئندہ تا کسی سے نہ کوئی وفا کرے

فکر معاش عشق بتاں یاد رفتگاں　　اس زندگی میں اب کوئی کیا کیا کیا کرے

ان اشعار کے متعلق بھی حنیف نقوی صاحب اپنے مضمون" بعض اشعار کا غلط انتساب" میں لکھتے ہیں۔

"انجمن ترقی اردو پاکستان کے نقیب پندرہ روزہ "قومی زبان" (کراچی) کی اشاعت مورخہ ۱۶ نومبر ۱۹۵۸ء میں ایک مستقل عنوان" غزل نما" کے تحت اشرف علی فغاںؔ (متوفی ۱۸۸۶ء) کی غزلیات کا ایک مختصر

انتساب پیش کیا گیا ہے۔ یہ انتخاب شاعر موصوف کے دیوان مرتبہ سید صباح الدین عبدالرحمٰن (شائع کردہ انجمن ترقی اردو پاکستان) پر مبنی ہے منتخب اشعار میں مندرجہ بالا دونوں شعر بھی شامل ہیں۔ جو دراصل فغاںؔ کے نہیں ہیں۔ سوداؔ کے ہیں۔ اس زمین میں سودا کی غزل "کلیات سوداؔ" مرتبہ عبدالباری آسی و شائع کردہ نولکشور پریس لکھنؤ جلد اول صفحہ ۲۱۰ پر موجود ہے۔ سوداؔ نے خود ہی اس غزل کی تخمیس بھی کی ہے جو مخمسات کے تحت مذکورہ کلیات میں صفحہ ۳۲۴ و ۳۲۳ پر درج ہے۔"

(ماہنامہ نیا دور لکھنؤ۔ اکتوبر ۱۹۵۹ء)

تصویر کا دوسرا رُخ بہرحال "خوش کن" نہیں ہے۔ خود غالبؔ کی پوری پوری غزلیں دوسروں کے دیوانوں میں بہت معمولی اور لفظی ردوبدل کے ساتھ شامل کردی گئیں۔ نواب حیدر علی سحر دہلوی کے مجموعہ کلام "گلدستۂ سحر" (مطبوعہ کارخانہ بزم تہذیب یحییٰ گنج لکھنؤ ۱۹۰۷ء) پر تبصرہ کرتے ہوئے "ڈبل توارد" کے عنوان سے ماہنامہ معیار لکھنؤ (اکتوبر ۱۹۱۰ء) میں لکھا ہے۔

"آج میری نظر سے جناب نواب حیدر علی صاحب المتخلص سحر دہلوی کے کلام موسوم بہ "گلدستۂ سحر" کی صورت میں گذرا دو ایک غزلیں دیکھ کر تو طبیعت بہت خوش ہوئی اور خیال ہوا خدا کا شکر ہے اب بھی ایسے ایسے شاعر موجود ہیں جن کے کلام میں شعرائے قدیم مثل غالبؔ وغیرہ کے کلام کا سا لطف آتا ہے لیکن ناگاہ اس شعر (مطلع) پر ۔۔ !

لیے نظرِ کرم تحفہ ہے شرم نارسائی کا
بہ کیوں غلطیدۂ صد رنگ دعویٰ پارسائی کا

جو نظر پڑی تو سب قلعی کھل گئی۔ اکثر شعرائے قدیم اور حال کے کلام میں دیکھا گیا ہے کہ کسی مصرعہ یا کسی شعر میں توارد ہو جاتا ہے لیکن یہ توارد کا "قبلہ گاہ" آج ہی دیکھا کہ مندرجہ بالا غزل کی غزل حضرت غالبؔ کی ٹکی ہوئی ہے اور مقطع پر لکھا ہے۔

نہ دے نامہ کو اتنا طول سحراب مختصر کردے
کہ حسرت کا لہو کردے نہ یہ دفتر جدائی کا

اس تمہید کے بعد تبصرہ نگار نے غالب اور سحر کے اشعار بھی اپنے دعوے کے ثبوت میں پیش کئے ہیں۔

غالب —

نہو حسن تماشا دوست رسوا بیوفائی کا — بمہر صد نظر ثابت ہے دعویٰ پارسائی کا

سحر — ایضاً — ایضاً — ایضاً

غالب — ایضاً — ایضاً

زکوٰۃ حسن دے اور جلوۂ بینش کہ مہر آسا — چراغ خانۂ درویش ہو کاسہ گدائی کا

سحر — ایضاً

غالب

چمن کا جلوہ باعث ہے مری رنگین پائی کا

سحر — وہی اک کا بنے جویاں نفس داں نکہت گل ہے

غالب — ″

نہ دے نامہ کو اتنا طول غالبؔ مختصر کردے — کہ حسرت سنج ہوں عرض ستمہائے جدائی کا

سحر

نہ دے نامہ کو اتنا طول سحرابؔ مختصر کردے — کہ حسرت کا لہو کردے نہ یہ دفتر جدائی کا

غالبؔ کے آرٹ اور فن کو جن مختلف ادوار کا مقابلہ کرنا پڑا اس نے اردو شاعری کو متضاد کیفیات سے دوچار کردیا۔ اور جیسے جیسے غالب کی مقبولیت بڑھتی گئی ان کے مخالفین کے محاذ کا رخ بدلنے لگا۔ تنقیص وتنقید کی گرمی گفتار پر سرد مہری چھائی۔ جوابی دیوانوں کا زور شور کم ہوا— اب ایک ہی راستہ رہ گیا تھا کہ غالب کے مخصوص ابتدائی رنگ کا مضحکہ اڑانے کے لئے ان کے رنگ میں بے معنی اور مہمل غزلیں کہہ کر ان کے فن اور آرٹ پر چوٹ کی جائے — چنانچہ یہ سلسلہ شروع ہوا اور آج تک "نیت کے فرق" کے ساتھ باقی ہے یعنی اب سے تیس چالیس برس ادھر تک غالبؔ کے رنگ میں ان

مخالفین نے جو طبع آزمائی کی اس کا عام پہلو طنز ہی ہوتا تھا۔ بہت ہی کم ایسی مثالیں ملتی ہیں کہ کہنے والے اپنی اعلیٰ صلاحیتوں کو اس لئے بروئے کار لائے ہوں کہ بلندیٔ فکر پرواز تخیل کے جو "ہفت آسمان" غالبؔ کے زمانے میں موجود تھے آج بھی باقی ہیں۔ یا قدرت نے غالبؔ کو جس انفرادیت سے مالا مال کیا تھا اس میں آج بھی کوئی کمی نہیں ہوئی اور "جود و کرم" کے یہ دروازے آج بھی کھلے ہوئے ہیں۔

اس مقصد و خیال کی نمائندہ مثالیں ملتی ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس "مکتبۂ خیال" کا حلقہ محدود نہیں تھا۔ ہو سکتا ہے کہ یہ حضرات مختلف فرضی ناموں سے سامنے آتے رہے ہوں لیکن ان میں ایک دو نام ایسا بھی ہے جو اس دور کی مزاحیہ صحافت" کے لئے نامانوس نہیں تھا۔ ۳۰ مئی ۱۹۰۶ء کے ہفت روزہ "فتنہ" گورکھپور (جلد ۲۱ شمارہ ۲۲) میں جن آزاد کی غزل "غالبؔ کا رنگ" شائع ہوئی ہے ان کا نام کچھ تھوڑے بہت فرق کے ساتھ "فتنہ" کی فائلوں میں جگہ جگہ نظر آتا ہے کہیں "آزاد رقم" کہیں "ع۔ کے آزاد"! جو "فتنہ" کے ایڈیٹر "عبدالکریم برہم" ہو سکتے ہیں یا پھر آزاد غازی پوری جو "فتنہ" کے خاص لکھنے والے تھے۔

اس دور کی مزاحیہ صحافت کا ایک دلچسپ پہلو یہ بھی تھا کہ لکھنے والا اپنا فرضی نام موضوع کی مناسبت سے لکھا کرتا تھا۔ چھوٹے چھوٹے مفرد اور مرکب جملوں میں بھی۔ اور مصرعوں اور شعروں میں بھی! مثلاً

مضمون نگار	عنوان
ایک مستفسر	ایک استفسار
رسیدہ بود بلائے ولے بخیر گذشت	ببنی میں بورڈ نے کیا کیا
۲۔ ن۔ بینچرل نگار از صفی پور	نیچرل شاعری کی بینچرل تضمین
طبلہ نواز جنگ	طبلے کی تاریخ
کنکوا	برٹش فوج میں
"غالب خستہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں۔	پولیٹیکل شہادت

ان فرضی ناموں کے پیچھے کوئی بھی ہو۔؟ اپنے مقصد اور نیت کے اعتبار سے

بہر حال یہ سب ایک ہی تھے! اور غالب کے رنگ میں جو کچھ پیش کیا گیا ہے اس میں "طنز" کی تندو تیز تلخی کے سوا کچھ نہیں ہے۔ آزاد کی یہ غزل " غالب کا رنگ" ملاحظہ ہو۔

خم محراب حرم کعبہ ابرو نہوا — سرد ہمتائے نہال قد دلجو نہوا
انبساط فلکیات مشک ہی سہی — دیدۂ حور تمنا میں وہ جادو نہوا
التہاب تف دل سے جو شرر اٹھتے ہیں — پر پرواز نہ تھا۔ تیر ترازو نہ ہوا
صورت گم شدگی عقدۂ لاینحل تھی — خط موہوم معمہ میں بھی اک سو نہوا
شعلۂ طور سہی۔ شعلہ جوالہ سہی — لطف کیا بزم میں جب میں نہوا تو نہوا
تھا ہمیشہ سے مری تاک میں صیاد ازل — زخم انگور۔ برنگ "رم آہو" نہوا
ہے "اعانت طلبی" مذہب عشاق میں کفر — غیر تو غیر۔ مجھے دل پہ بھی قابو نہوا
نظری سے ہے کہیں بڑھ کے بدیہی کا عروج — خم محراب۔ خم کعبہ ابرو نہ ہوا
بادۂ راہ فنا نقش ثبات ہستی — غیرت عقد ثریا رخ گیسو نہوا
آخر اے ضبط نفس شور عنادل کب تک — دل صد غنچہ جو سرگرم "تگاپو" نہوا

آفتاب سر محشر میں یہ جدت آزاد
عرصہ حشر مگر سایہ گیسو نہوا

(فتنہ گورکھپور ۳۰ مئی سنہ ۱۹۰۶ء)

اس قسم کی دوسری غزل ۱۸ جولائی سنہ ۱۹۰۶ء کے "فتنہ" (جلد ۱۲ شمارہ ۲۹) "ہم رنگ غالب" کے زیر عنوان "گریجویٹ" کے فرضی نام سے شائع کی گئی ہے۔

خودرئی وصل بنانے کو بیاباں نکلا — ذوق معکوس تمنائے صفاہاں نکلا
وصل آشفتگی یار بہ ارماں مغلوب — شوق مقدور بہر سو رخ تاباں نکلا
بار تکلیف تکلف سے ہوا ہم آہنگ — درد اک رے از بنا پھر پس ارماں نکلا
وقت اہل نظر دیدۂ موسیٰ میں نہ تھی — ریزۂ سنگ ہر اک کیوں شرر افشاں نکلا
ستم و جور بہ ہنگام خموشی معلوم — صاعقہ برق تمنا کو گریباں نکلا
داغ ہائے خلش دل کی نہ پوچھو تاثیر — شعلۂ تار نفس نالۂ سوزاں نکلا
تف دل سوزش ہجراں سے زیادہ جانسوز — عقدۂ وصل خیال رخ جاناں نکلا

تابش رخ ہے مسیحائے قیامت ہم دوش — دست عنبر بھی مرا چاک گریباں نکلا
یہ مدارات نہیں۔ شورش ہنگام کیساتھ — رہگذر ساتھ لئے صورت درباں نکلا
وہم و تخیل میں ہم رنگ خیال گلچیں — خوف دل غازہ رخسار حسیناں نکلا

وجہ تشویش و توہم ہے ہلال سر چرخ
ہے یہ تخیل کہ ناخن پہ داماں نکلا

طنز و مزاح کی یہ شکست خوردہ ذہنیت اس تصویر کا ایک رخ ہے جس کے کچھ بے رنگ نقوش غالبؔ کی زندگی میں ابھر آئے تھے چنانچہ اسی ناقدری سے گھبرا کر غالبؔ کو کہنا پڑا۔

ہو چاہیئے نہیں وہ مری قدر و منزلت — میں یوسف بہ قیمت اول خریدہ ہوں
اہل ورع کے حلقہ میں ہر چند ہوں ذلیل — پر عاصیوں کے فرقہ میں میں برگزیدہ ہوں
پانی سے سگ گزیدہ ڈرے جس طرح اسدؔ — ڈرتا ہوں آئینہ سے کہ مردم گزیدہ ہوں

اور "مردم گزیدگی" کی یہ تحریک مختلف رنگ و روپ میں غالب کے بعد بھی نشو و نما پاتی رہی۔ آسودہ حالی اور فارغ البالی کے اسی دور میں جب انقلاب اٹھارہ سو ستاون (۱۸۵۷ء) کا ردعمل شروع ہوا تو ہر چھوٹے بڑے دربار میں درباری شعراء کے ساتھ ساتھ "ادبی کھلونوں" کی آرائش بھی ہونے لگی! مصاحبت اور درباری کے قدیم فنون اس وقت تک اپنی پوری جلوہ سامانیوں کے ساتھ زندہ تھے اس لئے یہ "ادبی کھلونے" اس جیتے جاگتے ماحول میں ایک اہم کردار کی جگہ پاتے چلے گئے جن کی "تک بندیاں" صرف اپنے آقائے نعمت اور ان درباری شعراء کی خوشنودی تک محدود تھیں۔ جو لکھنؤ اور دہلی کے ان اسکولوں سے تعلق رکھتے تھے جنھیں غالبؔ کی مشکل پسندی کبھی ایک آنکھ نہیں بھائی۔

چھوٹے چھوٹے درباروں کا تو ذکر ہی کیا؟ انقلاب سن ستاون کے بعد حیدرآباد اور رامپور نے اجڑی ہوئی دہلی اور لٹے ہوئے لکھنؤ کے جن ارباب کمال کی سرپرستی کی تھی ان میں بھی غالبؔ کے تلامذہ اور عقیدت مند برائے نام ہی ہوں گے! ان دونوں سرکاروں میں برسہا برس "امیر اور داغ" کے سوا کوئی دوسرا قدم نہ جما سکا۔ لیکن ان دونوں میں غالب پسند کوئی بھی نہیں تھا ــــ امیر مینائی اسیر کے شاگرد تھے

اور داغ ذوق کے!

میں نے نہ تو حیدر آباد کا دربار دیکھا نہ رامپور کا ـــ! لیکن اس قسم کے ادبی کھلونوں کے چلتے پھرتے نمونے ضرور دیکھے ہیں! خود میرے وطن سیتاپور میں ایک ایسے ہی استاد ابھی ۱۹۴۷ء کے بعد تک موجود تھے۔ رحم علی نام تھا "ششدر" تخلص! ۱۹۵۷ء میں تخمیناً پچھتر سال کی عمر میں وفات پائی۔ پڑھے لکھے واجبی ہی تھے لیکن شاعر بقول ظریف لکھنوی "مادر زاد" تھے! میں نے شعور کی آنکھ کھولی تو انھیں "استاد" ہی پایا! سیتاپور کے ہر چھوٹے بڑے مشاعرے میں ان کے لئے ایک خاص جگہ تھی! اگر نومشقوں میں پڑھا دیئے گئے، تب بھی یہ سمجھ کر خوش اور مطمئن کہ مشاعرہ کا افتتاح میری غزل ہی سے ہوا اور اگر ہزل گویوں" کے ساتھ سب سے آخر میں پڑھنے کا موقع دیا گیا! تو نہ پوچھئے استاد کا صحیح مقام ہی یہی تھا۔ ان کے بعد کس میں ہمت تھی جو غزل پڑھتا!

صفیؔ لکھنوی ہوں یا مرزا ثاقبؔ! ریاضؔ خیرآبادی ہوں کہ عزیزؔ لکھنوی۔ محشرؔ لکھنوی۔ مرزا یاسؔ یگانہ۔ دلؔ شاہجہانپوری۔ جگرؔ بسوانی۔ بیخودؔ موہانی۔ پنڈت جگموہن ناتھ شوقؔ۔ قیسؔ موہونوی۔ ہاشمؔ جرولی۔ رمزؔ تلہری غرضکہ سبھی سے اپنے آپ کو استاد کہلوالیا۔! آئے دن روساء سیتاپور کے یہاں ان کی مخصوص نشستیں منعقد ہوا کرتیں اور استاد اپنی روایتی فنکارانہ آن بان کے ساتھ ان کی زینت ہوا کرتے تھے۔ نہایت ہی مہذب اور شائستہ ماحول تھا ہنسی اور مضحکہ کا تو ذکر کیا؟ ان صحبتوں میں کبھی کھل کر ان پر طنز بھی نہیں کی جاتی۔ سامعین دل کھول کر داد دیتے اور یہ سرو قد کھڑے ہو کر آداب بجالاتے تھے۔

"استاد" شاعر تو بس جیسے تھے۔ تھے ہی! آدمی حد درجہ نیک تھے! داد دہش کا دور ختم ہو گیا تب بھی ان کی استادانہ وضعداری میں کوئی فرق نہیں آیا۔ جب کبھی کوئی مصرعہ یا شعر "ٹاٹ باہر" گیا از راہ شفقت بزرگانہ تشریف لائے میں نے دھاگے سے ناپ کر انھیں مطمئن کر دیا۔ پھر میری نام نہاد شعری فنکاری پر اعتماد ایسا کہ اگر میرؔ۔ ناسخؔ۔ آتشؔ۔ غالبؔ اور ذوقؔ بھی آکر کہتے کہ مصرعہ ناموزوں ہے تو استاد کسی ایک کی نہ سنتے۔ استاد کا شعری فن غزل ہی تک محدود نہیں تھا۔ نعت قوالی یہاں تک کہ ترنم کے ساتھ گیت بھی پڑھ دیتے تھے! ان کی غزل "تلمیحات" کا ایک ایسا عجوبہ ہوتی تھی جس میں کہیں تو حضرت موسیٰ کوہ طور پر

"جوئے شیر" کی تیاری میں مصروف ہوتے اور کہیں قیس عامری "انا الحق" کہنے کے جرم میں دار پر نظر آتا۔ منصور بازار مصر میں فروخت کیا جاتا اور زلیخا صحرا نوردی کی صعوبتیں جھیلتی! ایسا ہی ایک مطلع ملاحظہ فرمائیے۔

شیریں نے تیشہ مار کے سر پر جو آہ کی
آواز آئی اَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللہ کی

اعتراض کیا گیا کہ استاد — شیریں فرہاد کا زمانہ تو حضور سرور کائنات ؐ کی ولادت باسعادت سے پہلے کا ہے اور "کلمہ طیبہ" تو اس کے بہت بعد کی چیز!

لاحول ولاقوۃ —" استاد نے استغفار بھیجتے ہوئے جواب دیا: جب آپ کو "کلمہ طیبہ" کی حقیقت کا پتہ نہیں تو کیا اعتراض کرتے ہیں؟ مسلمان ہو کر آپ نے ایسا لغو اعتراض کر دیا۔ حیرت ہے؟ کیا حضرت آدم کی خلقت اسی "کلمہ طیبہ" کا معجزہ نہیں تھی نوح کو اس طوفان سے کس نے بچایا؟ یونس کو "بطن ماہی" سے کس نے نجات دلائی؟ حضرت یعقوب کو حضرت یوسف کا وصال کیسے نصیب ہوا؟ کیا سوائے "اشہد اُ لا الہ الا اللہ محمد الرسول اللہ" کے کوئی دوسرا کلمہ پاک تھا۔

معترض کے پاس ظاہر ہے اس کا کوئی جواب نہ تھا — !

لیکن —

غالب کے رنگ میں استاد کی "مشق ستم" کا مقصد نہ تو غالب کا مضحکہ اڑانا تھا نہ ان پر طنز کرنا۔ اس قسم کی "مشق" درصل ان کی موزونی طبع اور تلاش الفاظ تک محدود تھی۔ پرشکوہ بندش الفاظ۔ فارسی کی مہمل ترکیبیں بے معنی قافیہ پیمائی اور مرعوب کن تخیلات ہی اس فکر کا نتیجہ تھیں اور بس! چنانچہ اس رنگ میں استاد نے جو کچھ ارشاد فرمایا ہے۔ اس کی چند مثالیں اس عالمانہ شرح کی محتاج ہیں جن کے سمجھنے کے لئے خود استاد کو ہمیشہ دوسروں سے مدد لینا پڑی۔

التہاب نظر و گرمی گفتار ہنوز — ناصیہ سا ہے یہ اور رنگ نگہدار ہنوز
روکش داغ جبیں زینت صد چشم حسود — تشنہ تاب نظر ہے ابھی دیدار ہنوز
دل صد چاک متاع نفس زیست سہی — وادیٔ ایمن ہستی ہے سردار ہنوز

درس عنوان ہے وارفتگیٔ منزل شوق	خضر گم گشتہ ہے بارفتہ رفتار ہنوز

اس پس منظر میں جہاں تک دیکھئے گا قدم قدم پر ایسی صدہا مثالیں ملیں گی۔ اچھی بھی بری بھی! مضحکہ خیز بھی۔ افسوسناک بھی! لیکن رخ ان سب کا ایک ہی منزل کی طرف ہوگا؟ غالب اور صرف غالب کی طرف ۔۔۔!

قابل برداشت یہ بھی تھا مگر اس "ہنگامہ آرائی" نے دوسرا راستہ اپنایا وہ بہت ہی غمناک ہے! غالب پسندی اور غالب فہمی وجدانیت میں تحلیل ہوئی اور پھر جہاں بھی غالب کے کلام سے ملتا جلتا کوئی شعر نظر آیا اسے بلا کسی تصدیق و توثیق کے "کلام غالب" قرار دے دیا گیا ۔۔۔ انتخابات ہیں۔ مختلف مجموعوں میں یہاں تک کہ رفتہ رفتہ یہ کلام غالب کے مروجہ دیوانوں میں ان کے غیر مطبوعہ کلام کی شکل میں جگہ پاتا چلا گیا۔ اور اس طرح پر غالب کے کلام میں بہت سا حصہ ایسا شامل ہو گیا جسے غالب سے دور کا بھی علاقہ نہیں۔

یہ الحاقی کلام کن چور دروازوں سے غالب کے کلام کا جزو بنا؟ اس کی بہت سی مثالیں آپ ان اوراق میں ملاحظہ فرمائیں گے اور یہ بھی دیکھیں گے کہ الحاق و انتساب کا یہ سلسلہ نیا نہیں بلکہ بہت پرانا ہے۔ بعض جگہ لوگوں نے "غالب" کے نام سے دھوکا کھایا۔ بعض جگہ انداز بیان و رنگ سخن سے کوئی تخیل کے عمق سے مرعوب ہوا۔ اور کوئی پرشکوہ فارسی ترکیبوں سے کسی نے صرف راوی کی شخصیت پر اعتماد کیا اور کوئی تحقیق کے میدان میں دوسروں پر سبقت لے جانے کے لئے۔ کہیں بے احتیاطی اور جذبہ غالب پرستی کے غلو نے "غالبیات" کے لئے ایک ایسا مسئلہ پیدا کر دیا جسے تحقیق کی روشنی میں اب بہرحال سامنے آ ہی جانا چاہیے۔

غلطی ہائے مضامین

غلطیہائے مضامیں مت پوچھ
لوگ نالے کو رسا باندھتے ہیں

(غالبؔ)

(۱)

زرافشاں مانگ ہے اور سبزہ اس پر اک دوشالا ہے
غضب یہ ہے، پر طاؤس میں کالے کو پالا ہے

"نسخۂ عرشی" میں مولانا عرشی رقمطراز ہیں ــ
"یہ شعر مفتی انتظام اللہ خاں شہابی نے انشائے بے خبر" کے دیباچے میں اس تمہید کے ساتھ لکھا ہے۔
"ایک بار مرزا صاحب دہلی سے آگرے گئے تو نیل کے کٹرے میں مجلس احباب منعقد ہوئی۔ مرزا حسام الدین بیگ۔ خواجہ غلام غوث بے خبر وغیرہ سخن سنج شریک مجلس تھے۔ شعر و شاعری کا چرچا تھا۔ اس زمانے میں فرقہ اہل نشاط سے ایک قاصہ "صنم" تھی جس کا شہرہ بہت تھا اور وہ خود بھی فکر سخن کرتی تھی ــ وہ بھی شریک مجلس ہوئی میرزا صاحب نے فی البدیہہ (یہ شعر) ارشاد فرمایا۔"
اس کے بعد مفتی صاحب (انتظام اللہ خاں شہابی) نے اخبار "قومی زبان" کراچی بابت یکم دسمبر، ۱۸۵۷ء[1] میں "غالب اور ساحر" کے عنوان سے ایک مضمون شائع کیا۔ اس میں لکھا کہ ــ!

"مرزا غالب آخری مرتبہ دلی سے سنہ ۱۸۳۳ء یا سنہ ۱۸۳۴ء میں (اپنے) وطن (آگرہ) آئے۔ مرزا حسام الدین بیگ خلف مرزا مغل بیگ رئیس برارا کے یہاں چند روز مقیم رہے۔ ننھیال میں کوئی نہ رہا تھا ماموں باندے جا چکے تھے۔ میرزا صاحب کی تشریف آوری پر صحبت احباب منعقد کی گئی۔ صحبت میں مہر[2]۔ راجہ۔ بے خبر۔ شیخ احمد علی شیون میر زین العابدین شورش وغیرہ شریک ہوئے۔ تمام اصحاب جمع

---

[1] ٹائپ کی غلطی ہے ۱۹۵۷ء ہونا چاہئے (نادم سیتاپوری) [2] مرزا حاتم علی بیگ مہر

ہو گئے تو صنم" زرق برق لباس میں آئی اس پر غضب یہ تھا کہ سبز دوشالہ اوڑھ رکھا تھا۔ پیشانی پر قشقہ لگا ہوا ۔ داخل محفل ہوئی ۔ ہر ایک کی نگاہ اس پر پڑے بغیر نہ رہی! مرزا غالب بے ساختہ کہتے ہیں ۔

سبہ چوٹی ۔ زرافشاں مانگ ۔ سبز اس پر دوشالا ہے
تماشا ہے پر طاؤس میں کالے کو پالا ہے

(صفحہ ۳۹۳ ۔ نسخۂ عرشی)

جناب مالک رام اسی شعر کے سلسلہ میں تحریر فرماتے ہیں ۔
"شرح غالب (ص ۳۹۳) میں جناب عرشی صاحب نے اس شعر سے متعلق صاحب موصوف (مفتی انتظام اللہ خاں شہابی) کے دو مختلف مضمونوں کے اقتباس دیئے ہیں ۔ دونوں کا مضمون ایک ہی ہے جب مرزا غالب آخری مرتبہ آگرے گئے تو وہاں محفل احباب میں ایک رنڈی "صنم" نامی کو زرق برق لباس میں ملبوس ۔ سبز دوشالہ اوڑھے ہوئے دیکھا تو فی البدیہہ یہ شعر پڑھا ۔

مفتی صاحب موصوف نے "خلاف معمول" اس روایت کے لئے کوئی حوالہ نہیں دیا بہر حال اگر وہ ایسا کرتے ہیں جب بھی قابل قبول نہ ہوتا! میں افسوس کے ساتھ یہ ظاہر کرنے پر مجبور ہوں کہ شاید بہت کم لوگوں کو اس کا علم ہے کہ مفتی صاحب روایتیں وضع کرنے میں بہت مشاق ہیں وہ بالعموم کسی قلمی کتاب کا نام اختراع کر کے اس کی سند دیں گے یا کسی معروف کتاب کے قلمی حاشئے کا ذکر کر دیں گے اور لکھ دیں گے کہ یہ کتاب "مفتیان گوپامئو" (ضلع ہردوئی) کے کتب خانے میں ہے یا آرکاٹ (مدراس) کے شاہی کتاب خانے کی زینت ہے! یا کسی اور جگہ ہے؟ حالانکہ اس کا کہیں وجود نہیں ہوتا ۔ "گوپامئو" میں خیر سے کوئی کتب خانہ ہے ہی نہیں؟ اور جن کتابوں سے متعلق انھوں نے بعض مضامین میں آرکاٹ کا نام نہیں لیا ہے تحقیق سے وہ بھی غلط ثابت ہوا ہے! وہ (مفتی صاحب)

پچھلے ۲۵ - ۳۰ برس سے اس جعل کے مرتکب ہو رہے ہیں اور بہت سے لوگ اس سے گمراہ ہوئے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ انھیں اس پر متنبہ کیا جائے اور ان کی کوئی روایت اس وقت تک تسلیم نہ کی جائے جب تک کہ یہ کسی دوسری مصدقہ شہادت سے درست ثابت نہ ہو۔ فی الحال اتنے ہی اشارے پر اکتفا کرتا ہوں "

میں اس شعر کو محض مفتی صاحب کی سند پر غالب کا تسلیم کرنے سے انکاری ہوں۔ (صفحہ ۱۵۲۔ سہ ماہی فکر و نظر علیگڈھ جنوری ۱۹۶۱ء)

اس کتب خانے کے بارے میں محب محترم حکیم بہاؤالدین فاروقی گوپاموی مرحوم نے اپنے ایک خط مورخہ ۳ نومبر ۱۹۵۵ء میں مجھے لکھا تھا۔

"دودمان مفتیان گوپامؤ (ضلع ہردوئی) کے ایک فرزند مفتی جی انتظام اللہ اکبرآبادی اپنے پھوپی زاد بھائی مفتی محمد حسن وکیل جون پوری مؤلف "تاریخ خاندان مفتیان گوپامؤ" سرلاخیہ کے مصداق۔ آپ اپنے برادر معظم کے نقش قدم پر چل کر ایسے ایسے مضامین تراشتے رہتے ہیں کہ اگلوں کی دماغی پرواز کو وہاں تک رسائی نہیں مل سکتی۔

طرز تصنیف و تالیف ۔ چونکہ آپ (مفتی انتظام اللہ خاں شہابی) کے دادا صاحب نے اپنی ساری کمائی علمی نوادرات کے حصول میں صرف فرمائی اس لئے ان کا کتب خانہ عجائبات عالم میں شمار ہونے کے قابل ہے۔ اسی کی قوت پر آپ کی تالیفات وجود پذیر ہوتی رہتی ہیں ۔ اور آپ کو اپنے دعاوی کے ثبوت میں کوئی دشواری لاحق نہیں ہوتی۔ حتیٰ کہ وہ اس کی بھی پرواہ نہیں کرتے کہ ان کی کتب و حوالہ جات دنیائے تصنیف و تالیف میں وجود پذیر بھی ہوئیں یا نہیں؛ یہی عالم ان کے یہاں مصنفین کا ہے کہ جن صاحب کو جس کتاب کا مصنف چاہا لکھ دیا۔ دبرعکس انھیں یہ حق حاصل ہے کہ کسی کتاب کے اعتبار و استفسار کیلئے صرف اتنا ہی کافی ہوتا ہے کہ اس کے مضامین کیلئے کوئی حوالہ لکھ دیا جائے۔ بس ۔! رہا صدق و کذب و حقیقت! اس کا کوئی وجود خارجی نہیں

بلکہ وہ ایک حسیاتی و ذہنی چیز ہے......! حوالجات خواہ صحیح ہوں یا غلط
- ؟ لیکن اگر کوئی شخص "مفتی جی" کی رائے سے متفق نہ ہو سکے اور اس کا دل
ان کے مضامین یا حوالجات کو پرکھنا چاہے تو اولاً وہ کتابیں عنقا
ثابت ہونگی! او ربجز "کتب خانہ مفتیاں" کے اور کسی جگہ مل ہی نہیں سکتی
ہیں۔ اور اگر کوئی وہاں پہنچنے کی ہمت کرے تو بے سود۔ ! کیونکہ وہ
"عالم بالا" میں ہے جہاں اس جسم ثقیل عنصری کی رسائی ناممکن و محال۔
اور اگر بدرجہ مجبوری ان کے مصنفین ہی سے مل کر زبانی معلومات حاصل
کر لینے پر اکتفا کرنا چاہے تو وہ سب "خلد آشیاں و جنت مکاں" ہو چکے ہونگے
"کتب خانہ مفتیاں" کا وجود اگرچہ عرصے سے نہیں رہا مگر بطور "اثاث البیت"
کے تقریباً دو سو کتابیں باقی تھیں۔ ۱۸۹۵ء میں بہ زمانہ مسلم ایجوکیشنل
کانفرنس مسٹر محمود مرحوم (جسٹس محمود۔ وفات ۱۹۰۳ء بمقام سیتاپور)
نے اس میں سے کچھ کتابیں خرید کیں۔ باقی پڑی رہیں۔ نہ ان کی کوئی
فہرست تھی اور نہ تنظیم۔ تقریباً ۱۹۱۴ء میں منشی اعجاز احمد صاحب نے
ان کی فہرست مجھ سے بنوائی تھی جس کے بعد غالباً وہ بھوپال لے گئے
اور ریاست کے ہاتھ فروخت کیں۔ یا کسی مدرسہ وغیرہ کو دیدیں؟ اس کا
مجھے کچھ علم نہیں۔ ممکن ہے مفتی انتظام اللہ کے دادا کے پاس کچھ کتابیں
آبائی کتب خانے کی ہوں لیکن پچاس سال سے "گوپامئو" میں اس کا کچھ
بھی نام و نشان نہ ہے اور نہ مفتی انتظام اللہ کو ان کے دیکھنے کا اتفاق ہوا"

(خط بنام نادم سیتاپوری۔ اصل محفوظ ہے)

یہ واقعہ بقول مفتی صاحب ۱۸۳۳ء یا ۱۸۳۴ء سے تعلق رکھتا ہے اگرچہ مفتی صاحب نے "انشائے بے خبر" کے محولہ بالا دیباچے میں شریک بزم احباب کی فہرست میں علاوہ مرزا حسام الدین بیگ اور خواجہ غلام غوث بے خبر کے مہر، راجہ شیخ احمد علی شیون اور میر زین العابدین شورش کا نام بھی لیا ہے اور صرف مرزا حاتم علی بیگ مہر کے نام ہی سے یہ ساری کہانی غلط ہو جاتی ہے۔!

تذکرہ "آب بقا" میں مہر کا سنہ ولادت ۱۲۳۰ھ (چوتھی جمادی الاوّل) درج ہے اور مرزا غالب کا سنہ پیدائش ۱۲۱۲ھ ہے گویا مہر بہ اعتبار سن غالب سے اٹھارہ برس چھوٹے تھے اور جس زمانے کا یہ ذکر ہے اس دور کی تہذیب میں یہ تفاوت عمر بڑی اہمیت رکھتا تھا یہ بات کسی طرح قابل قبول نہیں ہوسکتی کہ اگر اس زمانے میں مرزا حاتم علی بیگ مہر اکبر آباد میں تھے بھی تو اس "بزم بے تکلف" میں جگہ پاسکتے؟

مرزا حاتم علی بیگ مہر لکھنؤ کے رہنے والے تھے اور آج بھی ان کے "باقیات الصالحات" اپنے آبائی مکان "کٹرہ ابوتراب خاں" (لکھنؤ) میں رہتے ہیں۔ ۱۸۴۰ء میں انھیں منصفی کی سند ملی (یعنی ۱۸۳۳ء ۱۸۴۳ء ان کا زمانہ طالب علمی ہوگا) اور چنار گڑھ[1] میں منصف مقرر کئے گئے۔ غدر ۱۸۵۷ء سے پہلے آگرے سے ان کا کوئی تعلق نہیں تھا یہ مستقلاً لکھنؤ یا بسلسلہ ملازمت و وکالت دوسرے مقامات پر رہے آگرے سے ان کا تعلق غدر ۱۸۵۷ء کے بعد اس وقت قائم ہوا جب انگریزوں کی خیر خواہی کے صلے میں جاگیر ملی! مؤلف تذکرہ "آب بقا" نے لکھا ہے۔

"۱۸۵۷ء کے غدر میں سات انگریزوں کو اپنے گھر میں چھپایا۔ اس خدمت میں مرزا سخاوت علی بیگ اور مہر کے ماموں شریک تھے۔ پھر لکھنؤ سے ان کو لیکر آگرے گئے گورنمنٹ سے اس خدمت کے صلے میں بائیس پارچہ کا خلعت معہ مالائے مروارید اور گھوڑا اور اسلحہ عطا ہوئے اور جاگیر میں دو موضع قریب فتحپور مرحمت ہوئے۔ اب اپنا قیام آگرے میں کرلیا اور وہیں ہائی کورٹ میں وکالت کرنے لگے!.... باہر سے جو لوگ اپیل کرنے آتے تھے وہ مہر کو اپنا وکیل کرتے تھے....! (صفحہ ۱۱۹۔ تذکرہ آب بقا)

مہر کے نام غالب کے کوئی فارسی خطوط ابھی تک میری نظر سے نہیں گذرے اور یہ بھی مسلمہ ہے کہ غالب کے اردو مکتوب نگاری کا دور ۱۸۵۰ء سے کچھ پہلے شروع ہوا تھا جہاں تک میں سمجھتا ہوں مہر اور غالب کے روابط کا آغاز ۱۸۵۰ء کے بعد ہی ہوا ہے۔ ۱۸۳۳ء یا ۱۸۴۳ء تک ان دونوں میں قطعاً ایسے تعلقات قائم نہیں ہوئے تھے کہ "ارباب نشاط" کی محفل میں پہلو بہ پہلو بیٹھ کر بے تکلفی کا مظاہرہ کرتے!

---

[1] چنار گڑھ ضلع مرزاپور یوپی میں ہے۔ (ناوم سیتاپوری)

(۲)

(۱)

ہم کیا کہیں کسی سے کیا ہے طریق اپنا مذہب نہیں ہے کوئی. ملّت نہیں ہے کوئی

(۲)

گلشن دہر بھی ہے کوئی سرائے ماتم شبنم اس باغ میں جب آئے تو گریاں آئے

(۳)

پھر مرتبہ بڑھایا مرا. نفیٔ غیر نے آیا ہر ایک مکان نظر لامکاں مجھے

(۴)

دو رنگیاں یہ زمانے کی جیتے جی ہیں سب کہ مُردوں کو نہ بدلتے ہوئے کفن دیکھا

(۵)

پیری میں کبھی کمی نہ ہوئی تاک جھانک کی روزن کی طرح دید کا آزار رہ گیا
وہ مرغ ہے خزاں کی صعوبت سے بے خبر آئندہ سال تک جو گرفتار رہ گیا

(صفحہ ۲۹۳ نسخہ عرشی)

ان اشعار کے بارے میں جناب مالک رام اپنے مرتبہ "دیوان غالب" صفحہ ۳۴۴ کے حاشئے پر تحریر فرماتے ہیں۔

"مندرجہ ذیل چھ اشعار نواب علاؤالدین خاں مرحوم (علائی)، والیٔ لوہارو کی بیاض سے لئے گئے ہیں اور پہلی مرتبہ شائع ہو رہے ہیں۔

مولانا عرشی نے مندرجہ بالا چھ اشعار میں سے آخری تین شعر "نسخہ عرشی" (صفحہ ۲۹۳) میں نقل فرمائے ہیں —— لیکن اس نوٹ کے ساتھ!

"یہ شعر مجھے "بیاض علائی" میں نہیں ملے جناب مالک رام صاحب کے مرتبہ "دیوان غالب" سے نقل کیے گئے ہیں بظاہر یہ خود علائی کے ہیں"

(صفحہ ۳۸۵ نسخہ عرشی)

اور محولہ بالا تین ابتدائی شعر مولانا عرشی نے اپنے مملوکہ "دیوان غالب" (مرتبہ مالک رام) میں قلمزد کرتے ہوئے لکھا ہے۔

" یہ شعر علائی کے ہیں — عرشی "

(۳)

(۱)

ایک دن مثل پتنگ کاغذی | لے کے دل سر رشتہ آزادگی
خود بخود کچھ ہم سے کنیانے لگا | اس قدر بگڑا کہ سر کھانے لگا
میں کہا۔ اے دل ہوائے دلبراں | بسکہ تیرے حق میں کھتی ہے زیاں
پیچ میں ان کے نہ آنا زینہار | یہ نہیں ہیں گے۔ کسی کے یارِ غار
گورے پنڈے پر نہ کرانکے نظر | کھینچ لیتے ہیں یہ ڈورے ڈال کر
اب تو مل جائیگی ان سے تیری سانٹھ | لیکن آخر کو پڑے گی ایسی گانٹھ
سخت مشکل ہوگا سلجھانا تجھے | ہتر ہے دل ان سے الجھانا تجھے
یہ جو محفل میں بڑھاتے ہیں تجھے | بھول مت اس پر اڑاتے ہیں تجھے
ایک دن تجھ کو اڑادیں گے کہیں | مفت میں ناحق کٹادینگے کہیں
دل نے سن کر۔ کانپ کر کھا پیچ و تاب | غوطے میں جاکر دیا کٹ کر جواب

رشتۂ در گردنم افگندہ دوست
می برد ہر جا کہ خاطر خواہ اوست

(صفحہ ۲۶۶۔ نسخہ عرشی)

(۲)

آسماں پر خودسری سے اک پتنگ | ایک دن دکھلا رہا تھا اپنا رنگ
گاہ رقصاں مثل زہرہ چرخ پر | گہ "شہاب ثاقب"[۱] آتا ہے نظر
گاہ اتراتا تھا[۲] اپنے رنگ پر | گاہ آمادہ عدو سے جنگ پر
دیکھ کر اس کی سفیہانہ ترنگ | ایک لڑکے نے کہا اے شوخ و شنگ
چار سو تیرا ہوا میں ترک و تاز | کس بھروسے پر ہے ای گردوں فراز

---

[۱] اخبار میں ثاقب سین سے یعنی ساقب" چھپا ہے معلوم نہیں یہ غلطی کس کی ہے
[۲] اخبار میں یہ بھی " اتراتھا" ہوگیا ہے۔

بالش اور کاغذ کا تیرا جسم ہے — تجھ میں مستحکم نہیں ہے کوئی شے
کیوں ہے نخوت کیوں تعلّی کیوں غرور — جب کہ ہے پا در ہوا تیرا سرور
ابر جب برسائے آب زندگی — ہو فنا تیرا حباب زندگی
قطرۂ باراں سے ہو مٹّی خراب — باد صرصر توڑ دے تیری طناب
گر ہوا اک لحظہ کنّی کاٹ جائے — پست ہو گردوں فرازی منہ کی کھائے
کچے تاگے پر عبث کرتا ہے زور — کیوں بڑھا رکھی ہے تو نے اپنی ڈور
کیوں ہے نخوت سے تو سر بر آسماں — تیری طاقت بالش کی دو تیلیاں
الغرض ایسی بہت سی پھبتیاں — کر چکا جب ناصح مشفق عیاں
بولا آخر کو یہ تنگ آ کر پتنگ — مہرباں بس تا بکے تیر و تفنگ
جیسا فرمایا کہ کم طاقت ہوں میں — واقعی کمزور و بے وقعت ہوں میں
کیا کہوں تجھ سے کہ میں کیا چیز ہوں — یا تو ہوں بے چیز یا ناچیز ہوں؟
بے حقیقت، بے لیاقت بے شعور — مجھ کو قدرت نے بنایا ہے ضرور
ناتوانوں سے بھی ہوں میں ناتواں — کاغذی ہے پوست پتلی ہڈیاں
ظاہری صورت میں گو مسرور ہوں — اختیار غیر سے مجبور ہوں
آسماں پر گو کہ میرا دور ہے — پر مرا دوّار کوئی اور ہے
گو فضا میں ہیں۔ مری جولانیاں — پر تمھاری ہیں یہ کارستانیاں

رشتۂ در گردنم افگندہ دوست
می برد[۱] ہر جا کہ خاطر خواہ اوست

"مثنوی پتنگ" کا ذکر ایک روایت کے ساتھ سب سے پہلے حالی نے "یادگار غالب" کے حاشیہ میں کیا —— اور اسے غنی کاشمیری کے اس شعر سے متعلق کرتے ہوئے ——

رشتۂ در گردنم افگندہ دوست — می کشد ہر جا۔ کہ خاطر خواہ اوست

۱؎ مولانا حالی نے یہاں "می کشد" لکھا ہے۔ (معراج)

مندرجہ ذیل روایت تحریر فرمائی ہے ۔

منشی بہاری لال مشتاق کا بیان ہے کہ لالہ کنھیا لال ایک صاحب آگرے کے رہنے والے جو مرزا صاحب کے ہمعصر تھے ایک بار دہلی میں آئے اور جب مرزا صاحب سے ملے تو اثنا ء کلام میں ان کو یاد دلایا کہ جو مثنوی آپ نے پتنگ بازی کے زمانے میں لکھی تھی وہ بھی آپ کو یاد ہے؟ انھوں نے انکار کیا۔ لالہ صاحب نے کہا کہ وہ اردو مثنوی میرے پاس موجود ہے چنانچہ انھوں نے وہ مثنوی مرزا کو لا کر دی اور وہ اس کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے اس کے آخر میں یہ فارسی شعر کسی استاد کا پتنگ کی زبان سے لاحق کر دیا تھا۔

رشتہ در گردنم افگندہ دوست
می کشد ہر جا۔ کہ خاطر خواہ اوست

لالہ صاحب کا بیان تھا مرزا صاحب کی عمر جب کہ یہ مثنوی لکھی تھی آٹھ نو برس کی تھی ۔" (یادگار غالب بحوالہ دیوان غالب مالک رام صفحہ ۸-۹)

"یادگار غالب" اس وقت میرے سامنے نہیں ہے! لیکن جناب مالک رام نے اس مثنوی کے اردو اشعار کی تعداد دس بتائی ہے۔ گیارھواں شعر وہی فارسی کا شعر ہے جو اوپر درج کیا جا چکا ہے۔ حالی کو یہ مثنوی دستیاب نہیں ہوئی اس لئے نہ انھوں نے اسے "یادگار غالب" میں درج کیا اور نہ تیس پینتیس برس ادھر تک یہ غالب کے کسی مجموعہ کلام میں شامل ہو سکی۔

سب سے پہلے جولائی ۱۹۳۱ء کے سہ ماہی "اردو" میں مرزا غالب کی ایک تضمین کے عنوان سے ایک مثنوی شائع کی گئی جس پر ایڈیٹر رسالہ "اردو" نے یہ نوٹ لکھا ہے

"صفدر مرزا پوری مرحوم نے مرزا غالب کے بچپن کی ایک تضمین مجھے بھیجی تھی جو میرے کاغذات میں پڑی رہ گئی اور اب شائع کی جاتی ہے اس ضمن میں انھوں نے ملا طاہر غنی اور حضرت زاہد کی تضمین بھی نقل کر دی ہیں۔"

مثنوی نمبر ایک (مندرجہ بالا) کو مولانا عرشی نے "نسخہ عرشی" میں نقل کیا ہے اور "رسالہ اردو" کے حوالے سے تحریر فرمایا ہے کہ ۔

"اس تمہید کے بعد صفدر مرزا پوری کی حسب ذیل عبارت تحریر کی جس سے مثنوی کی سندی حیثیت پر روشنی پڑتی ہے۔

کسی تذکرے میں کسی نے مرزا غالب کے حالات میں لکھا ہے کہ ان کو بچپن میں پتنگ اڑانے کا بہت شوق تھا۔ اکبر آباد میں ان کی پتنگ بازی کا شہرہ تھا اس زمانے میں مرزا نے پتنگ کے تلازمے میں فارسی کے اس مشہور شعر پر رشتہ در گردنم ....الخ بطور ترکیب بند چند شعر اردو میں لکھے تھے! لیکن وہ ترکیب بند کسی کے ہاتھ نہ لگا! نہ کسی نے نقل کیا ۔ !

محترمی حضرت زاہد سہارنپوری کے جد امجد مرحوم حاجی و زائر سید اکبر علی صاحب بلیغ! ابوظفر شاہ آخری تاجدار دہلی کے معتمد اور وکیل تھے اور بادشاہ کی پنشن کا مقدمہ جو کمپنی سے لڑ رہا تھا اس میں اوّل سے آخر تک وکیل شاہی کی حیثیت سے اس زمانے میں برابر اکبر آباد میں عدالت عالیہ ہونے کی وجہ سے آتے جاتے رہتے تھے! خود بھی اچھے شاعر اور ذی علم تھے! ان کی بیاض میں یہ ترکیب بند لکھا ہوا ملا جو دلدادگان کلام غالب کے لئے نعمت غیر مترقبہ ہے جسے ہمارے محترم بزرگ حضرت زاہد مدظلہٗ نے ہماری جدید تالیف "حُسنِ[1] خیال" کے لئے نقل فرما کر بھیج دیا ہے ملاحظہ ہو ......! یہ تو مرزا غالب کی بچپن کی شاعری کا نمونہ تھا۔ ملا طاہر غنی کشمیری نے بھی اسی بیت کی تضمین کی ہے۔ اور خوب کی ہے ....." میں نے یہ مثنوی قہر صاحب کی کتاب سے نقل کی ہے۔" (صفحہ ۲۷۶-۲۷۷-نسخۂ عرشی)

یہ تو ہے مندرجہ بالا پہلی مثنوی یا ترکیب بند کی تفصیل ۔! اب مثنوی نمبر دو (مندرجہ بالا) کا پس منظر بھی ملاحظہ ہو! اس کی دریافت کا سہرا بھی قاضی معراج دھولپوری مرحوم کے سر ہے! معراج مرحوم نے یکم اپریل ۱۹۶۲ء کے ہماری زبان

---

[1] "حسن خیال" مطبوعہ گیلانی الکٹرک پریس لاہور میں یہ مثنوی یا تضمین شامل کی گئی ہے لیکن اس پر سن طباعت درج نہیں ہے اس لئے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ پہلے سہ ماہی "اردو" میں شائع ہوئی یا "حسن خیال" میں۔؟ (نادم سیتاپوری)

علی گڑھ میں "مرزا غالب کی مثنوی پتنگ" کے عنوان سے ایک مضمون لکھا تھا جس میں اس مثنوی کا تعارف ان الفاظ میں کیا ہے۔

"حسن اتفاق سے یہ مثنوی مذکور آج ایک دیرینہ اخبار میں مطبوعہ نظر نواز ہوئی ہے۔ اخبار کا نام "بچوں کا اخبار"[1] ہے جو منشی محبوب عالم کی ادارت میں لاہور سے شائع ہوا کرتا تھا اور کارخانہ "پیسہ اخبار" کے خادم التعلیم سٹیم پریس لاہور میں چھپا کرتا تھا۔ مینیجر اس کے منشی عبدالعزیز تھے۔ ماہ جون ۱۹۰۶ء (نمبر ۶۲) کے اخبار صفحہ ۴۳ پر مثنوی درج ہے۔ اس میں شاعر کا نام عنوان میں یا تخلص آخر شعر میں موجود نہیں تاہم بقیاس غالب بلکہ اغلب اس کو مرزا سے منسوب کیا جانا نامناسب نہیں۔ کہ نشاندہی مولانا حالی کے عین مطابق ہے سن مذکور میں مرزا کے بعض تلامذہ راشدہ بقید حیات تھے ہو سکتا ہے کہ کسی نے اس امانت کو حوالہ اخبار کر دیا ہو۔ نیز بعید از قیاس یہ بھی نہیں کہ خود مولانا حالی کو دوران تصنیف یادگار غالب یا اس کے بعد یہ مثنوی مل گئی ہو اور انھوں نے بخیال تحفظ اس کو اخبار میں دے دیا ہو۔ مثنوی چونکہ بچپن کے عہد میں کہی ہوئی ایک نظم تھی جس میں خیالات کے ساتھ ساتھ زبان بھی اس معیار کی استعمال کی گئی تھی نیز موضوع سے بھی بچوں کے مذاق کو خصوصی مناسبت تھی لہٰذا "بچوں کے اخبار" میں اس کا چھپوا دینا قرین مصلحت سمجھا گیا بہر حال وثوق کے ساتھ یقین یہ ہوتا ہے کہ یہ وہی مثنوی ہے اور یہاں بعنوان "پتنگ" شائع کی گئی ہے۔"

(صفحہ ۶۔ ہماری زبان علیگڈھ یکم اپریل ۱۹۶۲ء)

یہ دونوں مثنویاں حالی کی اس نشان دہی پر غالب کا نتیجہ فکر قرار دی گئی ہیں کر ان دونوں میں فارسی کا وہ شعر موجود ہے جسے حالی نے "یادگار غالب" میں نقل کیا ہے

---

[1] "بچوں کا اخبار" منشی محبوب عالم کی ادارت میں ۱۹۰۲ میں لاہور سے جاری ہوا تھا۔ اس میں بعض عنوان مستقل ہوا کرتے تھے۔ اس سے قبل منشی محبوب عالم مرحوم کے کئی اخبار۔ پیسہ اخبار لاہور اور انتخاب لاجواب وغیرہ) ہندوستانی صحافت میں قبول عام حاصل کر چکے ہیں۔

ان دونوں مثنویات میں سوائے اس فارسی شعر کے کوئی ایک مصرعہ بھی مشترک نہیں ہے
صفدر مرزا پوری کی پیش کردہ مثنوی (نمبر ۱ مندرجہ بالا) میں دس اشعار ہیں اور قاضی معراج
مرحوم کی دریافت کردہ مثنوی (نمبر ۲ مندرجہ بالا) میں اکیس اشعار ہیں! اس مثنوی میں
اس فارسی شعر کے علاوہ اُردو کے کتنے اشعار تھے؟ اس کا پتہ نہ حالی کی روایت سے
چلتا ہے نہ اور کسی ذریعہ سے؟

جہاں تک قاضی معراج مرحوم کی دریافت کردہ مثنوی کا تعلق ہے ان کے یہ
فرمانے کے بعد ـــــ

"اخبار صفحہ ۳۴ پر یہ مثنوی درج ہے اس میں شاعر کا نام عنوان میں
یا تخلص آخر شعر میں موجود نہیں تاہم بقیاس غالب بلکہ اغلب اس
کو مرزا سے منسوب کیا جانا نامناسب نہیں۔"

یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ "یادگار غالب" کی روایت اور اس فارسی شعر کو
بنیاد بنا کر محض اپنے "وجدان" کی بنا پر کلامِ غالب سمجھ لیا جائے! معیار کلام اور
زبان کی بات بھی اس سلسلہ میں کچھ زیادہ وزن نہیں رکھتی! کیونکہ نو سال کے بچے
کی موزونی طبع کا نہ کوئی معیار مقرر کیا جا سکتا ہے اور نہ رنگ!

اور اسی اعتبار سے "بچوں کا اخبار لاہور" کے جن اشعار کو قاضی معراج مرحوم
نے غالب کی وہ مثنوی پتنگ قرار دے دیا ہے جس کا تذکرہ حالی نے "یادگار غالب" میں
کیا ہے ـ! ایک بے اصل سی بات ہے۔ خصوصاً ان حالات میں جبکہ ان اشعار کے
ساتھ اس اخبار میں غالب کا کہیں نام بھی نہیں آیا ہے!

پھر ـ جون ۱۹۰۷ء میں یہ اشعار "بچوں کا اخبار" میں چھپے تھے اور اس کے
بعد دو چار نہیں دیوان غالب کے درجنوں ایڈیشن جدید اضافوں کے ساتھ شائع ہوئے مگر کسی
نے اسے غالب کی "مثنوی پتنگ" سمجھ کر اس کا اضافہ نہیں کیا؟ غور طلب ضرور ہے؟

اسی طرح پہلی مثنوی یا ترکیب بند جسے صفدر مرزا پوری مرحوم نے حاجی سید اکبر علی
بلیغ کی کسی قلمی بیاض سے اس لئے حاصل کیا تھا۔ کہ اسے اپنی کتاب "حسن خیال" میں
جگہ دیتے! لیکن اس کتاب میں جگہ دینے کے بجائے انھوں نے اسے رسالہ "اردو" میں

اشاعت کے لئے بھیج دیا اور وہاں ایڈیٹر کے کاغذات میں (نجانے کبتک) پڑی رہی؛ اور جولائی ۱۹۳۱ء میں پہلی بار شائع کی گئی۔

صفدر مرزا پوری بحیثیت "جامع" خواہ کتنی ہی اہمیت کیوں نہ رکھتے ہوں ان کی تالیفات کو تحقیقی درجہ بہرحال نہیں دیا جاسکتا؛ "مشاطِ سخن" ہو یا "حسنِ خیال" ان کی یہ دونوں کتابیں ایک مخصوص دور کی سطحی ترجمانی ضرور کرتی ہیں تحقیق سے انھیں دور کا لگاؤ نہیں ہے؛ اس کے علاوہ یہ تسلیم کرنے کے باوجود کہ سید اکبر علی بلیغ اسی دور کے آدمی تھے جب تک کہ ان کی قلمی بیاض کے بارے میں ضروری تفصیلات سامنے نہ ہوں؛ اس کے اندراجات پر کوئی فیصلہ کن رائے قائم کرنا دشوار ہے۔

سید اکبر علی بلیغ کی اس بیاض میں اس دور کے کن شعراء کا کلام ہے؟ اور آیا اس مثنوی یا ترکیب بند کے علاوہ اس میں غالب کا کوئی اور کلام بھی موجود ہے یا نہیں؟ یہ تمام باتیں ایسی ہیں جنھیں سامنے رکھے بغیر صرف حالی کی روایت کا سہارا دے کر ان اشعار کو غالب سے منسوب کردینا بے احتیاطی سے خالی نہیں؛ ان دو مثنویوں کے آخری (فارسی) شعر کے پیش نظر یہ قیاس کیا جاسکتا ہے کہ غالباً ایک زمانے میں فارسی کے اس شعر کو بنیاد بنا کر غالب کے علاوہ دوسرے افراد نے بھی "پتنگ" کے موضوع پر مثنویاں یا ترکیب بند کہے تھے اور ہوسکتا ہے کہ یہ دونوں مثنویاں اس سلسلے کی کڑی ہوں! جن کا مصنف غالب کو صرف اس لئے سمجھا گیا کہ ان کے آخر میں بھی فارسی کا وہی شعر موجود ہے جسے حالی نے نقل کیا ہے۔

(۴)

کب رہا ہے اب ہمیں حور و بشر کا امتیاز ... دیکھ کر جاتا رہا تجھ کو۔ نظر کا امتیاز

اس کا کوچہ چھوڑ کر[1] کے جاوے ہے گلشن کی طرف ... ہوگیا معلوم بس باد سحر کا امتیاز

نازکی جس نے رگ گل کی نہ دیکھی ہو کبھی ... ہو میاں "کیونکر اسے تیری کمر کا امتیاز

---

[1] قاضی معراج دھول پوری لکھتے ہیں۔
"چمن بے نظیر" میں "کے" زائد چھپ گیا ہے۔ مجمع الاشعار میں مصرع یوں ہے۔
"اس کا کوچہ چھوڑ کر جاوے ہے گلشن کی طرف" (نادم سیتاپوری)

ہے یہ سودائے محبت ہی کہ یاں انسان کو — کچھ نہیں رہتا یہاں نفع و ضرر کا امتیاز
جب نشست اغیار کے پہلو میں ٹھہری یار کی — تب ہمارا رہ گیا پھر واں کدھر کا امتیاز
اہل ہمت پوچھتے ہیں خاک جب اکسیر کو — ان کو کب ہوتا ہے صرف سیم و زر کا امتیاز

آگے اپنے یار کے غالب ہمیں معیوب ہیں
ورنہ ہے کس کے اسے عیب و ہنر کا امتیاز

سات شعر کی یہ غزل "چمن بے نظیر" مطبوعہ بمبئی ۱۲۶۴ھ میں "بحیات غالب" چھپی تھی اس کا ذکر ڈاکٹر گارساں دتاسی نے اپنے خطبہ ۴ دسمبر ۱۸۵۴ء میں بھی کیا ہے اس کے مرتب محمد ابراہیم بن شہاب الدین موسیٰ تھے جنھیں ڈاکٹر گارساں نے "انوار سہیلی" کا مترجم کہا ہے۔ یہ ترجمہ دکنی زبان میں کیا گیا تھا اور ۱۸۲۴ء میں مدراس میں چھپا تھا۔

"چمن بے نظیر" کا دوسرا ایڈیشن (لفظ بلفظ) ۱۳۰۴ھ میں مطبع صفدری بمبئی نے شائع کیا تھا۔ جس میں حکیم مومن خاں مومن کے نام کے ساتھ بدستور "سلمہ اللہ تعالیٰ" لکھا ہوا ہے جو اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ ایڈیشن پہلے ایڈیشن کی لفظ بلفظ نقل ہے "چمن بے نظیر" کے بہت سے ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ قاضی معراج دھولپوری مرحوم لکھتے ہیں کہ ـــــ

"بمبئی کے بعد نولکشور پریس لکھنؤ اور مجیدی پریس کانپور نے بھی اس کو شائع کیا ہے اب تک کئی ایڈیشن نکل چکے ہیں ..... مطبع جوالا پرکاش میرٹھ ۱۳۰۸ھ مطابق ۱۸۹۱ء۔ نولکشور پریس ۱۸۸۶ء عیسوی اور مجیدی پریس ۱۳۳۲ھ پیش نظر ہیں۔" (ہماری زبان علیگڈھ یکم اگست ۱۹۶۱ء)

میں نے سب سے پہلے اس غزل کو مطبع صفدری بمبئی کے ایڈیشن ۱۳۰۴ھ میں دیکھا تو جناب مالک رام سے رجوع کیا۔ جناب مالک رام نے لکھا کہ الحاقی کلام ہے غالب کی غزل نہیں ہے۔! جناب مالک رام کا مکتوب گرامی درج ذیل ہے۔!

۳۰/۸/۱۹۵۷ء

مکرم بندہ ۔۔۔ ۸/۲۵ کے گرامی نامہ کا شکریہ

جب آپ کا پہلا خط بمبئی سے ملا ہے تو آپ نے جو مصرعہ لکھا تھا

کب رہا ہے اب ہمیں حور و بشر کا امتیاز

اسے پڑھتے ہی مجھے خیال گذرا کہ یہ میرا دیکھا ہوا ہے لیکن باوجود حافظے پر زور دینے کے یاد نہ آیا کہ کہاں دیکھا ہے۔ چنانچہ میں نے آپ سے درخواست کی کہ پوری غزل عنایت کیجئے! لکھنے کے دو چار دن بعد پھر آپ کا خط سامنے آیا تو دوبارہ وہی الجھن پیدا ہوئی کہ یہ غزل کہاں دیکھی ہے؟ خیر اب پتہ چل گیا۔ یہ غزل ۱۹۴۹ء میں آرزو (ڈاکٹر مختار الدین) نے علیگڈھ میگزین کے "غالب نمبر" میں چھاپی تھی اور میں نے اسی زمانے میں انھیں لکھا تھا کہ یہ کلام غالب کا نہیں ہو سکتا؟ اور اسے غالب نمبر میں شامل کر کے انھوں نے غلطی کی ہے وہ میرے دلائل معلوم کئے بغیر مجھ سے متفق ہو گئے اس کے بعد چمن بے نظیر" بھی میری نظر سے گذرا ۔۔۔ اور بھی بعض پرانے مجموعے دیکھنے میں آئے جن میں کچھ کلام غالب کے نام سے درج ہے۔ "یہ سب کلام الحاقی ہے" کلام کا رنگ اور اس کی کمزوری خود کہے دیتی ہے کہ یہ غالب سے منسوب نہیں کیا جاتا! لیکن اور سب باتوں کو چھوڑ کر تیسرے شعر کے مصرع ثانی میں "میاں" کی موجودگی سے آپ کیا نتیجہ اخذ کریں گے؟ یہ غالب کا کلام نہیں! شاید آپ کو معلوم ہو کہ اس تخلص کے اور بزرگوار بھی گزرے ہیں ... !

امید ہے مزاج گرامی بہر نوع بخیر ہوگا۔ والسلام والاکرام

خاکسار ۔۔۔ مالک رام

(۵)

(۱)

شاہا تجھے با دولت و بخت فیروز
فرخ ہو صد جہاں میں جشن نوروز
ہووے شرف اندوز ترے طالع سے
ہر سال حمل میں مہر عالم افروز

(۲)

عید آئی ہے دل اہل زمانہ شاد ہے — عیش سے وابستہ ہے غم سے ہراک آزاد ہے
عشرت و عیش و طرب چھائے ہوئے ہیں جابجا — ہر طرف اک جشن ہے ہر سو مبارکباد ہے

(۳)

گلشن دہر میں بسنت آئی — خوب گلدستۂ خوشی لائی
گوش گل سوئے دیدۂ بلبل — دیدۂ گل رخاں تماشائی

یہ رباعی اور قطعات ایک قدیم رسالہ "عیدی نامہ" میں شائع ہوئے تھے جن کے متعلق یہ قیاس ظاہر کیا گیا ہے کہ ان کی اشاعت غالب کی زندگی ہی میں ہوئی تھی اور وہ بھی دلی ہی میں۔!

لیکن جناب نثار احمد فاروقی کا خیال ہے کہ دوسرے اور تیسرے قطعہ سے غالب کے طرز سخن گوئی کی بو نہیں آتی —

جناب نثار احمد فاروقی اپنے مضمون (کچھ غالب کے بارے میں) مطبوعہ ہفت روزہ "ہماری زبان" علیگڈھ۔ ۱۵ مارچ ۱۹۶۲ء میں تحریر فرماتے ہیں۔

"مطبع محمدی محمد مرزا خاں واقع دہلی" کے ایک چھوٹا سا رسالہ "عیدی نامہ" طبع ہوا تھا جس کے سرورق پر لکھا ہے۔

".... بساتھ مدد عنایت بے غایت حضرت واہب العطیات کے یہ رسالہ موسومہ بہ عیدی نامہ حسب فرمائش مولانا قمر الدین صاحب تاجر کتب دہلی کے بمطبع محمدی محمد مرزا خاں واقع دہلی باہتمام عبدالرزاق طبع شد"

اس کے صفحات کی تعداد ۲۴ ہے ابتدا یہ ہے:۔

ادا کر کے ثنائے حمد باری — کہوں پھر نعت باصد انکساری

آخر میں تاریخ طبع زاد جے چند المتخلص بہ عاصی درج ہے، خاتمہ میں طبع محمدی۔ محمد مرزا خاں واقع دہلی کوچہ چیلہ "حدود چھاؤنی" لکھا ہے۔ اس مختصر رسالے میں بچوں کیلئے عیدیاں جمع کردی ہیں۔ ان میں اردو فارسی کے اشعار قطعات اور رباعیات ہیں۔ اس کے جامع کا نام عباس معلوم ہوتا ہے۔ جامع نے سبب تالیف کتاب بھی نظم میں لکھا ہے:۔

مدح کے بعد اے عباؔس احقر — سبب ترتیب تحفہ کہہ سراسر
کیا اک روز دل سے (کذا) مجکو تلقین — کہ عیدی ہائے استاداں بہ پیشیں
ہیں اک عرصہ سے متفرق جہاں میں (کذا) — مثل گل شگفتہ بوستاں میں
جوان کا ایک گلدستہ بناوے — تو باغ دہر میں گلچیں کہاوے

جامع بہت ہی معمولی مبلغ علم کا آدمی معلوم ہوتا ہے۔ اس رسالہ میں جو اشعار اس کے طبع زاد ہیں ان میں بعض تو صنعت اہمال میں سہل ممتنع ہیں، بعض اوزان و بحور کے علائق سے بھی آزاد ہیں۔ بہرحال عباس نے بہت سے اساتذہ فارسی و اُردو کے وہ اشعار جو تہواروں کی مناسبت سے کہے گئے تھے جمع کئے ہیں اور ان میں بغیر کسی نظم و ترتیب کے جمع کر دیا ہے۔

یہ تحفہ جب کہ میرے ہاتھ آیا — تو باغ دہر میں ہمسر نہ پایا
پھر ان کا ایک گلدستہ بنا کے — دکھایا لالہ "بچھومل" کو جا کے
نظارہ کر کے وہ گلہائے تر کے — ہوئے بانی مبانی اس امر کے (کذا)
میاں عباس یہ تحفہ ہے نادر — بذریعہ چھاپہ اس کو تو عیاں کر (کذا)

پھر اس میں رمضان، عید، بقرعید، آخری چہار شنبہ، شب برات، نوروز، دسہرہ سلونو، دیوالی، بسنت، ہولی، پر قطعات ہیں جن میں بعض جامع رسالہ کے زائیدہ فکر بھی ہیں۔ صفحہ ۱۹ پر تمت کے بعد "اشعار متفرق"، کے زیر عنوان غالب کے قطعات و رباعیات نقل ہوئی ہیں۔ مثلاً "سامان خور و خواب کہاں سے لاؤں" الخ یا

؎ بعد از تمام بزم عید الاطفال — ایام جوانی رہے ساغر کش حال
آپہنچے ہیں ماسوا و اقلیم عدم — اے عمر گزشتہ یک قدم استقبال

یہ رباعی نسخۂ عرشی میں بھوپال والے نسخہ کے حوالے سے نقل ہوئی ہے تیسرا قطعہ وہ ہے جس کا آخری مصرعہ ہے۔

روزہ اگر نہ کھاوے تو ناچار کیا کرے

چوتھا قطعہ جس کا پہلا شعر ہے:۔

ہے چہار شنبہ آخر ماہ صفر چلو — رکھ دیں چمن میں بھر کے مئے مشکبو کی ناند

یہ بھی دیوان غالب نسخہ عرشی میں (ص ۱۲۸) موجود ہے۔

پانچویں رباعی ہے: "آتشبازی ہے جیسے شغل اطفال"، یہ نسخہ عرشی میں (ص ۲۵۳) پر ملتی ہے۔

البتہ چھٹی رباعی دیوان غالب نسخہ عرشی میں نہیں ہے۔ اس کے عنوان میں لکھا ہے: "رباعیات در مدح تعلق نوروز"،

شاہا تجھے با دولت و بخت فیروز
فرخ ہو سدا جہاں میں جشن نوروز
ہووے شرف اندوز ترے طالع سے
ہر سال حمل میں مہر عالم افروز

اس کے بعد اسی مجموعے میں یہ دو قطعات بھی ہیں جو اگرچہ کلام غالبؔ کے ذیل میں نقل ہوئے ہیں اور ان کے عنوان میں "مرزا نوشہ" لکھا ہوا ہے، مگر میرا وجدان کہتا ہے کہ یہ مرزا غالبؔ کے طبع زاد نہیں ہوسکتے۔

عید آئی ہے دل اہل زمانہ شاد ہے — عیش سے وابستہ ہے غم سے ہر اک آزاد ہے
عشرت و عیش و طرب چھائے ہوئے ہیں جابجا — ہر طرف اک جشن ہے ہر سو مبارکباد ہے

دوسرا قطعہ بسنت سے متعلق ہے:۔

گلشن دہر میں بسنت آئی — خوب گلدستہ خوشی لائی
گوش گل سوے دیدۂ بلبل — دیدۂ گلرخاں تماشائی

اس کا سال انطباع چند عاصی نے خدا جانے کون سی صنعت سے برآمد کیا ہے۔ قطعہ تاریخ ساقط الوزن ہے اور اس کا آخری شعر یہ ہے۔

اس عرصہ میں پکارا ہاتف غیبی معطر ہو — سبحان اللہ ہوئے فارغ کئی تازہ گل دریں

لاکھ سر مارا مگر کوئی تاریخ برآمد نہ ہوئی۔ میرا قیاس یہ ہے کہ رسالہ مذکور غالبؔ کی زندگی میں چھپا ہے اور نوروز والی رباعی جو اوپر نقل ہوئی غالبؔ کی ہے جو کسی دوسرے مجموعے میں نہیں ملتی

---

(۶) اٹھا اک دن بگولا سا جو کچھ میں جوش وحشت میں — پھرا آسیمہ سر گھبرا گیا تھا دل بیاباں سے

نظر آیا مجھے اک طائر مجروح پر بستہ
ٹپکتا تھا سر شوریدہ دیوارِ گلستاں سے

کہا میں نے کہ۔ ؟ او ناکام۔ آخر ماجرا کیا ہے
پڑا ہے کام تجھ کو کس ستمگر آفت جاں سے

ہنسا کچھ کھلکھلا کر پہلے۔ پھر مجھ کو جو پہچانا
تو یوں رویا کہ جوئے خون بھی پلکوں کے داماں سے

کہا؛ میں صید ہوں اس کا کہ جسکے دام گیسو میں
پھنسا کرتے ہیں طائر روز آ کر باغ رضواں سے

اسی کی زلف و رخ کا دھیان ہے شام و سحر مجکو
نہ مطلب کفر سے؛ اور نہ ہے کچھ کام ایماں سے

بچشم غور جو دیکھا۔ مرا ہی "طائر دل" تھا
کہ جل کر ہو گیا یوں خاک اپنی آہ سوزاں سے

ایک اہل درد نے سنساں جو دیکھا قفس
یوں کہا آتی نہیں کیوں اب صدائے عندلیب

بال و پر دو چار دکھلا کر کہا صیاد نے
یہ نشانی رہ گئی ہے اب بجائے عندلیب

(صفحہ ۲۶۱ - ۲۶۲ ۔ نسخہ عرشی)

پہلا قطعہ "طائر دل" کے عنوان سے سب سے پہلے ماہنامہ مخزن لاہور بابتہ اپریل ۱۹۰۷ء میں ایک تمہیدی عبارت کے ساتھ شائع ہوا تھا جسے اس کے بعد ہی سب سے پہلے ہفت روزہ "فتنہ و عطر فتنہ" گورکھپور نے اپنی اشاعت یکم مئی ۱۹۰۷ء میں نقل کیا اور اس قطعہ کو مشکوک قرار دیتے ہوئے لکھا۔

"مخزن (لاہور) میں یہ نظم حضرت غالبؔ کے نام سے چھپی ہے۔ مگر ہم ان میں غالبؔ مرحوم کا رنگ نہیں پاتے۔

(ہفت روزہ فتنہ و عطر فتنہ گورکھپور یکم مئی ۱۹۰۷ء) جلد ۲۲ شمارہ ۱۸

مولانا عرشی نے "مخزن" کی تمہیدی عبارت کے ساتھ قطعہ اوّل اور قطعہ دوم کی تفصیلات بھی "نسخہ عرشی" میں درج کی ہیں فرماتے ہیں۔ !

سب سے پہلے یہ قطعہ رسالہ مخزن (لاہور) کے شمارہ اپریل ۱۹۰۷ء میں اس تمہید کے ساتھ شائع ہوا تھا ——

"تھوڑے دن ہوئے میجر سید حسن صاحب بلگرامی سے تذکرہ شعراء ہو رہا

تھا جس میں انھوں نے غالب کا ایک قطعہ سنایا۔ قطعے کے عمدہ ہونے میں کیا شک ہے؟ مگر اس کے ساتھ ہی ان کے اس بیان نے کہ یہ قطعہ ان کے والد مرحوم سے ان کو پہنچا۔ اور اب تک غالب کے کسی کلام میں شائع نہیں ہوا اس کی خوبی زیادہ کردی ۔۔ میں نے ان سے لکھ لیا اور ان کی اجازت سے "مخزن" کو بھیجتا ہوں۔

شیدا ۔ از کیمرج

مولانا بدایونی مرحوم نے اپنی شرح (ص) ۲۴۸ میں اس قطعہ اور قطعہ نمبر ۳ کے متعلق لکھا ہے۔

"سب سے پہلے ان قطعات کا اضافہ کیا طبع سوم میں اس ریمارک کے ساتھ ہوا تھا کہ بعض نقادان سخن ان قطعات کے طرز بیان کو حضرت غالب کے رنگ سے جداگانہ سمجھتے ہیں۔ اس پر طبع سوم کے ناظرین میں سے بعض اہل الرائے حضرات نے شکایت کی کہ ان قطعات کو دیوان غالب میں جگہ دینا غالب کے کلام کی توہین کرنا ہے۔ ہم نے نواب عماد الملک (میجر سید حسن بلگرامی کے بھائی) سے ان کے متعلق دریافت کیا۔ وہ فرمانے لگے کہ وہ یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ یہ غالب کے مصنفہ ہیں۔ انھوں نے اپنے ایک بزرگ سے سنے تھے جو ان کو غالب سے منسوب کرتے تھے ۔ ممکن ہے کہ یہ غالب کا ابتدائی کلام ہو"۔ (صفحہ ۲۷۱-۲۷۲-نسخۂ عرشی)

(۷) ————————

پوروہ "فرزند احمد" کو ملا
رحمت باری کا جو گنجینہ ہے
سال تاریخ ولادت یوں لکھا
راحت جاں ہے سرور سینہ ہے
۱۲۸۴ھ

(صفحہ ۲۶۵ نسخۂ عرشی)

مولانا عرشی نے اس قطعہ کی شان نزول یہ بیان فرمائی ہے۔

"یہ قطعہ ڈاکٹر مختار الدین احمد آرزو استاد شعبہ عربی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

نے اس یادداشت کے ساتھ عطا کیا ہے۔۔۔!

"چودھری عبدالغفور سرور نے غالب کی خدمت میں اصلاح کے لئے قصیدہ تابہ (کاوش اہل وطن سے ہے یہ جی کی حالت) اور صغیر بلگرامی (فرزند احمد) کے صاحبزادے کی ولادت (۱۸۶۶ء سے ۱۲۸۳ھ) کے آٹھ قطعات تاریخ اردو، فارسی میں لکھ کر بھیجے تھے۔ غالب نے اصلاح کے بعد اسی کاغذ پر یہ رقعہ لکھ دیا ہے اور ایک قطعہ کہکر درج کیا ہے۔ یہ قطعہ بخط غالب ہے۔ سرور کے کلام کے اصلاح نہیں ہے بلکہ ایک نیا قطعہ ہے جو غالب نے سپرد قلم کیا ہے۔ دیکھ لیجئے گا کہ مصرعہ آخر سے کیا اعداد برآمد ہوتے ہیں۔" مختارالدین احمد

(صفحہ ۳۷۵۔ نسخۂ عرشی)

جناب مالک رام نے اپنے مضمون "دیوان غالب نسخۂ عرشی" میں اس قطعہ کے متعلق لکھا۔۔۔!

"یادگار نالہ (مشمولہ نسخۂ عرشی) ص ۳۶۵۔ قطعہ (۱۲) ..... ! یہ قطعہ چودھری عبدالغفور سرور نے سید فرزند احمد بلگرامی کے صاحبزادے نور احمد (گرامی) کی ولادت پر لکھا تھا اور ان کے کچھ دوسرے کلام کے ساتھ اس کا عکس بھی ماہنامہ آجکل (دہلی) کی فروری ۱۹۵۵ء کی اشاعت میں چھپا تھا۔ عرشی صاحب نے اسے ڈاکٹر مختارالدین احمد کی سند سے کلام غالب قرار دیا ہے اور لکھا ہے جناب ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں یہ قطعہ بخط غالب ہے۔ (ص ۳۷۵) ڈاکٹر صاحب موصوف (مختارالدین آرزو) کو غلط فہمی ہوئی۔ یہ بھی سرور ہی کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے اور سرور ہی کا کلام ہے نہ کہ غالب کا!" (صفحہ ۱۴۸۔ سہ ماہی فکر و نظر علیگڈھ جنوری ۱۹۶۱ء)

(۸)

رفو سے زخم میں حاجت ہوا گھلنا مرے تن کا
پہنچتے ہی مرے غل ہو شکست رنگ دشمن کا

سمجھتا ہے مجھے جراح آنسو چشم سوزن کا
بنا دے گردش قسمت مجھے ......

وہ میکش ہوں کہ اک نیائے بادۂ بے مرا قامت شبیہ موج سے ہے جو شکن ہے میرے دامن کا
دیا ہوگا ترے خنجر کو میری ناتوانی سے کہ ہر تار گریباں پر گماں ہے میری گردن کا
کھٹک جائے جو آنکھوں میں اس کو میری شب غم کے
..... خورشید لے آکر سپیدہ صبح روشن کا

جناب نثار احمد فاروقی اپنے مضمون "کچھ غالب کے بارے میں" تحریر فرماتے ہیں۔!

"مجھے دیوان غالب اردو کا ایک مطبوعہ نسخہ ملا جو دسمبر ۱۸۸۳ء عیسوی (مطابق صفر ۱۳۰۱ھ) میں منشی نولکشور کے مطبع سے چھپا تھا۔ یہ صفحہ ۱۰۲ پر تمام ہو جاتا ہے اس میں کسی شخص نے یہ اہتمام کیا ہے کہ غالب کے جو اشعار متداول دیوان میں نہیں ہیں وہ حاشیئے پر نقل کر دیئے ہیں۔ مگر کہاں سے نقل کئے؟ اس کا حوالہ نہیں دیا مثلاً آخری سادہ صفحہ پر وہ قصیدہ نقل ہوا ہے جو غالب نے شیو نارائن آرام کو لکھ کر بھیجا تھا"

ملاذ کشور و لشکر پناہ شہر و سپاہ
جناب عالی ایلن برول والا جاہ

اس کے آخر میں لکھا ہے "اصل قصیدہ تصنیف غالب است از نام شیو نرائن اولاد حسن ۲۳ مارچ ۱۸۸۶ء" لیکن ظاہر ہے کہ یہ "اردوئے معلیٰ" سے نقل ہوا ہوگا۔!

"اسی طرح کچھ اور غزلیں اور اشعار ہیں جو اب دیوان غالب نسخہ عرشی" میں آگئے ہیں اس لئے ان کا تذکرہ یا تفصیلی بیان غیر ضروری ہے لیکن صفحہ ۱۰۰ پر ایک غزل نقل ہوئی ہے جس میں چھ شعر ہیں اس کا پانچواں شعر آبدگی کے باعث غیر ضروری ہے۔ بعض الفاظ بھی مشکوک ہیں چونکہ ناقل نے حواشی میں غالب کا کلام نقل کرنے کا التزام کیا ہے اس لئے یہ غزل بھی (جس کے مقطع میں تخلص اسد آیا ہے) اس لئے غالب ہی کی سمجھ کر نقل کی گئی یہ نسخہ عرشی" میں بھی نہیں ہے۔ "قطعیت" کے ساتھ نہیں کہا جاسکتا کہ غالب کی نظیدہ فکر ہے تا وقتیکہ قدیم تر سند نہ ملے ..... مگر مجھے یہ

غالب کا رنگ سخن نہیں اس کی "پیروڈی" معلوم ہوتی ہے۔"
(صفحہ ۳۷ - ماہنامہ نیا دور لکھنؤ ستمبر ۱۹۶۰ء)

(۹)

نہ بوسہ دے مجھے میرا دل خراب تو دے
دل خراب بھی رہنے دے کچھ جواب تو دے

ہزار بوسے مرے تجھ پر ہیں زرِ حساب
تو ایک بوسہ مجھے اور علی الحساب تو دے

ادھر میں گور میں چپ ہوں غم جدائی سے
ادھر کہے ہے فرشتہ! مجھے حساب تو دے

پلادے اوک سے ساقی جو تجکو نفرت[1] ہے
پیالہ گر نہیں دیتا نہ دے شراب تو دے

پھر اس کا دور رہے اور پاؤں میں نہیں طاقت
فلک زمیں کی ذرا کھینچ تو طناب تو دے

اسد خوشی سے مرے ہاتھ پاؤں پھول گئے
جو اس[2] نے ہنس کے کہا میرے پاؤں داب تو دے

قاضی معراج دھولپوری مرحوم نے اپنے مضمون "تبرکات غالب" (خط ۲ مطبوعہ ہماری زبان علی گڑھ - ۸ اگست ۱۹۶۱ء) میں اس غزل کے متعلق تحریر فرمایا ہے۔

"مرزا نے ایک خط محررہ ۲۷ جولائی ۱۸۶۴ عیسوی میں علاؤ الدین احمد خاں کو لکھا تھا کہ ـــ

"پچاس برس کی بات ہے کہ الٰہی بخش معروف نے ایک زمین نئی نکالی تھی[3] ـــ میں نے حسب الحکم غزل لکھی بیت الغزل یہ ــ

پلادے اوک سے ساقی جو ہم سے نفرت ہے
پیالہ گر نہیں دیتا۔ نہ دے! شراب تو دے

---

[1] پہلے مصرعہ کا آخری ٹکڑا النسخہ "مروجہ وحمیدیہ" میں "جو ہم سے نفرت ہے" درج ہے اور یہی صحیح ہے کہ منقولہ بالا خط سے ظاہر ہوتا ہے۔

[2] "جو اس نے ہنس کے کہا" کے بجائے "کہا جو اس نے ذرا" پیش نظر دواوین میں درج ہے جو بہ لحاظ مکتوب محولہ صحیح ہے۔

[3] گویا اس زمین کی غزل ۱۸۱۴ء کے لگ بھگ کی ہے اس وقت غالب کی عمر کچھ اوپر ستر سال کی ہوگی۔ غزل کا مقطع بھی اس عمر کی غمازی کر رہا ہے۔ (معراج)

مقطع یہ ہے ؎

اسد خوشی سے مرے ہاتھ پاؤں پھول گئے
کہا جو اس نے ذرا میرے پاؤں داب تو دے

اب میں یہ دیکھتا ہوں کہ مطلع اور چار شعر کس نے لکھ کر اس مقطع اور اس بیت الغزل کو شامل ان اشعار کے کر کے غزل بنائی اور اس کو لوگ گاتے پھرتے ہیں مقطع اور ایک شعر میرا۔" اور پانچ شعر کسی الّو کے۔" (اردوئے معلی مجتبائی حصہ اوّل ص ۳۶۸)

چنانچہ اس زمین میں حسب ذیل چھ شعر "باغ مہر" میں موجود ہیں (یہ اشعار اوپر درج کئے جا چکے ہیں۔)

" اب نہیں کہا جا سکتا کہ اوپر بتائے ہوئے دو شعروں کے ساتھ جو شعر منقول ہوئے وہ غالب کے ہیں یا بالفاظ غالب "کسی اُلّو کے"۔ مگر ناممکن یہ بھی نہیں کہ مرزا نے ان کو موزوں کیا ہو اور پھر باقتضائے طبیعت" نظری کر دیا ہو کہ ان سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ غالب کے مشار الیہ اشعار یہی ہیں"
(ہماری زبان علیگڈھ ۸ اگست ۱۹۶۱ء)

قاضی معراج مرحوم نے یہی چھ شعر جہاں تک مجھے علم ہے "تبرکات غالب" ہی کے عنوان سے سب سے پہلے ماہنامہ "غالب" بمبئی (ماہ جنوری ۱۹۵۰) میں چھپوائے تھے اور ایڈیٹر "غالب" کو اپنے خط میں تحریر فرمایا تھا۔

" اس سے قبل آپ کے نوازش نامہ کے جواب میں ایک کارڈ ارسال کر چکا ہوں ۔ آج "غالب" کی قلمی معاونت پر متضمن آپ کی فرمائش کی تعمیل میں ذریعہ ہذا مرزا غالب کی ایک غزل روانہ کر رہا ہوں ــــ یہ غزل میرے کتبخانے کے ایک قلمی نسخے سے منقول ہے جس پر اختتام کتابت کی تاریخ ساتویں ماہ صفر المظفر ۱۲۷۸ھ ہجری نبوی صلعم مطابق پندرھویں ماہ اگست ۱۸۶۱ء روز پنجشنبہ مرقوم ہے گویا غالب کی وفات سے آٹھ سال قبل اس کا معرض تحریر میں آجانا ظاہر ہوتا ہے۔ نسخے کا رسم الخط قدیم ہے نیز اس کے سیر حاصل و مبسوط

ہونے سے مدوّن کی محنت شاقہ اور ذوق انتخاب کا پورا پورا اندازہ ہوتا ہے یہ نسخہ ۵۸۷ صفحات پر مشتمل ہے اور حاشیہ پر بھی اندراج ..... نظر صفحے سے کچھ کم نہیں ہے بلحاظ تاریخ یہ قلمی نسخہ حمیدیہ (کے) بعد کا ہے۔

میرے پاس معرّا و مشرّح دیوان غالبؔ کے کئی نسخے جداگانہ مطبعوں کے موجود ہیں جن میں صرف پانچ شعر اس طرح پر درج ہیں منجملہ ان کے ۔ !

پلادے اُوک سے ..... !

والا ایک شعر اور زیر نظر غزل کا مقطع بھی ہے گویا مروجہ نسخوں میں غزل مندرجہ ذیل کے ماسوا صرف تین شعر اور ہیں یہ سب ملا کر نو ہوئے ممکن ہے مرزا نے اس طرح میں ۹ شعر ہی کہے ہوں کیونکہ نسخہ حمیدیہ (میں) بھی وہی مروجہ پانچ شعر نظر آتے ہیں اور غزل ان غزلیات کے سلسلے میں منضبط کی گئی ہے۔ جن کا ہم طرح کوئی شعر قلمی نسخہ حمیدیہ میں نہیں ہے۔

اس سلسلے میں ایک غزل ماہ اکتوبر ۱۹۴۹ء کے "شاعر" آگرہ میں شائع کی گئی ہے۔ امید کہ آپ غزل مندرجہ ذیل کو معہ اس خط کے اشاعت میں لانے کی تکلیف فرمائیں گے۔ فقط والسلام

معراج دھولپوری

(نوٹ) یہ غزل جدید رسم الخط میں بدل کر لکھی گئی ہے اور دوسرے شعر میں کاتب نسخہ کی غلطی کا احتمال ہوتا ہے ممکن ہے اصل مصرعہ یوں ہو۔

ہزار بوسے ہیں تجھ پر مرے ز روئے حساب (معراج)

اس خط کے ساتھ قاضی صاحب مرحوم نے بھی شعر نقل کئے ہیں جو اوپر درج کئے گئے ہیں۔ محولہ بالا غزل کے دوسرے شعر نسخہ حمیدیہ" کے حوالے سے مولانا نے بھی "دیوان غالب" (نسخہ عرشی) کے صفحہ ۲۲۳ (غزل ۱۸۵۔ نوائے سروش) پر تین دوسرے اشعار کے ساتھ نقل فرمائے ہیں۔ یعنی محولہ بالا غزل کا ایک شعر۔ "پلادے اُوک سے .....!" اور مقطع کے سوا اس میں ایک مطلع اور دو شعر یہ ہیں۔ !

وہ آکے خواب میں تسکین اضطراب تو دے ولے مجھے تپش دل مجال خواب تو دے

تری طرح کوئی تیغ نگہ کو آب تو دے | کرے ہے قتل لگاوٹ میں تیرا رو دینا
نہ دے جو بوسہ تو منھ سے کہیں جواب تو دے | دکھا کے جنبش لب ہی تمام کر ہم کو

اور محولہ بالا غزل کے چوتھے شعر کے پہلے مصرعہ میں — "ساقی جو تجکو نفرت ہے" کے بجائے "ساقی جو ہم سے نفرت ہے" تحریر ہے — مندرجہ بالا غزل (پیش کردہ قاضی معراج مرحوم) کا مطلع اور اشعار نمبر ۲-۳ "نسخۂ حمیدیہ" میں نہیں ہیں۔

"ماہنامہ غالب" میں قاضی معراج کا خط اور محولہ بالا غزل جس وقت میری نظر سے گذری تھی۔ مجھ سے اور قاضی صاحب مرحوم سے اس وقت کوئی خاص رسم و راہ نہ تھی تقریباً ۱۹۵۵ء میں علامہ محوی لکھنوی کے یہاں بھوپال میں پہلی بار ان سے شرف نیاز حاصل ہوا۔ اثنائے گفتگو میں "ماہنامہ غالب" کی اس مطبوعہ غزل کا بھی ذکر آگیا — میں نے غالب کے اس خط کا حوالہ دیا جو انھوں نے علاؤالدین احمد خاں کے نام لکھا ہے اور اس میں اس کی شکایات کی تھی کہ کسی الو نے، ان کی اسی غزل میں تین چار شعر کا اضافہ کر کے ان کے نام سے مشہور کر دیا ہے — تو قاضی صاحب مرحوم نے وہی تاویل کی جو اپنے مضمون (مطبوعہ ہماری زبان ۸ راگست ۱۹۶۱ء) کے آخری حصّہ میں تحریر فرمائی ہے۔ قاضی صاحب نے اس گفتگو میں اس "مخطوطے" کا بھی ذکر کیا تھا مگر اس کا نام "باغ مہر" پہلی بار "ہماری زبان" علی گڑھ (مطبوعہ یکم اگست ۱۹۶۱ء) ہی سے معلوم ہوا۔

بہرحال غالب کے "مقتضائے طبیعت" کی متضاد کیفیات کو تسلیم کرنے کے باوجود بھی یہ بات کسی طرح قرین عقل و قیاس نہیں ہے کہ وہ خود اپنے نتیجہ فکر کو "نظری" کر دینے کے بعد یہ کہتے کہ یہ "شعر کسی الو" نے ان کے نام سے مشہور کر دیئے ہیں! ہو سکتا ہے کہ "باغ مہر" کے مؤلف یا مدوّن تک یہ اشعار غالب کے نام ہی سے پہنچے ہوں اور انھوں نے نیک نیتی کے ساتھ اسے کلام غالب سمجھ کر اپنے یہاں لکھ لیا ہو۔

لیکن غالب کے مذکورہ بالا خط کی روشنی میں ان اشعار کو کسی طرح غالب کا نتیجۂ فکر قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اس غزل کا مطلع اور دوسرا تیسرا شعر قطعاً الحاقی ہے غالب کا نہیں ہے — !

---

(۱۰)

واوا شرط محبت ہے یہی　　یاد ہیں ہم سے جو وعدے تھے کبھی
خیر! او پیماں شکن یونہی سہی　　سرو سیمینا بصحرا میروی
نیک و بد عہدی کہ بے ما می روے

تو جو نکلا شب کی تاریکی گئی　　ہر طرف پھیلی ہے دن کی روشنی
عقل حیراں! اس میں ہے، جاناں مری　　روئے پنہاں دار داز مردم پری
تو پری رو آشکارا می روے

دی کبھی راحت کبھی تکلیف دی　　جان بخشی کی کسی دم جان لی
جان جاں ہے شان معشوقی یہی　　می نوازی بندہ را می کشی
می نشینی یک نفس می روے

حسن کا تیرے ہے شہرہ کو بکو　　دیدہ بازوں کا ہے میلہ چار سو
کیوں ہے پھر سیر چمن کی آرزو　　اے تماشا گاہ عالم روئے تو
تو کجا بہر تماشا می روے

جان جاں طبع اسد ہے نادرست　　ساتھ چلتا گردہ ہوتا چاق و چست
لو دم رخصت عبث بیٹھا ہے سست　　دیدہ سعدی و دل ہمراہ تست
تو مپندار ی کہ تنہا می روے

اس تضمین کے متعلق قاضی معراج مرحوم کا بیان ہے ۔۔!

"غالب" نامی ایک ماہنامہ آگرے سے نکلتا تھا اس کی جلد اول کا نمبر ۴ - ۵ بابتہ ماہ جون - جولائی ۱۹۲۹ء پیش نظر ہے۔ اس کے صفحہ ۱۴ پر میر نذر علی درد کاکوروی کا ایک مضمون بعنوان "حضرت غالب اور ان کا کلام" شائع ہوا ہے ۔ جس میں تحریر ہے کہ "حضرت غالب نے سعدی علیہ الرحمۃ کی فارسی غزل کی تضمین کی ہے جس کو اکثر قوال گایا کرتے ہیں لیکن تعجب یہ ہے کہ وہ نہ پرانے دیوان میں ہے نہ نئے دیوان میں ۔۔ اس لئے تضمین کا یہاں لکھنا غالباً دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔"

"..... مذکور الصدر غالبؔ سے منسوب جو تضمین دؔرد کا کوردی نے درج مضمون کی ہے اس کے لئے مضبوط استناد پیش نہیں کیا — محض قوالوں کا گایا جانا تحقیقی دائرۂ خیال پر حاوی نہیں ہوسکتا۔" (ہماری زبان علی گڑھ ۸ اگست ۱۹۶۱ء)

(۱۱)

(۱)

ابر روتا ہے کہ بزم طرب آمادہ کرو	برق ہنستی ہے کہ فرصت کوئی دم ہے ہم کو

(۲)

بہا ہے یاں تک اشکوں میں غبار کلفت خاطر	کہ چشم تر میں ہر اک پارۂ دل پائے درگل ہے

(۳)

دل آپ کا کہ دل میں ہے جو کچھ سو آپ کا	دل لیجیے مگر مرے ارماں نکال کے

جناب مالک رام نے "دیوان غالب" صفحہ ۳۲۲ پر مندرجہ بالا اشعار "دیوان غالب" (حسرت) ص ۱۷۶ کے حوالے سے نقل کئے ہیں۔ اور تیسرا شعر صفحہ ۳۱۰ نسخۂ عرشی میں بھی درج کیا گیا ہے۔ اسی شعر کے متعلق مولانا عرشی نے لکھا ہے۔

"یہ شعر اکرام صاحب نے "ارمغان غالب" میں بغیر کسی حوالے کے نقل کیا ہے۔" (صفحہ ۳۹۲۔ نسخۂ عرشی)

اور اپنے مملوکہ نسخۂ دیوان غالب (مرتبہ مالک رام) و خود "نسخۂ عرشی" (زیر تصحیح) میں اس شعر کو قلمزد کرتے ہوئے تحریر فرمایا ہے۔

"یہ شعر امیر مینائی کا ہے۔"

(۱۲)

کیا ان دنوں بسر ہو ہماری فراغ میں
کچھ تفرقہ رہا نہ دل و درد و داغ میں
چاہا بچشم شوق جو موسیٰ نے طور پر
یاں دیکھتے ہیں روز وہی ہر چراغ میں

یہ تمکنت وقار علائیؔ! یہ وحشتیں
شورش ہے کچھ ضرور تمھارے دماغ میں

جناب مالک رام نے اپنے مرتبہ "دیوان غالب" کے صفحہ ۳۱۸ پر اس قطعہ کو درج کرتے ہوئے لکھا ہے۔

"یہ قطعہ نواب علاء الدین احمد خاں علائی مرحوم والئی لوہارو کی بیاض سے لیا گیا ہے اور پہلی مرتبہ شائع ہو رہا ہے"

جناب مالک رام کو غلط فہمی ہوئی! جیسا کہ مقطع سے ظاہر ہے یہ قطعہ "علائی" کا ہے۔ غالب کا نہیں ۔ مولانا عرشی نے بھی "دیوان غالب" (مرتبہ مالک رام) میں جو ان کا مملوکہ ہے اس قطعہ کو قلمزد فرماتے ہوئے لکھا ہے!

"یہ شعر علائی کے ہیں ۔ عرشی"

(۱۳)

گو نہ ملتے تھے۔ پر اک شہر میں تو رہتے تھے

یہ مصرعہ مولانا عرشی نے (نسخۂ عرشی صفحہ ۳۱۰) میں اردوئے معلیٰ" کے حوالے سے درج کیا ہے اور اس مصرعہ کی شان نزول ان الفاظ میں بیان فرمائی ہے۔

"مرزا نے ۱۷ محرم ۱۲۸۱ھ مطابق ۲۲ جون ۱۸۶۲ء کو جو خط نواب امین الدین احمد خاں بہادر والئی لوہارو کے نام لکھا تھا اس میں یہ مصرعہ تحریر کیا ہے (صفحہ ۳۹۴ نسخہ عرشی)

لیکن مطبوعہ نسخۂ عرشی کی مزید تصحیح کرتے ہوئے اب مولانا عرشی نے اس مصرعہ کو قلمزد کر کے لکھا ہے۔

"یہ مصرعہ جراءت کا ہے"!

(۱۴)

بہت شور سنتے تھے پہلو میں دل کا
جو چیرا تو اک قطرۂ خوں نہ نکلا

"خواجہ آتش کا مشہور عالم شعر ہے۔ لیکن "مطالعہ حالی" مصنفہ شجاعت علی سندیلوی و ناظر کاکوروی میں صفحہ ۲۱۶ پر سعید انصاری کے کسی مضمون کے اقتباس میں مرزا غالب کے نام سے نقل ہوا ہے علاوہ ازیں کہ یہ شعر غالب کا نہیں غالب نے اس زمین میں کوئی غزل بھی نہیں کہی ہے۔"

(صفحہ ۳۰۔ ماہنامہ نیا دور لکھنؤ اکتوبر ۱۹۵۹ء)

(۱۵)

خدا کا نام گو اکثر زبانوں پر ہے آجاتا!
مگر کام اس سے چلتا ہے کہ وہ دل میں سما جاتا

شری راجیشور پرشاد نارائن سنگھ ایم پی نے اپنے ایک ہندی مضمون "بہادر شاہ ظفر" میں ظفر کے ایک شعر سے موازنہ کرتے ہوئے یہ شعر غالب سے منسوب کیا ہے؛ لیکن یہ شعر نہ تو دیوان غالب کے مروجہ نسخوں ہی میں ملتا ہے اور نہ اس کے طرز بیان اور بندش الفاظ ہی کا تقاضا ہے کہ اسے غالب کی تخلیق کہا جا سکے! میں نے جب مذکورہ مضمون کا ترجمہ کیا تو "نقل مطابق اصل" کے پیش نظر یہ غلطی دانستہ برقرار رہنے دی (یہ ترجمہ ماہنامہ نگار لکھنؤ بابتہ ستمبر ۱۹۵۸ء میں شائع ہوا ہے) یہ شعر کسی اور شاعر کے دیوان میں بھی میری نظر سے نہیں گذرا۔ اس لئے یہ بتانا ناممکن ہے کہ کس کی ملکیت ہے۔ بہرحال غالب سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔

(صفحہ ۳۰۔ ماہنامہ نیا دور لکھنؤ۔ اکتوبر ۱۹۵۹ء)

(۱۶)

گاتی تھیں شمرو کی بیگم تننا ہا یا ہو
دودھ میں پکے تھے شلغم تننا ہا یا ہو

(صفحہ ۳۰۲ نسخہ عرشی)

مولانا عرشی نے اس شعر کا "پس منظر" بیان کرتے ہوئے لکھا ہے۔

"یہ شعر احتشام الدین صاحب دہلوی کے مضمون سے ماخوذ ہے جو

ماہنامہ ماہ نو (کراچی) فروری ۱۹۵۰ء میں چھپا ہے ان کے بیان کے مطابق یہ مطلع غالب کی ایک مہمل غزل کا ہے جو بچوں کے جھولے میں گانے کے لئے لکھی گئی تھی"۔ (صفحہ ۳۹۲۔ نسخۂ عرشی)

عبارت مندرجہ بالا سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ جناب احتشام الدین دہلوی کو یہ مطلع کہاں سے پہنچا ۔! جہاں تک مہمل گوئی کا تعلق ہے بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ مطلع صرف غالب کا مذاق اڑانے کے لئے ان سے منسوب کر دیا گیا ہے۔

(۱۷)

ذرا کر زور سینے پر۔ کہ تیر پر ستم نکلے
جو وہ نکلے تو دل نکلے۔ جو دل نکلے تو دم نکلے

(صفحہ ۲۱۰۔ نسخۂ عرشی)

مولانا عرشی اس شعر کے بارے میں رقمطراز ہیں۔

"یہ شعر اکرام صاحب نے "ارمغان غالب" (صفحہ ۳۰۸) میں بے حوالہ نقل کیا ہے۔ مولانا مہر نے اپنی کتاب غالب (صفحہ ۳۰۴) (طبع اول) میں دیوان غالب قلمی مملوکہ بیگم صاحبہ مرزا شجاع الدین احمد خاں تاباں سے اسے نقل کیا تو اس کے ساتھ یہ شعر بھی لکھا۔

خدا کے واسطے پردہ نہ کعبہ کا اٹھا واعظ
کہیں ایسا نہ ہو۔ یاں بھی وہی کافر صنم نکلے

(صفحہ ۳۹۳۔ نسخۂ عرشی)

جب اکرام صاحب نے اس شعر کی کوئی سند ہی پیش نہیں کی ہے تو یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ اسے بلا تامل "کلام غالب" تسلیم کر لیا جائے۔

(۱۸)

چند تصویر بتاں چند حسینوں کے خطوط
بعد مرنے کے مرے گھر سے یہ ساماں نکلا

اس شعر کے بارے میں مولانا نظامی بدایونی تحریر فرماتے ہیں۔

"یہ شعر اکثر لوگوں کی زبان پر ہے لیکن اس کے اصل مصنف کے نام سے لوگ نا آشنا ہیں بعض اسے "میر تقی میر" کا شعر بتاتے ہیں بعض مرزا غالبؔ کا؛ لیکن کلیات میر میں اس کا پتہ نہیں نہ "دیوان غالبؔ" میں ہے۔ لیکن حضرت شوکت بلگرامی نے اس شعر کی بابتہ اردوئے معلّیٰ علی گڈھ مطبوعہ ستمبر ۱۹۱۰ء میں اپنے ایک بزرگ کے حوالے سے لکھا تھا کہ اپنی اس مشہور غزل۔

قیس تصویر کے پردہ میں بھی عریاں نکلا

دیوان میرزا نے اس شعر کا اضافہ کیا تھا۔ عجب نہیں کہ حضرت شوکت کا یہ بیان صحیح ہو کیونکہ اس شعر کے "تیور" بھی یہی کہہ رہے ہیں کہ وہ میرزا جیسے قادر الکلام شاعر کے قلم سے نکلا ہے"۔

صفحہ ۲۷۲۔ اردو دیوان غالب (معہ شرح نظامی)
مطبوعہ نظامی پریس بدایوں اپریل ۱۹۲۷ء چھٹا ایڈیشن

مولانا نظامی نے صرف شعر کے تیور دیکھ کر کچھ تذبذب کے ساتھ اسے کلام غالبؔ قرار دیا ہے لیکن جناب حنیف نقوی اسے غالب کا کلام تسلیم نہیں کرتے! نقوی اپنے ایک مضمون (بعض اشعار کا غلط انتساب) میں لکھتے ہیں۔

"یہ شعر عام طور سے غالب سے منسوب کیا جاتا ہے اور ان کے کلام کے کسی انتخاب یا مجموعے (غالباً دیوان غالب مرتبہ نظامیؔ بدایونی میں بھی میری نظر سے گذرا ہے) لیکن چونکہ دیوان غالب کے کسی مستند نسخے میں نہیں ملتا اس لئے یہ انتساب صحیح نہیں! اگرچہ غالبؔ نے اس زمین میں طبع آزمائی کی ہے مگر یہ شعر ان کی تخلیق ہونے کی سعادت سے محروم ہے"۔

(صفحہ ۲۱۔ ماہنامہ نیا دور لکھنؤ۔ جون ۱۹۵۹ء)

(۱۹)

اے شمع تیری عمر طبیعی ہے ایک رات ـــ رو کر گذر یا اسے ہنس کر گذار دے

لہ نظامی ایڈیشن مطبوعہ نظامی پریس بدایوں ۱۹۲۲ء کے صفحہ ۱۴۰ میں یہ شعر موجود ہے۔ (نادم سیتاپوری)

مندرجہ بالا شعر کو "حیات غالبؔ" کے مؤلف سید محمد مرزا موج نے حیات غالب (مطبوعہ نگارستان پریس لکھنؤ ۱۸۹۹ء) کے ایک لطیفہ میں اس تمہید کے ساتھ درج کیا ہے۔

"مرزا ایک مرتبہ مشاعرہ میں تشریف لے گئے جناب عیش ایک خوش فکر اور زندہ دل آدمی تھے آپ نے اپنی غزل میں یہ شعر پڑھا۔

اے شمع صبح ہوتی ہے روتی ہے کس لئے
تھوڑی سی رہ گئی ہے اسے بھی گذار دے

مرزا کی غزل میں بھی ایک شعر اسی مضمون کا تھا انھوں نے ایک صاحب سے جوان کے پہلو میں بیٹھے تھے کہا کہ میرے ایک شعر کا مضمون اس شعر سے لڑ گیا ہے میں اب وہ شعر نہ پڑھوں گا۔ انھوں نے کہا ضرور پڑھئے کیونکہ انھوں نے نہ آپ کا شعر سنا تھا اور نہ آپ نے ان کا۔ علاوہ بریں آپ کے پڑھنے سے فکر کا بھی اندازہ ہو جائیگا کہ ایک ہی منزل پر دونوں فکریں کس کس طرح پہنچیں۔ چنانچہ جب مرزا کے سامنے روشنی آئی تو انھوں نے یہ شعر پڑھا۔

اے شمع تیری عمر طبیعی ہے ایک رات
رو کر گذار یا اسے ہنس کر گذار دے

"حیات غالبؔ" پر پہلی بار میں نے ایک تعارفی مضمون لکھا جو ماہنامہ "ماہ نو" کراچی کے خاص نمبر (مارچ ۱۹۶۴ء) میں شائع ہوا۔ چونکہ یہ کتاب کمیاب بلکہ نایاب ہو چلی ہے اس لئے اپنے مضمون میں میں نے "حیات غالبؔ" کے ایک ایک لفظ کو بجنسہ نقل کر دیا۔ جولائی ۱۹۶۴ء کے "ماہ نو" کراچی میں مولانا غلام رسول مہر نے "حیات غالبؔ (چند گزارشیں)" کے عنوان سے ایک تحقیقی مقالہ تحریر فرما کر "حیات غالبؔ" کے متعلق کچھ ضروری حاشیے لکھ کر "حیات غالبؔ" پر بھی سرسری روشنی ڈالی چنانچہ "حیات غالبؔ" کے متذکرہ بالا لطیفے کے متعلق مولانا مہر تحریر فرماتے ہیں۔

"ایک افسوسناک غلطی: ۹۔ سب سے بڑی غلطی یہ کی کہ شیخ ابراہیم

ذوق کا ایک شعر میرزا غالب سے منسوب کر دیا یعنی۔!

اے شمع تیری عمر طبیعی ہے ایک رات
ہنس کر گذار یا اسے رو کر گزار دے

لطف یہ کہ اس پر جو کچھ لکھا وہ اس تحریر کا چربہ ہے جو اس غزل کے سلسلے میں مولانا محمد حسین آزاد نے دیوان ذوق میں شائع کی (ملاحظہ ہو دیوان ذوق) فرماتے ہیں۔

"استاد نے یہ غزل میرزا خدا بخش شہزادے کے مشاعرے میں پڑھی تھی حکیم آغا جان عیش استاد کے پاس بیٹھے تھے۔ انھوں نے اپنی غزل میں یہ شعر پڑھا۔

اے شمع صبح ہوتی ہے روتی ہے کس لئے
تھوڑی سی رہ گئی ہے اسے بھی گذار دے

استاد کے ہاں بھی یہی مضمون تھا۔ والد مرحوم استاد کے پہلو میں بیٹھے تھے ان سے استاد نے کہا کہ مضمون لڑ گیا ہے اب میں وہ شعر نہ پڑھوں گا انھوں نے کہا ضرور پڑھنا چاہیے طبیعتوں کا اندازہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک نکتے پر دو فکر پہنچے اور کس کس انداز میں پہنچے حکیم صاحب کے بعد استاد کے آگے شمع آئی جب یہ شعر پڑھا تو حکیم صاحب کو خدا مغفرت کرے نیک بخت اور منصف مزاج تھے شعر مذکور سن کر خوش ہوئے رسائی کی تعریف کی اور کہا۔ آپ فی الواقع استاد ہیں۔

بہر حال یہ شعر مرزا غالب کا نہیں۔؟

(ماہنامہ "ماہ نو" کراچی جولائی ۱۹۶۴ء)

(نوٹ) حیات غالب میں اس شعر کا مصرعۂ ثانی اسی طرح درج ہے۔

رو کر گذار یا اسے ہنس کر گذار دے

(۲۰)

سنین عمر کے ستر ہوئے شمار برس
بہت جیوں تو جیوں اور تین چار برس

یہ شعر نادر" خطوط غالب" کے حوالے سے نسخہ عرشی (صفحہ ۲۹۵) میں اس صراحت کے ساتھ نقل ہوا ہے ۔

" یہ شعر مرزا غالب نے اپنے خط بنام صفیر بلگرامی مورخہ ۲۸ نومبر ۱۸۶۳ء میں لکھا ہے مرتب خطوط کا قول ہے کہ صفیر (بلگرامی) نے اس کے جواب میں یہ شعر لکھ کر بھیجے تھے ۔ !

سنا صفیر! یہ کہتے ہیں حضرت غالب — بہت جیئوں تو جیئوں اور تین چار برس
مگر یہ پہلے سے اعداد غین کی ہے دعا — خدا کرے مرا غالب جئے ہزار برس

مندرجہ بالا شعر غالب کے جس خط سے تعلق رکھتا ہے وہ ان پانچ خطوط کے علاوہ ہے جو صفیر بلگرامی کے تذکرہ "جلوہ خضر" میں موجود ہیں اور یہ خط سب سے پہلے صفیر کے پوتے جناب سید وصی احمد بلگرامی نے اپنے طویل مقالے "س بش . ص" (مطبوعہ ماہنامہ ندیم گیا بہار نمبر بابتہ ۱۹۲۵ء) میں پیش فرمایا جو بعد میں نادر خطوط غالب میں بھی نقل کیا گیا۔ جناب محترم قاضی عبدالودود اس خط کو غالب کے جعلی خطوط میں شمار کرتے ہیں اور قاضی صاحب کے ارشاد کے مطابق اگر یہ خط "جعلی" ثابت ہوتا ہے تو مندرجہ بالا شعر بھی مشکوک و مشتبہ ہو جاتا ہے۔ قاضی صاحب کا استدلال یہ ہے۔

۱- غالب کا متذکرہ بالا خط صفیر بلگرامی کے اس خط کا جواب ہے جس میں انھوں نے اپنی ملاقات (۱۸۸۲ھ) کا حوالہ دیتے ہوئے خواجہ فخرالدین سخن کا ذکر کیا ہے اور "سروش سخن" کے مسودہ پر اصلاح کی درخواست کی ہے۔

۲- غالب کے اس خط کو جس پر ۲۸ نومبر ۱۸۶۳ء (تخمیناً وسط ۱۲۸۱ھ) کی تاریخ درج ہے اگر صفیر بلگرامی کے خط کے ساتھ پڑھا جائے تو بلاشبہ یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ایسے خطوط ۱۲۸۲ھ کے بعد ہی لکھے جا سکتے ہیں پہلے نہیں ۔ ؟

۳- لیکن مشکل یہ آپڑی ہے کہ "سروش سخن" کے جس اصل مسودہ کو ۱۲۸۲ھ میں بغرض اصلاح غالب کی خدمت میں بھیجا گیا اس کا پہلا ایڈیشن ۱۲۸۱ھ ہی میں نولکشور پریس شائع کر چکا تھا۔

۴- اور یہ بات کہیں سے بھی ثابت نہیں ہے کہ غالب کی یہ اصلاح "سروش

سخن" کے کسی دوسرے ایڈیشن سے تعلق رکھتی ہے۔

ذیل میں جناب قاضی عبدالودود کے مضمون (غالب کے خطوط صفیر بلگرامی کے نام) کا ضروری حصّہ درج کیا جاتا ہے۔

"لیکن جہاں تک مجھے معلوم ہے صفیر کی زندگی میں ان پانچ خطوط (مندرجہ جلوہ خضر) کے علاوہ کوئی خط شائع نہیں ہوا۔ ان کی وفات کے بعد ان کے پوتے جناب سید وصی احمد بلگرامی نے اپنے طویل مقالے "س بش۔ص" میں جو ندیم" گیا کے بہار نمبر (بابت ۱۹۲۵ء) میں چھپا تھا دو خط درج کیے جن میں سے ایک کی نسبت ان کا بیان ہے کہ صفیر نے غالب کو لکھا ہے اور دوسرا ان کے دعوے کے مطابق غالب کی طرف سے اس کا جواب ہے — یہ دونوں خط ذیل میں درج کیے جاتے ہیں۔

خط صفیر (بلگرامی)

(بنام غالب) .....(کذا) ملازمت کے وقت میں نے خواجہ فخرالدین صاحب سخن جنکا دادیہال لکھنؤ اور نانہال دہلی میں ہے اور غدر کے چند سال بعد بہ عمر چاردہ یا پانزدہ سالگی آرہ میں تشریف لائے اور جناب محمد ابراہیم صاحب خلف مرزا محمد صدیق صاحب کی صاحبزادی سے منسوب کیا اور جس کو ان کی رائے سے درست کرنے کا اتفاق ہوا سب حال آپ سے بیان کیا تھا۔ چونکہ اس قصہ کو چھپنا چاہئے اور لکھنؤ بھیجنا منظور نہیں اس کے سوا حضور سے بڑھکر کون ہے؟ اس لئے وہ قصہ بھیجتا ہوں حضور اس کو میری تصنیف سمجھ کر بہ نظر تامل بنائیں کہ بڑا مقابلہ[۱] ہے — اور طبیعت ان کی اچھی ہے چنانچہ آج ہی ایک غزل میرے پاس پٹنہ سے اصلاح کو آئی ہے اس کا ایک شعر میرے دل میں کھپ گیا۔ وہ یہ ہے۔

---

[۱] "سروش سخن"۔ فسانۂ عجائب کے جواب میں لکھا گیا اور اس میں سرور پر اعتراض کیے گئے تھے۔ (ق-ع)

سنبھالا ہوش تو مرنے لگے حسینوں پر
ہمیں تو موت ہی آئی شباب کے بدلے

جواب غالب (بنام صغیر بلگرامی)

مولوی سید فرزند احمد...... (کذا) اس پیر ہفتاد سالہ کی دعا پہنچے۔
آج میں نے لیٹے لیٹے حساب کیا کہ یہ سترواں برس مجھے جاتا ہے۔ ہائے!

سنین عمر کے ستر ہوئے شمار برس
بہت جیوں تو جیوں اور تین چار برس

نامہ محبت افزا کو دیکھ کر آنکھوں میں نور دل میں سرور آیا۔ اور قصہ "سروش سخن" دوسرے دن پہنچا..... (کذا) قصہ دیکھا آپ کے جوہر طبعی[1] کی لمعانی اور تیز فکر کی درخشانی بہت جگہ پر پسند آئی۔ اگرچہ وہ قصہ تو بچوں کو سلانے کی کہانی ہے — مگر محنت کی گئی ہے — ہاں اگر "فسانہ عجائب" کا مقابلہ کیا ہے تو کیا کہوں کہ کیا کہا ہے۔؟ ابھی دیکھتا ہوں۔ آئندہ اس کی کیفیت سے اطلاع دی جائے گی.... (کذا) جا بجا لاچار لکھا ہے..... (کذا) لاکا لگانا کاتب کی جہالت ہے..... (کذا) ہائے خدا کی مار کاتبان ناہنجار پر — میرا دیوان اور پنج آہنگ.... اور مہر نیمروز ستیاناس کر کے چھوڑ دیا.... (کذا) لو بس اب میں تو اب ضیاء الدین خاں سے باتیں کر رہا ہوں۔ تمھارے

---

[1] سخن نے غالب کی زندگی ہی میں یہ دعویٰ کیا تھا کہ غالب میرے نانا ہوتے ہیں اور میں ان ان کا شاگرد ہوں۔ "تنبیہ صغیر بلگرامی" میں ہے کہ (شعر) سنبھالا.... الخ! سخن نے دہلی ہی میں کہا تھا اور غالب نے اسے سنکر انھیں گلے لگایا تھا اور آبدیدہ ہو کر کہا تھا۔ میری جان ایسا شعر نہ کہا کرو؟ ابھی تو تم نے ہوش بھی نہیں سنبھالا۔ دنیا میں کیا دیکھا بھالا۔ دیکھو عارف ایسے ہی لخت جگر اگل کر دنیا سے ناشاد گیا۔ تم بھی زندگی سے بیزار ہو الغرض نہایت خفا ہوئے اور تاکید کی۔ کہ خبردار —؟ اب جو سنوں گا کہ ایسا شعر کہا ہے تو سید تیری جان اور اپنے ایمان کی قسم صورت سے بیزار ہو جاؤں گا۔" (ص۲۰) ق۔ع

[2] اس سے یہ ثابت کرنا مد نظر ہے کہ کتاب صغیر کی لکھی ہوئی ہے (ق۔ع)

خطوط کے جواب نے اتنی دیر تک اُن کو چپکا بٹھا رکھا اور وہ بھی
تم کو سلام اشتیاق آمیز پہنچاتے ہیں ...... (کذا)

جناب سید وصی احمد لکھتے ہیں کہ حضرت غالب کے شعر کا جواب صفیر بلگرامی نے یہ بھیجا

سنا صفیرؔ! یہ کہتے ہیں حضرت غالب — بہت جیوں تو جیوں اور تین چار برس
مگر یہ پہلے سے اعداد "غین" کی ہے دعا — خدا کرے مرا غالب جئے ہزار برس

میں نے نادر خطوط غالبؔ" کے تبصرے میں جو "معاصر" پٹنہ میں شائع ہوا تھا موصوف سے دریافت کیا تھا کہ صفیرؔ و غالب کے خط انھیں کہاں سے ملے؟ لیکن انھوں نے اس کا کچھ جواب نہیں دیا۔ یہ دونوں خطوط میری رائے میں "جعلی" ہیں اور جعل سازی کی غرض یہ ثابت کرنا ہے کہ سخن صفیر کے شاگرد تھے۔ اسخن کو اس سے انکار ہی نہیں تھا (بلکہ) وہ اس کے مدعی تھے کہ خود صفیر کو ان سے تلمذ ہے (تنبیہ صفیر بلگرامی ص۴۸) اس موقع پر میں اس بحث میں پڑنا نہیں چاہتا کہ صفیر و سخن میں سے کس کا دعویٰ صحیح ہے۔ اور خطوط زیر بحث کو "جعلی" قرار دینے کی وجہ بیان کرنے پر قناعت کروں گا۔

صفیر کے خط میں دہلی جانے اور وہاں غالبؔ سے سخنؔ کے متعلق گفتگو آنے کا ذکر ہے صفیر اوائل ۱۸۸۲ھ میں دہلی گئے ہیں (جلوہ ۱ ص۲۲۲) اور وہاں دو ڈھائی مہینے ٹھہرے ہیں (جلوہ ۲ ص۲۲) اس سے لازم آتا ہے کہ خط دہلی سے واپسی کے بعد کا ہوگا! غالب کے خط میں جوان کی عمر کا ذکر ہے اس سے اس کا زمانہ تحریر ہے۔ ۱۲۸۲ھ ثابت ہوتا ہے لیکن "سروش سخن" (قطعات تاریخ طبع اور تاریخ وتاسی جلد ۲ ص۱۱۱) ۱۲۸۱ھ ہی میں لکھنؤ کے مطبع نولکشور نے چھاپ کر شائع کر دیا تھا۔ اس لئے یہ ممکن نہیں کہ یہ خط اس کے بعد لکھے گئے ہیں "جعل"، کسی ایسے شخص نے بنایا ہے جو سروش سخن طبع اول کے سال انطباع سے ناواقف ہے اور اس بنا پر میں سمجھتا ہوں کہ اس کے ذمہ دار صفیر نہیں۔ یہ مستبعد ہے کہ وہ اسے نہ جانتے ہوں۔

(ماہنامہ آجکل دہلی ماہ اگست ۱۹۵۲ء)

جناب قاضی عبدالودود کے مندرجہ بالا استدلال کے بعد اس میں کسی شک و

شبہ کی گنجائش باقی نہیں رہتی کہ مندرجہ بالا شعر غالب کے جس خط سے تعلق رکھتا ہے وہ غالب کا نہیں ہے — اور جبتک کہ اس شعر کے بارے میں کسی دوسری مستند شہادت سے یہ ثابت نہ کیا جائے کہ یہ غالب کا کلام ہے صرف مذکورہ بالا خط کا وجود ہی اس شعر کو مشتبہ اور مشکوک کرنے کے لئے کافی ہے۔

(۲۱) ———

بجا ہے شیریں اگر چھوڑ دلّی حج کو چلی
مثل ہے نوسو چوہے کھا کے بلّی حج کو چلی

———

ڈیڑھ جز پر بھی تو ہے مطلع و مقطع غائب
غالب آساں نہیں صاحب دیواں ہونا

———

"نسخۂ عرشی" (ص ۳۱۰) میں پہلے شعر کو نقل کرتے ہوئے مولانا عرشی نے لکھا ہے۔

"حکیم محمد حسن میرٹھی نے میرزا صاحب کے لطائف ایک کتاب میں اکٹھے کئے تھے جو "لطائف غالب" کے نام سے ۱۹۰۴ء کے قریب نامی پریس میرٹھ میں چھپ کر شائع ہوئی تھی اس میں وہ لکھتے ہیں کہ " دلی میں "شیریں" ایک رنڈی بڑی نامی تھی جب وہ حج کو چلی تو مرزا صاحب نے کہا" ! (صفحہ ۳۹۳۔ نسخۂ عرشی)

دوسرے شعر کو مفتی انتظام اللہ خاں شہابی نے غالب سے منسوب کرتے ہوئے "لطائف الشعراء" میں ایک لطیفہ "مولوی سید مدد علی تپش" کے عنوان سے لکھا ہے۔ تحریر فرماتے ہیں — !

"حضرت تپش مرزا صاحب (غالب) کے شاگرد تھے۔ مراسلت سے شاگرد ہوئے تھے۔ دہلی مرزا صاحب سے ملنے آئے۔ گھبراہٹ میں دیوان کا صاف شدہ مسودہ بھول آئے۔ ایک دوسرا مجموعہ تھا وہ

ہمراہ چلا آیا مرزا صاحب سے اپنے دیوان کا ذکر کیا اور اس مجموعہ کو ملاحظہ سے گذارا۔ اس میں بہت تھوڑا کلام ان کا تھا. باقی دوسروں کا کلا اتھا پوری پوری غزلیں بھی نہ تھیں۔ مرزا صاحب نے دیکھکر کہا۔

ڈیرھ جز پر بھی تو ہے مطلع و مقطع غائب
غالب آسان نہیں صاحب دیواں ہونا

تپش صاحب نے اس مجموعہ کو واپس لے کر دیکھا تو دیوان نہ تھا دوسرا نسخہ تھا جلد ایک سی بنی تھی اس سے دھوکہ ہوا۔ مرزا صاحب سے بیحد معذرت کی اور دوبارہ دیوان لے کر دکھایا اور اصلاح لی۔ کہ — دھوکہ ہوا۔ یہ دیوان ان کے پوتے منشی عبدالحمید تاج محلی کے یہاں بطور تبرک محفوظ ہے۔"

(صفحہ ۸۴۔ لطائف الشعرا۔ مطبوعہ فاروقی پریس دہلی)

لیکن یہ دونوں شعر عبداللہ خاں اوج کے ہیں جن کی تفصیل صاحب "آب حیات" نے ان الفاظ میں بیان کی ہے۔

"اوج تخلص۔ عبداللہ نام! ۴۰۔ ۴۵ برس کے مشّاق تھے ایسے بلند مضمون اور نازک خیال پیدا کرتے تھے کہ قابو میں نہ لا سکتے تھے. اور انھیں عمدہ الفاظ میں ایسی چستی اور درستی سے باندھتے تھے کہ وہ مضمون سما بھی نہ سکتا تھا۔ اس لئے کبھی تو مطلب کچھ کا کچھ ہو جاتا تھا اور کبھی کچھ بھی نہ رہتا تھا. سنگلاخ اور مشکل زمینوں میں غزل کہتے تھے فکر مضامین اور تلاش الفاظ میں تن بدن کا ہوش نہ تھا. غور کے ساتھ کاوش کرتے تھے اور آپ ہی آپ مزے لیتے تھے۔ ہونٹ چباتے چباتے ایک طرف سے سفید ہو گیا تھا۔ لبعض دفعہ پڑھ کر کہتے تھے کہ آنکھوں سے لہو ٹپک پڑا تھا جب یہ شعر کہا تھا۔ بعضے پر کہتے تھے کہ چھ مہینے تک برابر پڑھتا رہا! پڑھتے اس زور شور سے تھے کہ دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ مشاعروں میں غزل سناتے تھے تو صف مجلس سے گذر کر

آگے نکل جاتے تھے بعض اشخاص شہر اور قلعے میں اکثر مرشد زادے (شہزادے) شاگرد تھے مگر استاد سب کہتے تھے۔ شعراء باکمال کو جاکر سناتے تھے اور واہ وا کی چیخیں اور تعریفوں کی فغان و فریاد لے کر چھوڑتے تھے کیونکہ اسے اپنا حق سمجھتے تھے۔ ذوق مرحوم باوجود کم سخنی اور عادت خاموشی کے خوب خوب ..... بہت خوب! کہتے! اور مکرر پڑھواتے تھے۔ مسکراتے اور چہرے پر سرور ظاہر کرتے گویا شعر کی کیفیت میں بیٹھے ہیں اور مرزا (غالب)، تو ایسے دل لگی کے مصالحے ڈھونڈھتے پھرتے ہیں، کہ لغمت خدا دے“ —! شعر سنتے اور کہتے تھے کہ یہ سب کافر ہیں جو تمھیں استاد کہتے ہیں۔ شعر کے خدا ہو خدا —! سجدے کا اشارہ کرتے اور کہتے سبحان اللہ! سبحان اللہ! میں ان دنوں میں مبتدی شوقین تھا اپنا مشتاق سمجھ کر مجھ سے بہت خوش ہوئے تھے اور کہتے تھے کہ بس تم ہمارے کلام کو سمجھتے ہو — رستے میں مل جاتے تو دس قدم دور سے دیکھ کر کھڑے ہو جاتے اور جو نیا شعر کہا ہوتا۔ اسے وہیں سے اکڑ کر پڑھتے پھر شعر سنتے سناتے چلتے قلعے کے نیچے میدان میں گھنٹوں ٹہلتے اور شعر پڑھتے رہتے تھے! غریب خانے پر بھی تشریف لاتے اور پہر بھر سے کم نہ بیٹھتے —! ایک دن رستے میں ملے دیکھتے ہی کہنے لگے! آج گیا تھا۔ انھیں بھی سنا آیا! میں نے کہا کیا؟ کڑک کر کہا۔

ڈیڑھ جزو پر بھی تو ہے مطلع و مقطع غائب
غالب آسان نہیں صاحب دیواں ہونا

.... دلی میں ”شیریں“ ایک بڑی نامی رنڈی تھی وہ حج کو چلی آپ نے کہا:۔

بجا ہے شیریں اگر چھوڑ دلی حج کو چلی
مثل ہے نو سو چوہے کھا کے بلی حج کو چلی
(حاشیہ صفحات ۵۲۸ لغایتہ ۵۳۰ - آبحیات مطبوعہ مفید عام
لاہور ۱۸۸۷ء)

(۲۲)

شدت تندیٔ صہبا سے ہے معمور ہنوز
ساغرِ دیدہ وراں - نرگسِ مخمور ہنوز
خلشِ غمزہ خوں ریز ابھی تشنہ ہے
زخمِ موئے دلِ صد دیدہ ہے ناسور ہنوز
خود نوشتِ دو جہاں - صورت سر رشتہ سنگ
عرضِ خمیازۂ مژگاں پہ ہے مذکور ہنوز
ہے رسن فرما خودی اور خود آرائی میں
سعیٔ بے سودِ تنک ظرفیٔ منصور ہنوز
خمِ کاکل سے ہے ژولیدگی سود و زیاں
دامِ ہر حلقۂ صد رنگ ہے مہجور ہنوز
خامشی صیقلِ صد آئینہ حیرت ہے
سردِ آہنگ تکلم ہے بدستور ہنوز
درسِ عنوانِ تغافل ہے سکوتِ ارنی
شمع یخ بستہ ہے آتشکدۂ طور ہنوز
پیکر جامۂ صد چارہ گرانِ وحشت
شعلہ پیرہنِ جلوۂ پر نور ہنوز!
چشمِ نمناک بہ اندازِ سویدائے وصال
پرتوِ خور میں ہے غلطاں شب دیجور ہنوز

مرکزِ جہدِ عرق ریزی ہے باسعیِ عمل
موجِ دہقانِ صبا۔ کاکلِ مزدور ہنوز

عرضِ نغمہ سہی ہر چند نوائے سروش
ہے کفن بستہ مگر غالبِ مغفور ہنوز

۱۸؍جنوری ۱۹۶۹ء کے روزنامہ "سیاست جدید" کان پور کے مخصوص مزاحیہ کالم "نگاہے" میں یہ غزل شائع ہوئی تھی جس کا عنوان تھا — "غیر مطبوعہ کلام غالب"۔ اول تو ایک روزنامہ اخبار کے مزاحیہ کالم میں اس کی اشاعت ہی اس بات کا کھلا ہوا ثبوت ہے کہ ان "مہمل اشعار" کا سنجیدہ ادب سے کوئی تعلق نہیں ہے دوسرے اس غزل کی اشاعت کے سلسلے میں مندرجہ ذیل نوٹ بھی اس حقیقت کا آئینہ دار ہے کہ یہ محض طنز و مزاح ہے۔ "سیاست" کے اس نوٹ میں مزاحیہ کالم نویس "علامہ نکتہ رس" نے لکھا ہے۔

"غالب زندہ ہے —— اور اس وقت تک زندہ رہے گا
جب تک اس کا — "بے چھپا تازہ کلام" دستیاب ہوتا رہے گا۔
اسی قسم کی ایک نادر غزل آج ہدیۂ ناظرین کی جا رہی ہے —"

پھر نہ خدا کرے کہ یُوں ـ؟

ہیں کواکب کچھ — نظر آتے ہیں کچھ
دیتے ہیں دھوکہ یہ بازی گر کھُلا

(غالبؔ)

غالب کے اُردو کلام میں جو الحاقی عناصر شامل کر دیئے گئے ہیں ان کے بہت سے نمونے ان اوراق میں آپ ملاحظہ فرما چکے۔ لیکن اس سلسلے کا سب سے بڑا تاریخی سانحہ" وہ غزلیات ہیں جنہیں مولانا عبدالباری آسی الدنی مرحوم نے خود کہکر غالب کے نام سے چھپوا دیا ہے۔ مجموعی حیثیت سے ان غزلوں کی تعداد اتنی کافی ہے کہ اس سے زیادہ اس قسم کا کلام پیش کرنا" جوئے شیر" لانے سے کم بھی نہیں تھا۔ اس لئے نہیں کہ مولانا آسی اس رنگ کی غزلیں کہنے پر قدرت نہیں رکھتے تھے بلکہ اس لئے کہ جن فرضی بیاضوں میں ان غزلوں کا شامل ہونا ظاہر کیا گیا تھا۔ ان کے زیادہ مشتبہ اور مشکوک ہونے کا اندیشہ تھا۔ ؟

مولانا آسیؔ (وفات ۱۹۴۶ء) اس صدی کے حد درجہ ذہین۔ طباع۔ سخن فہم سخن سنج بڑے ہی قادر الکلام اور کہنہ مشق شاعر۔ لیکن ناکام ادیب و نثار تھے! اُردو فارسی میں ان کو ید طولیٰ حاصل تھا۔ حسب ضرورت عربی بھی جانتے تھے۔ حکیم نواب جان دہلوی سے طب بھی پڑھی مگر نصیب میں کچھ اور ہی تھا! طبی تعلیم چھوڑ کر شاہجہان پور کے کسی اسکول میں فارسی ٹیچر کی حیثیت سے نوکری کر لی۔ ادبی ذوق کی تسکین اس سے بھی نہیں ہوئی۔ دہلی جا کر مولانا محمد علی مرحوم کے روزنامہ "ہمدرد" میں دفتری ملازمت کی! یہ نوکری ان کی شایان شان نہیں تھی اور شاید یہاں آگے بڑھنے کی کوئی صورت بھی نہ تھی لکھنؤ چلے آئے اور "نولکشور بکڈپو" کے اردو فارسی اور عربی شعبہ کے انچارج ہو گئے۔

جس زمانے میں مولانا آسی، لکھنؤ پہنچے یہاں" معیار پارٹی" کا زور تھا۔ یہ ادبی ادارہ لسان القوم صفیؔ لکھنوی کے اس " دائیرہ ادبیہ" کی ترقی یافتہ شکل تھا۔ جسے مولانا صفی نے گزشتہ صدی کے آخر میں قائم کیا تھا۔ شیخ ممتاز حسین جونپوری مرحوم ظریفؔ لکھنوی کے کلیات (دیوان جی) کے "پیش گفت" میں تحریر فرماتے ہیں۔!

"۱۸۹۵ء میں صفی صاحب نے لکھنؤ میں ایک " دائیرہ ادبیہ" قائم کیا جس کے اراکین میں خود جناب صفیؔ۔ منشی سجاد حسین صاحب ایڈیٹر "اودھ پنچ"، شیخ ممتاز حسین (عثمانی) آخر دور کے ایڈیٹر اودھ پنچ۔ ڈاکٹر مرزا محمد ہادی رسوا

جناب پیارے صاحب رشید۔ ابر مرحوم (محسن علی ایڈیٹر معیار) اور خود ظریف بھی تھے اس صحبت کی غرض یہ تھی کہ غزل کے قدیم رنگ اور پرانی شاعری و تخیل میں مذاق زمانہ کے موافق کچھ اصلاح کی جائے۔ دائرہ ادبیہ میں مشاعرے ہوتے تھے مگر مصرعہ طرح نہیں دیا جاتا تھا۔ صرف قافیہ اور ردیف اور بحر بتادی جاتی تھی اور صفت نظم کے لئے مضمون دے دیا جاتا تھا۔ اس دائرہ ادبیہ کا نام اور صورت بدلکر چند سال بعد ایک دوسری انجمن کی تشکیل ہوئی جس کا نام "معیار" ہوا۔ اور اس میں صفی اور ان کے شاگرد صغیر لطیف۔ عزیز۔ آرم۔ بہار۔ ظریف وغیرہ اور ابر۔ محشر۔ بلیغ۔ ناطق وغیرہ دیگر شعراء شریک ہوئے۔" (صفحہ ۳۶۔ دیوان جی)

لکھنؤ کے اس شعری ماحول کی تبدیلی کا تعلق چاہے براہ راست لاہور کے ان مشاعروں سے نہ ہو جو آزاد اور حالی نے قائم کئے تھے لیکن یہ حقیقت ہے کہ اس زمانے تک لکھنؤ کو غالب کے رنگ سخن سے ایک خاص قسم کا لگاؤ ضرور پیدا ہو چلا تھا۔ حکیم محسن علی ابر مرحوم نہایت پابندی سے اپنے نام کے ساتھ "مقلد میر و غالب" لکھنے میں ایک قسم کا فخر محسوس کرتے تھے۔ اور جب اسی "معیار ادب" کی طرف سے "معیار" کے نام سے ایک ماہنامہ نکالا گیا۔ تو ہر مہینے اس کے سرورق پر "غالب" کی ایک چھوٹی سی تصویر ایک گول دائرہ میں چھپی نظر آتی تھی مرزا محمد ہادی رسوا پر غالب[1] کے رنگ سخن کا سب سے زیادہ اثر تھا۔ وہ اسی رنگ میں کہتے تھے۔ اور اچھا کہتے تھے۔ ان کے علاوہ حکیم محسن علی ابر اور اس دور کے کئی شاعر لکھنؤ کے قدیم رنگ سے اکتا کر نئی راہوں کی تلاش میں بھٹک رہے تھے۔ اس موضوع پر "محاکمے" بھی ہوئے

---

[1] عزیز لکھنوی نے لکھا ہے۔
"میرے نزدیک لکھنؤ میں ان (مرزا رسوا) کی ذات بحیثیت ایک "مجدد فن" کی تھی۔ ان کی شاعری کا آغاز اس وقت ہوا جب لکھنؤ میں ناسخ و آتش کے ترانے گونج رہے تھے اور محفلوں پر وہی رنگ چھایا ہوا تھا اس وقت سب سے پہلے جس شخص نے ترمیم کی وہ مرزا کی ذات تھی اور یہ سہرا انہی کے سر رہا۔ ان کی دیکھا دیکھی دوسرے لوگوں نے اس فن کو اختیار کیا۔ مگر غالب کے رنگ میں جس قدر کامیابی مرزا کو حاصل ہوئی کسی ایک کو بھی نصیب نہیں ہوئی۔" (صفحہ ۱۰۹۔ مرزا سودا کے تنقیدی مراسلات" مطبوعہ مسلم ایجوکیشنل پریس علی گڑھ ۱۹۶۱ء)

اور قدیم و جدید نظریات میں علمی بحث و مباحثے بھی! لیکن "نئے رجحانات" کو خاطر خواہ کامیابی نصیب نہیں ہوئی۔ صرف ان لوگوں کے قدم اس نئی منزل کی طرف اٹھ سکے جنھیں اس انقلاب سے فطری لگاؤ تھا باقی سب پرانی ڈگر پر چلتے رہے!

اس انقلابی تحریک سے ایک فائدہ ضرور ہوا کہ دلّی اور لکھنؤ کے اس عظیم ادبی مناقشے میں کمی ضرور ہوگئی جس کا زور گزشتہ صدی کے آخر میں کچھ زیادہ بڑھ گیا تھا اور لکھنؤ اور دلّی کی ادبی فضائیں ان تعلّیوں سے مسموم ہو چکی تھیں۔

دلّی کے لوگ لکھنؤ والوں کے سامنے
چلتے ہیں جیسے شیر۔ غزالوں کے سامنے

یا ———————!

دعویٰ زباں کا لکھنؤ والوں کے سامنے
اظہار بوئے مشک غزالوں کے سامنے

لیکن اِدھر سے فضا پرسکون ہوئی تو لکھنوی اور غیر لکھنوی کا ہنگامہ شروع ہوگیا۔ اس چپقلش کا باقاعدہ آغاز تو "معرکۂ چکبست و شرر" سے ہوا۔ مگر اس معرکہ کا کفن بھی ابھی میلا نہ ہوا تھا کہ مرزا واجد حسین یاس (یگانہ چنگیزی) سے معرکہ آرائیاں

ﮯ مرزا واجد حسین یاس یگانہ چنگیزی ۱۹۴۸ء کے پولیس ایکشن کے بعد حیدرآباد دکن سے لکھنؤ چلے آئے تھے۔ پیہم صدمات و صعوبات اور اس عظیم انقلاب نے ان کے دل و دماغ کو قریب قریب بیکار کر دیا تھا۔ غالب کے خلاف گستاخانہ مشق سخن کے بعد ان کا ذہن و شعور خدا اور رسولؐ کے خلاف بغاوت پر مائل ہو چکا تھا۔ اسی ذہنی انتشار اور پراگندگی مزاج میں ان کا ذہنی توازن برقرار نہ رہ سکا۔ چنانچہ ۱۹۵۰ء کا ذکر ہے کہ میرے زمانہ قیام دہلی میں ایک دن میرے دوست حضرت سحر عشق آبادی نے مجھے بتایا کہ "یاس یگانہ" نے مجھے کچھ قطعات روزنامہ تیج۔ پرتاپ اور ملاپ میں اشاعت کے لئے بھیجے ہیں جن میں خدا۔ رسولؐ اور قرآن وغیرہ پر کچھ نامناسب اور رکیک طنز ہے۔؟ اور ان کا شدید اصرار ہے کہ انھیں جلد شائع کرا دیا جائے میں نے ان منظومات کو دیکھے بغیر سحر عشق آبادی کو مشورہ دیا کہ وہ ان کے پاگل پن میں نہ آئیں اس سے ملک کی فضا خراب ہونے کے سوا کوئی نتیجہ نہیں ہے!

بات آئی گئی ہوگئی۔ سحر عشق آبادی نے میرے مشورے پر عمل کرتے ہوئے ان قطعات وغیرہ کو کہیں شائع نہیں کیا (باقی صفحہ ۱۲۲ پر)

باقی فٹ نوٹ صفحہ ۱۲۱ _________!

لیکن یاس پر ایک مسلسل جنون کا عالم طاری تھا اور وہ برابر اس تگ و دو میں لگے ہوئے تھے کہ یہ کہیں چھپ جائیں۔ غالباً ہر طرف سے مایوس ہونے کے بعد مارچ ۱۹۵۳ء میں یاس نے چند قطعات مولانا عبدالماجد دریابادی کو بھیجے جو انھوں نے اپنے ایک نوٹ کے ساتھ (بعنوان ایک شاتم رسولؐ اور طاعن قرآن) ۲۷ر مارچ ۱۹۵۳ء کے "صدق" میں شائع کیا ان قطعات کے چھپتے ہی اچانک ہوا کا رُخ بدل گیا اور یاس کے خلاف ایک ایجی ٹیشن پھوٹ پڑا۔ "صدق جدید" اور روزنامہ "حق" لکھنؤ میں کئی ادارتی نوٹ اس کے خلاف نکلے اور اپریل ۱۹۵۳ء کے پہلے ہفتے میں ایک ہنگامہ شروع ہوگیا۔ عام مسلمان نوجوانوں کے علاوہ شیعہ کالج کے طلبہ نے یاس کے گھر پر دھاوا بول دیا۔ بہت تلاش کیا مگر وہ گھر سے برآمد نہ ہوسکے بلکہ قریب ہی ایک کھیت میں چھپے ہوئے ملے!

نوجوان انھیں پکڑ لائے۔ آدھے منہ پر سیاہی اور آدھے پر سرخ رنگ لگایا۔ جوتوں کا ہار پہنایا اور ایک گدھے پر سوار کر کے جلوس کی شکل میں شہر کی گلیوں میں گشت کرایا۔ چونکہ نوجوانوں کی یہ سرگرمیاں غیر قانونی تھیں اس لئے پولیس موقع پر پہنچ گئی کچھ لوگ گرفتار کئے گئے اور ان کے خلاف مقدمہ قائم کیا گیا جس کے صرف ایک دن کی کارروائی ہفت روزہ "سرفراز" لکھنؤ مورخہ ۱۷رمئی ۱۹۵۳ء سے ذیل میں نقل کی جا رہی ہے۔

اس عظیم ذلت کے بعد چاہے یاس کو ہوش نہ آیا ہو؟ پھر بھی انھوں نے روزنامہ "سیاست جدید" کانپور کو ایک "توبہ نامہ" بغرض اشاعت بھیجا تھا جو "صدق جدید" ۲۴ر اپریل ۱۹۵۳ء سے نقل کیا جا رہا ہے۔

مرزا یاس یگانہ چنگیزی ۱۳ر اپریل ۱۹۵۳ء

سلطان بہادر روڈ۔ منصور نگر لکھنؤ

کھلی چٹھی بنام "سیاست جدید" کان پور

جناب من۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ میری کوئی تحریر آپ کے اخبار میں حال ہی میں شائع ہوئی ہے غالباً ۲۸ر مارچ ۱۹۵۳ء کو۔ اگر (مگر) یہ بغیر میری اجازت شائع ہوگئی ہے۔ اس تحریر میں جناب رسالت مآبؐ اور قرآن پاک کے بارے میں خلاف ادب باتیں آگئی ہیں۔ جن سے مسلمانوں کو بہت

(باقی صفحہ ۱۲۳ پر)

بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۱۲۲ ——————— !

رنج پہنچا ہے میں نے جو کچھ لکھا ہے وہ میکشنے سکھانے کے لئے تھا مگر خلاف ادب گفتگو سے جو تکلیف مسلمانوں کو پہنچی اس کا مجھے افسوس ہے۔ میں اس وقت ستر برس کا ہوں. صحت جواب دے چکی ہے مسلسل بیمار رہتا ہوں اور جملہ اہل اسلام سے معذرت خواہ ہوں. خدا اور رسولؐ مجھے معاف فرمائیں۔ انشاء اللہ آئندہ ایسی تحریر کا موقع نہ آئے گا۔

امیدوار دعا

مرزا یگانہ چنگیزی

اب اس مقدمہ کی کارروائی بھی ملاحظہ ہو جسے " یگانہ چنگیزی کی توہین کے الزام میں ملزموں کا عدالت میں چالان" کی سرخی سے اخبار سرفراز لکھنؤ نے شائع کیا تھا۔

لکھنؤ — ۱۳ مئی (۱۹۵۳ء) یگانہ چنگیزی کو گدھے پر سوار کر کے ان کے گلے میں جوتوں کا ہار پہنانے اور ان کے منہ پر تھوکنے کے الزام میں خلیل احمد علی گوہر، کجن، منے اور جمن کے خلاف دو مقدمات میں پولیس نے اپنا چالان عدالت میں داخل کر دیا ہے۔ پولیس سعادت گنج نے ملزمان کے خلاف دفعات ۱۰۷ اور ۱۱۷ کے تحت عدالت میں چالان داخل کیا ہے اور پولیس وزیر گنج نے ان ملزمان کے خلاف دفعات ۳۴۲۔ ۳۵۵ کے ماتحت مقدمہ چلایا ہے۔

ملزمان کی طرف سے مسٹر نذیر احمد ایڈوکیٹ پیروی کر رہے ہیں۔ یاد ہوگا۔ کہ گزشتہ ۳۰ مارچ (۱۹۵۳ء) کو یگانہ چنگیزی کو ان کے گھر سے ملزمان پکڑ لائے اور پہلے ان کو گدھے پر بٹھانے کی کوشش کی اور جب گدھا نہیں چل سکا تو انھیں پیدل جلوس کی شکل میں لے جایا گیا۔ راستے میں ان کے منہ پر تھوکا گیا ان کے گلے میں جوتوں کے ہار پہنائے گئے اور راستہ میں جو ملتا تھا جلوس والے یہ کہتے تھے کہ دیکھو حضرت محمدؐ کو برا کہنے والے کا یہی حشر ہوتا ہے" کہا جاتا ہے کہ یہ سب اسی لئے ہوا کہ یگانہ چنگیزی نے آنحضرتؐ کی شان میں بہت ہی ناروا باتیں تحریر کی تھیں"۔ (سرفراز لکھنؤ۔ ۱۷ مئی ۱۹۵۳ء)

مرزا واجد حسین یاس یگانہ نے ۱۹۵۶ء میں بمقام لکھنؤ قید حیات سے رہائی پائی۔

(نادم سیتاپوری)

شروع ہوگئیں جو نئے نئے عظیم آباد (بہار) سے لکھنؤ پہنچے تھے! اگر یہ ادبی اور علمی مباحث اسی سنجیدگی تک محدود رہتے جو علم و ادب کی شان تھی تب بھی غنیمت تھا۔ عامیانہ اور سوقیانہ گندگی اچھلنے لگی۔ یاسؔ پنڈت جگموہن ناتھ شوق رینہ (ڈپٹی کلکٹر) کے یہاں سیتاپور مشاعرے میں شرکت کے لئے آئے "وضو کرتے۔ رفو کرتے" طرح تھی انھوں نے اپنے رنگ کی ایک اچھی غزل پڑھی مگر حسب عادت مقطع میں" لکھنؤ والوں پر چوٹ کر گئے۔

مزار یاسؔ یہ کرتے ہیں شکر کے سجدے
دعائے خیر تو کیا اہل لکھنؤ کرتے

یہ ابھی سیتاپور سے لکھنؤ واپس بھی نہیں پہنچے! کہ ان کا مقطع پہنچ گیا وہاں! اور وہ بھی اس شان سے کہ ... مصرعہ اولیٰ غائب تھا منچلوں نے اس کی مٹی یوں پلید کردی تھی۔

مزار یاسؔ پہ پیشاب بھی نہیں کرتے
دعائے خیر تو کیا اہل لکھنؤ کرتے

مولانا آسی انھیں ہنگامہ خیز بہاروں میں لکھنؤ پہنچے۔ آدمی جہاندیدہ اور بے غل و غش قسم کے تھے۔ عافیت اسی میں سمجھی کہ "ہیچ آفت نہ رسد ......!"

نولکشور بکڈپو سے رابطہ ملازمت قائم ہوچکا تھا اپنے کاموں میں لگ گئے!

لکھنؤ کی ابتدائی زندگی میں ایک عرصہ تک وہ خاموشی اور گوشہ نشینی کے اکتا دینے والے "دورِ حیات" سے دوچار رہے۔ بہت دھیرے دھیرے دبے پاؤں یہاں کے ادبی ماحول میں پہنچے اور کچھ زمانے کے بعد اپنے ادبی ذوق کی تسکین کے لئے ایک ادبی انجمن بھی قائم کرلی "خاصان ادب" اس کا نام تھا!

مولانا آسی حد درجہ ذہین۔ زود گو۔ قادر الکلام اور مشّاق شاعر تھے! خداوند عالم نے انھیں جن اعلیٰ صلاحیتوں سے نوازا تھا۔ اگر "ناقدری علم و فن" ان صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کا موقع دیتی تو شاید اس عہد کے ممتاز شعرا میں ان کا نام سرِفہرست نظر آتا!

ہر رنگِ سخن پر انھیں قدرت کاملہ حاصل تھی۔ زود گوئی کا حال یہ تھا کہ بات کرتے شعر موزوں کردیتے تھے فن شعر میں انھیں ایسی دستگاہ حاصل تھی کہ اپنے "کثیر حلقۂ تلامذہ" کو انھوں نے فنی اعتبار سے سنوارنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا!

مولانا آسی کی فنی صلاحیتوں کا جائزہ لینے کے لئے گزشتہ دور کے ایک مشہور نقاد سید علی سجاد مہر اکبر آبادی کی "نگاہ بازگشت" کو سامنے رکھ کر ہم ان کے بارے میں بہت کچھ معلومات فراہم کرسکتے ہیں۔

"جناب آسی دور حاضر کے مشاق شعراء میں سے ہیں مگر ابھی آپ کے کلام میں وہ پختگی نہیں ہے جو اساتذہ فن کے یہاں پائی جاتی ہے۔

آپ نے ابتداء میں تقلید اور اتباع ہی کو اپنا رہبر بنایا اور "مختلف رنگوں" کی پیروی کی۔ کبھی ناسخ کے رنگ میں طبع آزمائی کی۔ کبھی حالی کے رنگ میں شعر کہے! کبھی داغ کے رنگ شاعری کو سراہا اور کبھی غالب کی تقلید میں فارسی تراکیب کو اپنے اشعار میں قصداً جگہ دی۔ کبھی اپنی شاعری کو ابہام سے زینت بخشی! اور کبھی ضائع لفظی سے! فلسفہ اور تصوف بھی آپ کی غزلوں کا جزو ثانی رہا ہے — ان باتوں کا جو نتیجہ ہوتا ہے وہ ہوا۔ یعنی صداقت شعری کا عنصر ان کے یہاں بہت ہی کم ہوگیا۔ اور اس کی جگہ غیر حقیقی اور اتباعی شاعری نے لے لی"۔ (صفحہ ۱۳، ماہنامہ نگار لکھنؤ جولائی ۱۹۴۱ء)

مہر کی اس رائے سے کلیتاً اتفاق تو نہیں کیا جاسکتا لیکن یہ واقعہ ضرور ہے کہ ان کی قادر الکلامی کو جس پختگی کی ضرورت تھی وہ "اتباعی اور تقلیدی" جگر کاویوں سے ان میں یقیناً پیدا نہیں ہوسکی پھر بھی ان کا فن ناپختگی کی مصنوعیت سے زیادہ مجروح نہیں ہوسکا فن شعر کی مہارت تامہ اور قادر الکلامی کی اعلیٰ صلاحیتیں جس حد تک ان میں پختگی پیدا کرسکتی تھیں اس میں کسی قسم کی کمی نہیں ہوئی۔! مگر اس کے باوجود تسلیم کرنا پڑیگا کہ مختلف رنگ سخن کی مشق کلامی نے ان کی فنکارانہ عظمت کو بہت حد تک ان ترقیوں سے روک دیا جو ان کا حصہ تھیں۔

جناب مہر نے ان کی "ہمہ رنگی" کا ذکر کرتے ہوئے ان کی زندگی کے جس تار چڑھاؤ کا تذکرہ کیا ہے۔ خود مولانا آسی کو اس سے انکار نہیں۔ اپنے "خود نوشت حالات" میں تحریر فرماتے ہیں۔

"میرا نام عبدالباری تخلص آسی ابن منشی خلیفہ حسام الدین احمد حسام تلمیذ مرزا غالب ابن مولوی شیخ خدا بخش عاجز ابن عبدالحکیم عاشق عرف ننھن معاصر و ہم جلیس میر تقی میر مرحوم "الدن" ضلع میرٹھ تحصیل ہاپوڑ مولد ہے ۱۸۹۳ء

قصبہ مذکور میں جو شرفا کی ایک بہت قدیم بستی ہے پیدا ہوا اور ۱۸۹۸ء میں میرا سلسلہ تعلیم شروع ہوا ابتدائی کتابیں اپنے والد سے پڑھیں۔ فارسی کی تکمیل مولوی حافظ برکت علی سے کی اور عربی کی سید سراج احمد صاحب سراج مرحوم سے۔ مولانا محمود حسن صاحب محدث دیوبندی سے بھی بعض کتب حدیث و فقہ کا استفادہ کیا ۱۹۰۸ء میں دہلی میں حکیم نواب جان مرحوم سے کتب طب پڑھیں اور ان کے مطب میں نسخہ نویسی بھی کرتا رہا۔ ۱۹۱۰ء میں شاہجہانپور میں دو برس تک فارسی پڑھانے پر مامور رہا۔ ۱۹۱۲ء[1] میں اس سے جی گھبرا گیا تو اخبار "ہمدرد" دہلی میں مولانا محمد علی کے یہاں کام کرتا رہا! جس زمانے میں جالب صاحب (دہلوی) اس کے ایڈیٹر تھے۔ میں بھی وہیں تھا۔ ۱۹۱۴ء میں ہمدرد کی مالی حالت نہایت نازک صورت اختیار کر چکی تھی۔ اس لئے وہاں سے دل برداشتہ ہوا اور ۱۴ر دسمبر ۱۹۱۴ء کو لکھنؤ چلا آیا اور اب تک یہیں ہوں! میری شاعری کی ابتداء کسی ترغیب و تشویق کی ممنون احسان نہیں ہوئی بلکہ اس وقت سے جب کہ میں "انشائے خلیفہ و انشائے، مادھورام" وغیرہ پڑھتا تھا۔ شوق کی آگ دل میں لگی ہوئی تھی تا اینکہ ایک روز کہیں جاتے ہوئے یہ شعر خود بخود موزوں ہو گیا۔

کیا تم نے زخمی کیا دل ہمارا　　　بڑا تیر مارا۔ بڑا تیر مارا

یہ واقعہ غالباً ۱۹۰۴ء کا ہے اس کے بعد قریب قریب روز شعر کہتا رہا اور ۱۹۰۶ء تک بغیر کسی تخلص کے مشق سخن جاری رہی۔ ایک روز ایک دوست نے صلاح دی کہ تم "عاصی" تخلص رکھ لو۔ اتفاق سے اسی زمانے میں مولانا سید سراج احمد صاحب مرحوم نے مشق سخن کرنا شروع کی۔ کوئی طرح دیدی اور اس پر سب کو طبع آزمائی کا حکم دے دیا۔ چنانچہ پہلی طرح یہ تھی ؎

---

[1] .... "ہمدرد" دہلی کا باضابطہ شمارہ ۱۲/۱ ار فروری ۱۹۱۳ء کو نکلا تھا۔ اور یہ سلسلہ خاص قرار دیا گیا ہے میرے پاس "ہمدرد" کا جو ابتدائی فائل ہے۔ اس کی پہلی جلد کے تیسرے شمارہ پر ۴ر جون ۱۹۱۳ء تحریر ہے یعنی اس کا پہلا شمارہ یکم جون ۱۹۱۳ء کو نکلا ہوگا۔ (نادم سیتاپوری)

مسافر ہے تو عقبیٰ کا اُمے نادان پردیسی

اس پر میں نے بھی شعر کہے۔ جو اس وقت مجھے یاد نہیں! اب بات چھپنے والی نہیں رہی تھی اس موزوں طبعی کی میرے والد مرحوم کو بھی خبر ہوگئی!

اگر پدر نتواند پسر تمام کند

انھوں نے ایک بار یہ طرح دی!

اٹھاؤ گٹھری سنبھالو بستر کہ رات اب کچھ نہیں ہی ہے

میں نے غزل کہکر سنائی! خوش تو ہوئے مگر کہا کہ ابھی بہت کمی ہے اس کے بعد کبھی کبھی کسی شعر پر اصلاح دیتے رہے! میں بیشتر فارسی کے دیوانوں اور اپنے " پردادا مرحوم" کا دیوان دیکھتا رہا۔ اس وقت نہ اس ضخیم مجلد کتاب سے مجھے کچھ زیادہ لگاؤ تھا نہ ان کے کلام سے کچھ زیادہ لطف اندوز ہوتا۔ بلکہ اس کے حواشی کی عبارتیں دیکھکر مزہ آتا تھا کہیں لکھا تھا کہ یہ غزل میر تقی میر کی غزل پر کہی۔ اور میر صاحب کو سنائی! میر صاحب نے اس کی بڑی داد دی! کہیں یہ تھا میر صاحب نے میری اس غزل پر غزل کہی اور میری غزل سے اچھی نہ کہہ سکے اور میں نے انکے اس شعر پر اعتراض کیے! کہیں قائم کی ملاقات کا حال! کہیں سودا کی بات چیت! غرض فارسی کے دیوانوں اور اس دیوان کو اپنا رہبر بنا رکھا تھا ان کے بعد سب سے پہلے اردو میں مرزا غالبؔ کا دیوان پڑھا اور اس کو اپنے والد سے سمجھا اور اس کے معنی پر پورا عبور حاصل کیا۔ پھر "گلزار نسیم" کو سبقاً سبقاً پڑھا۔ تا اینکہ ۱۹۱۰ء میں مولانا سید ابوالحسن صاحب ناطق سے ملاقات ہوئی۔ مولانا میرے عزیز قریب بھی ہیں۔ اس لئے ان کی ہمشیر کی شادی میں شرکت کیلئے گیا تھا۔ وہاں روز و شب شعر و شاعری کا چرچا رہا اور مولانا کا یہ شعر سنکر

اب اس کو کیا کرے کوئی اگر تم کو نہ باور ہو
بتو کہتا تو جاتا ہوں مسلماں ہو تو کافر ہو

میں اس شعر کو سنکر ایسا وارفتہ ہوا کہ مولانا سے اصلاح کی استدعا کی۔ مولانا نے ازراہ مہربانی منظور فرمایا اور سب سے پہلے میرے تخلص میں اصلاح فرمائی "عاصی" کے بجائے "آسی" تجویز کیا اور اس کے بعد ۱۹۱۴ء سے ۱۹۱۵ء تک اپنا کلام ان کو دکھاتا رہا بعد کو مولانا نے اتنا دل بڑھا دیا کہ جس پر مجھے بذات خود ناز ہے اس حساب سے شاعری کے تین خانوادوں سے فیض یاب ہوا ہوں!

سید سراج احمد صاحب سراج مرحوم تلمیذ بیان یزدانی میرٹھی۔ مولانا منشی شیخ خلیفہ حسام الدین احمد صاحب حسام تلمیذ مرزا غالب مرحوم۔ مولانا سید ابوالحسن صاحب ناطق تلمیذ مرزا داغ..... میں نے اس بات کو خود نظر انداز کر دیا ہے کہ میں نے براہ راست دو غزلوں پر داغ مرحوم سے بھی اصلاح لی۔ جو شاید اب بھی میرے پاس محفوظ ہوں مگر اصل استفادہ ناطق صاحب کی ذات سے حاصل کیا۔

میں نے شاعری کی مختلف شاخوں اور مختلف اسکولوں کا اتباع کیا۔ ابتدا میں ناسخ کے رنگ پر بہت سی غزلیں کہیں بعدہٗ اس کی قباحتیں ذہن نشین ہوئیں تو مولانا حالی کے رنگ میں شعر کہے! ایک زمانے میں یہ سودا ہوا کہ ہر شعر میں کوئی محاورہ نظم ہونا چاہئے ایک زمانے میں ایہام و تناسب مرغوب طبع رہا جس کی مولانا ناطق نے تنبیہی الفاظ میں سخت ممانعت کی۔ اس کے بعد مرزا داغ کے رنگ میں نہایت رنگین اور روزمرہ میں ڈوبے ہوئے شعر کہنے لگا۔ ۱۹۱۳ء ۱۹۱۴ء ۱۹۱۵ء کی غزلیں قریب قریب سب اسی انداز کی ہیں مگر ۱۹۱۴ء میں لکھنؤ آگیا۔ اس وقت یہاں "انجمن معیار" کا زور و شور تھا اور اساتذہ لکھنؤ مرزا غالب کے رنگ میں طبع آزمائیاں فرما رہے تھے میں بھی اسی مروجہ شاہراہ پر چل نکلا اگرچہ بعد کو بہت جلد میری سمجھ میں آگیا کہ۔

کائیں رہ کہ تو میری ترکستان است

میں نے بین دبکا اور رجاء کی شاعری کو الوداع کہدیا اس کے بعد فلسفیانہ انداز مرغوب ہوا مگر جلد تر یہ معلوم ہوگیا کہ اگر شاعری کو محض فلسفہ اور تصوف کی جولانگاہ بنا دیا جائے تو شاعری سے اس کو دور کا لگاؤ بھی نہیں ہوتا۔

میرؔ کے انداز سخن کا میں پہلے بھی شیدائی تھا اور اب بھی ہوں مرزا غالبؔ اور مرزا داغؔ کا رنگ میرے لئے پہلے بھی قابل اتباع تھا اور اب بھی ہے مگر ان سب میں سے کسی کا پابند نہیں -! اب میرا مذہب شعر یہ ہے کہ شعر خواہ کسی کے طرز پر ہو! کیسی ہی نادر ترکیبیں، بہترین الفاظ اور بدیہہ استعارات اور تشبیہیں اس میں صرف کی گئی ہوں مگر پھر بھی کوئی ندرت بیان اثر جوش کلام ضرور شامل ہو! اگر اس کی تہہ میں ایک قسم کی شگفتگی - طنز - کنایہ تعریض وغیرہ کی جھلک بھی نظر آجائے تو سبحان اللہ! شاعر اگرچہ اصناف سخن میں سے کسی ایک صنف خاص کا زیادہ دلدادہ ہو تو کوئی ہرج نہیں مگر اسکی مشق ہر صنف کلام میں ہونا چاہئے - عشق و محبت کے جذبات - اثر و تاثیر سے کوئی خالی نہوں - پھر اثر کے معنی صرف سوگوارانہ بیان اور موت کے تلخ منظر پیش کرنا نہیں جیسا کہ اکثر حضرات کا خاص دستور ہے کہ پوری غزل میں کوئی شعر ایسا نہیں ہوتا کہ وہ سوائے مرگ مایوسی کے زندگی کے ایک خوش انجام لمحے کی بھی تصویر پیش کر سکے! یہی میرا خیال ہے اور انھیں باتوں پر نگاہ رکھتے ہوئے میں شعر کہتا ہوں - میرا کلام غزل، نظم، قصیدے، مثنوی، رباعیات وغیرہ تمام اصناف سخن میں بہت کافی ہے - مگر رباعی اور غزل میری سب سے زیادہ محبوب چیز ہے۔

میری تصانیف میں اکثر ناول بھی ہیں - اور شرح دیوان غالبؔ جو دو حصوں پر مشتمل ہے شرح تحفۃ العراقین - ترجمہ و شرح دیوان حافظ ترجمہ فرہنگ آنندراج لغت اردو - اور تین تذکرے خاص چیزیں ہیں اور عام تصنیفات کی تعداد تیس بتیس تک پہنچتی ہے - جن کو صراحتاً لکھنا بیکار ہے۔

میرے شاگردوں کی تعداد سو ڈیڑھ سو تک ہے - یوں تو سب خوش فکر و خوش گو ہیں - مگر شوکتؔ تھانوی - امینؔ سلونوی - عمرؔ انصاری - شہیدؔ بدایونی - زخمیؔ لکھنوی - اسرؔ الہ آبادی - آرزوؔ لکھنوی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

زبان کے متعلق میرا خیال ہے کہ صرف لکھنؤ یا دہلی کا زباندان یا اہل زبان ہونا قابل استناد و لائق فخر نہیں! بلکہ دہلی اور لکھنؤ دونوں شہروں کی زبان پر

کم از کم اتنا عبور ضرور رہو کہ وہ دونوں زبانوں میں فرق و امتیاز کرسکے میری ابتدائی مشق کے دو دیوان مرتب ہوچکے تھے مگر اب میں انھیں ضائع کرچکا اب ایک دیوان اردو غزلیات کا۔ ایک نظموں اور ایک رباعیات کا تیار ہے جن کی طبع کی نوبت ہنوز نہیں آئی البتہ قطعات اور رباعیات کا مجموعہ "بصائر" چھپ چکا ہے۔ (صفحات ۱۴۳۲-۱۴۳۴ نقوش لاہور آپ بیتی نمبر)

مولانا آسی کی شعری صلاحیتوں کو جن تدریجی ادوار سے گذرنا پڑا اس کی بہت کچھ روداد آسیؔ کے متذکرہ خود نوشت حالات میں ملتی ہے اور اس سے یہ اندازہ لگانا دشوار نہیں کہ ان کی زندگی کا بڑا حصہ اس تلاش و تجسس میں گذرا کہ انھیں ناسخ کا رنگ اختیار کرنا چاہئے یا داغ اور غالبؔ کا؟ اور کافی مدت تک وہ کسی فیصلہ کن منزل پر پہنچے بغیر اپنی اعلیٰ صلاحیتوں کو مشق سخن کی ان لامحدود وادیوں میں بھٹکاتے پھرے جہاں مختلف رنگوں کی گوناگوں دلفریبیاں بھی تھیں اور مشکلات بھی! جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں ان کی قوت فیصلہ کی اس "بے راہ روی" کا زیادہ تر انحصار ان مختلف ادوار کے ادبی و شعری ذوق اور قبول عام پر تھا! شروع شروع میں انھوں نے یہ محسوس کیا کہ آنیوالا وقت ناسخ اور داغ کے بنائے ہوئے راستوں کی طرف بڑھتا نظر آرہا ہے۔ تو انھوں نے یہی مناسب سمجھا کہ وقت سے ہم آواز ہونے کے لئے انھیں دونوں رنگوں میں طبع آزمائی کرنا چاہئے؟ لیکن اندازہ غلط نکلا؟ زمانہ کچھ اور آگے بڑھ چکا تھا لکھنؤ پہنچ کر انھوں نے حالات کا جائزہ لیا تو یہاں ناسخ کے قدیم رنگ کی ناقدری نظر آئی! "معیار ادب" نے لکھنؤ اسکول کی جس پرانی روشنی کو ترک کرنے کی تحریک کا آغاز کیا تھا اس کا جھکاؤ غالبؔ کی طرف تھا اس لئے انھوں نے بھی اپنا رنگ بدلنے کی کوشش کی اور اسی خاص رنگ میں طبع آزمائی شروع کردی! اور خود ان کے بیان کے مطابق ان کی فکر شعری آخرکار اسی منزل پر جا کر رک گئی!

ان کی زندگی کا جو ابتدائی زمانہ دلیؔ میں گذرا تھا اس ماحول نے۔ نیز ان کے استاد ناطق گلاوٹھوی (تلمیذ داغ) نے ان کی قوت فکر کو داغ کے رنگ شاعری کی طرف بھی متوجہ کیا۔ انھوں نے اس رنگ میں بہت کچھ کہا لیکن دلیؔ کے اسی ماحول نے یہ بھی پیشگوئی کی تھی کہ اس دلیؔ میں داغ کے سوا ایک شاعر اور بھی گذرا ہے غالبؔ! جس کی مقبولیت

روز بروز بڑھتی جا رہی ہے ان کا گہرا مطالعہ اور فلسفیانہ مزاج اپنی ابتدائے مشق سخن سے خود بھی غالبؔ پسندی کی طرف مائل تھا اس پیشن گوئی نے اس پر اور بھی جلا کی۔ یہاں تک کہ لکھنؤ پہنچکر انھوں نے اپنی منزل مقصود پالی۔ اور وہ تھا غالبؔ کا انداز فکر و بیان! چنانچہ ان کے یہ اشعار اسی رنگ کی غمازی کرتے ہیں۔

واہمہ عِلاق اور آزادی کا حسن سرور
ہر فریبِ رنگ کا پہلے گلستاں نام تھا

جنوں نقاش وہم زیست ہے دھوکا کھا غافل
مقید کر دیا ہے تجھ کو اِک کاخ مصوّر میں

جراحت ہائے دل میں۔ برق ہیں گلہائے خنداں میں
بہر صورت وہ انداز تبسّم کار فرما ہے

شوخیاں معمورۂ ہستی کی حد سے بڑھ چلیں
پھینک دوں دو چار ذرّے اپنے ویرانے سے کیا؛

خوشی شرم نگاہِ مصلحت اندیش کی ورنہ
مجھے منظور تھا رسوا سر بازار ہو جانا

موجد طرز ہے ہر وحشی آشفتہ مزاج
سو کے بسو طرح کے دامان گریباں ہوتے

دیدۂ خونبار افشاں میرا ان کے سامنے
بیخودی کے ہاتھ سے چھوٹا ہوا اک جام تھا

نقاشیٔ فریب معاصی نہ پوچھئے
جنت بنا کے رکھدی گنہگار کے لئے

لکھنؤ میں مولانا آسی کا ابتدائی زمانہ بہت کچھ گوشہ نشینی اور خاموش تصنیفی مشاغل میں گذرا۔ اس میں سب سے پہلے بہار اس وقت آئی جب ۱۹۲۶ء میں حضرت وصل بلگرامی یہاں پہنچے اور ماہنامہ "مرقع" کا دفتر "امین آباد" کے علاقہ میں قائم کیا! اس

وقت تک لکھنؤ کی ادبی چہل پہل "علاقہ چوک" تک محدود تھی۔ اس دور کے شعرا اور ادبا اپنی ادبی سرگرمیوں کا صحیح مرکز اسی قدیم لکھنؤ کو سمجھتے تھے جہاں ایک زمانے میں میر تقی میر، مرزا رفیع سودا، انشا، اللہ خاں انشا۔ خواجہ حیدر علی آتش۔ شیخ امام بخش ناسخ میر انیس۔ مرزا دبیر۔ نسیم۔ سرشار۔ شرر اور جانے کتنے عظیم فنکاروں نے زندگی کے بھلے برے دن بتائے تھے! یہ علاقہ اب "پیام یار" والے منشی نثار حسین جیسے "سراپا انجمن" سے تو خالی ہو چکا تھا لیکن خواجہ عبدالرؤف عشرت لئے ہوئے لکھنؤ کی آخری بہاروں کی یاد تازہ کرنے کے لئے ضرور زندہ تھے۔ ان کی چھوٹی سی کتابوں کی دوکان پر اب شبلی اور سرشار وغیرہ تو نظر نہیں آتے تھے پھر بھی اس عہد کے لکھنؤ میں جتنے باکمال باقی تھے کسی نہ کسی وقت یہاں ضرور پہنچتے تھے۔ اور لکھنؤ ہی پر کیا منحصر! لکھنؤ آنیوالے تمام ادبی سیاح جہاں میر و سودا انیس و دبیر کے مزارات تک پہنچنے کی کوشش کرتے وہاں عشرت کی دوکان پر بھی اپنے آپ کو پہونچانا ضروری سمجھتے تھے۔

وصل بلگرامی اور نیاز فتحپوری کے لکھنؤ پہنچنے پر امین آباد کے علاقہ کی چہل پہل بہت بڑھ گئی۔ ایک طرف تو مولانا آسی کی ادبی سرگرمیوں میں "انجمن خاصان ادب" کے قیام کے بعد ایک خاص قسم کا وزن پیدا ہو گیا تھا۔ دوسری طرف مولوی محمد صدیق کے صدیق بکڈپو نے اس علاقے میں ایک نئی ادبی زندگی کا آغاز کر دیا تھا۔ صدیق بکڈپو کی طرف سے ماہنامہ "انتخاب" کے نام سے ایک رسالہ بھی نکالا گیا جو اس دور میں لکھنؤ کا ایک کامیاب معیاری ماہنامہ تھا۔ سید مقبول حسین وصل بلگرامی مرحوم مستقل طور پر لکھنؤ پہنچ ہی چکے تھے "مقبول المطابع" کے نام سے ان کا ایک پریس گونڈہ میں ان کے بھائی چودھری سید مرتضیٰ حسین چلا رہے تھے وصل نے لکھنؤ سے ماہنامہ "مرقع" جاری کیا جو اپنے رنگ کا ویسا ہی رسالہ تھا جیسا معیاری ادبی ماہنامہ "نیرنگ" کے نام سے رام پور سے نکل رہا تھا۔

اسی دور میں ڈاکٹر عظمت الٰہی مرحوم کے ماہنامہ "دنیا" اور اخبار "قیامت" نے لکھنؤ میں بڑی دھوم مچائی! ڈاکٹر عظمت الٰہی مرحوم سلون (ضلع رائے بریلی) کے رہنے والے تھے۔ آدمی نہایت ہی دلچسپ اور کار آمد! مولانا آسی کے نیازمندوں میں انھیں ممتاز

مقام حاصل تھا۔ بیک وقت ہومیو پیتھ ڈاکٹر۔ اشتہاری دوا فروش۔ شاعر۔ ادیب۔ ناولسٹ جرنلسٹ غرضکہ سبھی کچھ تھے! شاعر ہوں یا نہوں لیکن ان کے نام کے ساتھ "عامل" تخلص ضرور لگا ہوا تھا۔ یہ پہلے شخص تھے جنھوں نے لکھنؤ میں پہلی بار دہلوی قسم کا کاروبار شروع کیا تھا۔ ان کی تصانیف میں جہاں "رسالہ قوتِ باہ عظمتی" نامی کتاب شامل تھی وہاں کئی ناول بھی: فریبی عاشق۔ دام فریب۔ خونی لڑکا۔ نواب ۱۲ ۲۰ اور بدنصیب لڑکی وغیرہ! اس قسم کے ناولوں کا اس زمانے میں بڑا اچھا مارکٹ تھا ان صحافتی اور ادبی سرگرمیوں کے علاوہ عظمت الٰہی مرحوم "عظمت بکڈپو" کے بھی مالک تھے اور ایک اشتہاری دواخانہ "عظمت العلاج" بھی چلاتے تھے! "عظمت بکڈپو" کا دفتر کہاں تھا اس کا تو پتہ میں کبھی نہ لگا سکا لیکن "ہنسی کا پٹارا" قسم کی کتابوں کا اشتہار برابر نظر سے گذرتا رہا۔ ایک روپیہ یا دو روپیہ میں بیس پچیس ناول بھی فروخت ہوتے تھے اور ایک روپیہ سالانہ چندہ والا ماہنامہ "دنیا" بھی!

وصلؔ مرحوم بڑے باغ و بہار قسم کے آدمی تھے میرے ہی ضلع (سیتاپور) کے ایک گاؤں "لکڑیا مؤ" (تحصیل مصرکھ) کے رہنے والے تھے اس گاؤں کے قرب و جوار میں ان کی اچھی خاصی زمینداری تھی۔ چونکہ یہ بچپن ہی سے اپنے نانہال بلگرام میں رہے اس لئے اپنے نام کے ساتھ آخر وقت تک اس نسبت کو قائم و برقرار رکھا! لکھنؤ سے جب انھوں نے "مرقع" نکالا تو "نظیر آباد" کی ایک گلی میں ایک کرایہ کا مکان لیا اسی میں رہتے بھی تھے اور اسی کے ایک حصہ میں "مرقع" کا دفتر بھی تھا!

"صدیق بکڈپو" تو امین آباد کے علاقہ میں ایک ادبی مرکز کی حیثیت رکھتا ہی تھا۔ لیکن وصلؔ مرحوم کے آنیکے بعد ان کا گھر شاعروں اور ادیبوں کا سب سے بڑا مرکز بن گیا۔ اس زمانے تک "علاقہ امین آباد" اپنی نئی سج دھج کے اعتبار سے لکھنؤ کے متوسط طبقہ کے لئے جاذب توجہ بن چکا تھا۔ سہ پہر کے وقت لکھنؤ کے تمام شعراء اور ادیب اب "چوک" کے مقابلہ میں امین آباد کی طرف زیادہ نظر آتے تھے۔ "امین آباد پارک" اس وقت تک صرف پارک ہی تھا اس کے مغربی اور مشرقی گوشوں سے بیک وقت اذان اور ناقوس کی صدائیں بلند ہوا کرتی تھیں! "گھنٹہ گھر" کے ارد گرد ہری ہری گھاس کے مخملیں فرش پر لکھنوی تہذیب کی جلوہ آرائیاں مچلتی نظر آیا کرتی تھیں۔ غریب بھی امیر بھی! بڑے بھی چھوٹے بھی! مولوی بھی منچلے

بھی. شاعر بھی ادیب بھی۔ اس "حمام" میں سبھی ایک رنگ میں نظر آتے تھے۔ گنجان آبادیوں کی گھٹی ہوئی فضاؤں سے نکل کر اس پارک ہی میں انھیں سانس لینے کا موقع ملتا تھا!

اگلی وضعداریوں کی قدریں اس وقت تک بہت کچھ زندہ تھیں اکثر شعراء اور ادیب مولوی محمد صدیق کے "صدیق بکڈپو" تک پہنچنے کو اپنے معمولات میں شامل سمجھتے تھے اور پھر یہاں کی اکھڑی ہوئی صحبتیں وصل بلگرامی کے یہاں جاکر کچھ دیر کے لئے ادبی نشستوں میں تحلیل ہو جاتیں! مولانا آسی پابندی کے ساتھ وصلؔ مرحوم کے یہاں جایا کرتے تھے ان کے ساتھ ان کے شاگرد بھی ہوتے تھے اور دوست بھی!

یہ نشستیں باقاعدہ مشاعرہ تو نہیں تھیں لیکن چرچے زیادہ تر ادبی اور شعری ہی رہتے! جہاں مولانا آسیؔ پہنچے ان کا استقبال ہی کچھ اس انداز میں کیا جاتا ہے کہ ساری فضا قہقہوں سے گونج اٹھتی!

"کوئی تازہ کلام غالبؔ"!

اور مولانا مسکراتے ہوئے ان قہقہوں کی گونج میں اپنی وہ غزلیں سنایا کرتے تھے جو غالبؔ کے رنگ میں انھوں نے تازہ کہی تھیں! اور یہ "تازہ کلام غالبؔ" وہی الحاقی کلام ہے جسے کچھ دنوں کے بعد مولانا آسیؔ نے "مکمل شرح دیوان غالبؔ" میں سمو کر اس کی شرح بھی لکھدی!

جس زمانے کی یہ باتیں ہیں میں بھی تقریباً مستقل طور پر لکھنؤ ہی میں رہتا تھا خود مجھے ان نشستوں میں شرکت کا تو کبھی اتفاق نہیں ہوا لیکن ان تاریخی نشستوں کی دلچسپ روداد سے کان نا آشنا نہیں ہیں۔ ان صحبتوں کے عینی شاہدوں سے بھی ابھی دنیا خالی نہیں ہوئی ہے چنانچہ حضرت جلیلؔ قدوائی کے مندرجہ ذیل بیان کو ان حقائق کی مستند ترین اور معتبر شہادت میں پیش کیا جاسکتا ہے جن کی عظیم ادبی شخصیت نہ کسی تعارف کی محتاج ہے اور نہ ان کی محتاط نگاری پر کسی سوئے ظنی کی گنجائش!

حبیب محترم حضرت جلیلؔ قدوائی نے اس واقعہ کا تذکرہ اپنے ایک نجی خط میں کیا ہے جس کے ضروری حصے درج ذیل ہیں۔

خط

ORANGI HILLS SCHOOL
B/85, BLOCK, P, NORTH NAZIMABAD
JALIL. KIDWAI, M.A, (MANAGAR)
KARACHI-18 DATD- ۲۱ جولائی ۱۹۶۳ء

پیارے نادم صاحب - تسلیم

یاد آوری کا شکریہ - مگر آپ کے خط سے یہ نہیں معلوم ہوا کہ جو خط میں نے آپ کو خواجہ صاحب کے ساتھ بھیجا تھا ملا یا نہیں؟ بلکہ نہ ملنے کا زیادہ گمان معلوم ہوتا ہے۔ خدا کرے آپ اپنے پچھلے صدمات کے اثرات سے آزاد ہو چکے ہوں!

..... تو خیر ان حالات میں میں نے لکھنا پڑھنا ترک کر دیا اور عرصہ تک یعنی ..... ۱۹۵۰ء تک جب میں پاکستان کے "محکمہ مطبوعات" میں ایک ایسے منصب پر آیا جس میں علمی و ادبی صلاحیتوں سے کام لیا جا سکتا تھا۔ خاموش رہا۔! یوں بھی اختلافی مسائل پر یا کسی کے موافق یا خلاف خواہ مخواہ کبھی کچھ نہ لکھتا تھا۔ ہاں پرائیویٹ تحریروں میں کسی کے پوچھنے پر اس مسئلہ کو جتنا جانتا تھا کبھی نہ چھپایا چنانچہ "مالک رام" نے پوچھا مصر سے! انھیں وہاں لکھا؟ عرشی صاحب سے اس مسئلہ پر خط و کتابت ہوئی مگر ان کے مرتبہ "دیوان غالب" کے ایڈیشن کے بعد۔ اسی طرح آپ سے اس کا ذکر کیا۔ اور مزید تحقیق کی ضرورت ہو تو علیگڈھ میں خواجہ مسعود علی ذوقی موجود ہیں

غالباً ۱۹۲۴ء یا ۱۹۲۵ء میں ہم یعنی میں اور ذوقی لکھنؤ کئی بار ساتھ گئے یا رہے ہے! مرحوم وصل بلگرامی ان دنوں .... سے بہت سا روپیہ اینٹھ کر لائے تھے۔ اور "مرقع" نکالا تھا۔ "نظیر آباد" کی ایک گلی میں شاندار دو منزلہ مکان کرایہ پر لیا تھا۔ ریاض صاحب (خیرآبادی) بھی وہاں تھے۔ ہوش بلگرامی بھی آتے رہتے تھے! نیاز صاحب (فتح پوری) نے بھی "نگار" کا ابتدائی کاروبار لکھنؤ میں وصل صاحب ہی کے ذریعہ اور اشتراک سے جمایا تھا تا آنکہ وہ جم گئے اور وصل اکھڑ گئے! بہر حال وصل کے ہاں ادبا و شعرائے لکھنؤ کا شام کے وقت جمگھٹ رہتا تھا۔ فرداً فرداً بھی یہ حضرات آتے رہتے تھے۔ آثر صاحب صفی صاحب۔ سراج۔ شوکت (تھانوی) اور نہ جانے کون کون! آسی صاحب معہ اپنے نیازمندوں کی ٹولی کے ساتھ تشریف لاتے تھے اور ان کے کلام سے زیادہ غالب کے غیر مطبوعہ کلام کو سنانے کی فرمائشیں ہوتی تھیں۔ یوں کہ ایک قہقہہ کے ساتھ کہا جاتا۔! آیئے ــ آیئے! کہئے کچھ اور غیر مطبوعہ کلام غالب؟

اور وہ مسکرا کر یا ہنستے ہوئے سنانا شروع کر دیتے! یہ بات سامعین میں سے ہر شخص کو معلوم تھی کہ آسی غالب کے طرز پر لکھنے کی بڑی مشق رکھتے ہیں۔ اور ہم سب کے لطف کی خاطر ایسی غزلیات سناتے ہیں ــــ!

کچھ دنوں بعد میں نے ان میں سے چند چیزیں 'نگار' میں شائع شدہ دیکھیں تو افسوس ضرور ہوا مگر حیرت نہیں ہوئی ....! اب جن ڈاکٹر صاحب کی خاندانی بیاض سے غالب کا یہ غیر مطبوعہ کلام منسوب کیا جاتا ہے ان سے کہا جائے کہ وہ بیاض کہاں ہے؟ ہمیں دکھاؤ! کسی کتب خانے یا میوزیم کی نذر کر دو۔ فروخت کر دو! ہندوستان میں نہیں میں اسے خریدنے یا فروخت کرنے کا انتظام کر دوں گا! اور اگر میرا یہ اندیشہ غلط ہے تو ایسی غلط باتوں کا تذکرہ ختم ہو جائے گا۔ حقیقت سب پر عیاں ہو جائے گی۔ ایک مبہم و مشکوک واقعہ کی چھان بین ہو جائے گی۔ اگر میں غلطی نہیں کرتا تو یہ ڈاکٹر صاحب بھی آسی صاحب کے ہمزاد کے طور پر ہر وقت ساتھ رہتے تھے! ان کا نام مجھے یاد نہیں! جن ڈاکٹر صاحب کا میں ذکر کر رہا ہوں وہ دبلے پتلے لانبے سے تھے چہرہ بھی دبلا پتلا بلکہ سُتا ہوا جو قدرے بے ہنگم معلوم ہوتا تھا۔ داڑھی نہیں تھی۔ لمبی مونچھیں تھیں جنھیں نوک دار بناتے تھے۔ پان کھاتے تھے۔ مسکراتے رہتے تھے۔ اور طلاء بیچتے تھے۔ اپنی سلونوی شاید نشاندہی کر سکیں۔ وہ ٹولی کچھ اسی قسم کے لوگوں کی تھی۔ میں "علی گڑھ میگزین" کا جوائنٹ ایڈیٹر تھا اور ۱۹۲۵ء کے یادگار علی گڑھ جوبلی کے موقع پر میگزین کا خاص نمبر نکالنے کے سلسلہ میں لکھنؤ کے اہل قلم سے مضامین اور شعراء سے ان کا کلام حاصل کرنے گیا تھا یہ ڈاکٹر صاحب مجھ سے ملے میگزین کے اسی نمبر میں اپنی دواؤں کا اشتہار نکلوانا چاہتے تھے۔ میں نے انکار کر دیا ــــ اگر ان ڈاکٹر صاحب کی خاندانی بیاض سے یہ کلام برآمد ہوا ہے تو میں نہیں کہہ سکتا کہاں تک معتبر ہے؟

میں نے اپنے "نسخہ قدوائی" ـ کلام غالب میں غالب کا جو انتخاب کیا ہے اس وقت یہ مشکل پیش آئی کہ "الحاقی حصہ" میں سے کیا لیا جائے کیا نہ لیا جائے؟ سبھی پڑھا۔ جو اچھا معلوم ہوا اس میں سے چند غزلوں کے بارے میں تقریباً پینتیس ۳۵ برس بعد) میرا حافظہ (جسقدر) بتا سکا کہ انھیں آسی صاحب نے سنایا تھا اسے چھوڑ دیا۔ باقی

غزلوں سے چند اشعار لے لئے! کیا کرتا؟

..............!

امید کہ آپ کا مزاج بخیر ہوگا۔ وہ چند دن جو ہم نے آپ کے ساتھ گذارے برُے ہوں یا بھلے! شکوہ شکایتوں سے بھرے ہوئے ہوں یا شکر و سپاس سے! "بھتے یادگار عرصہ"! بہت عرصہ تک یاد آتے رہیں گے۔ خدا کرے آپ بھی یاد رکھیں!

آپ کا نہایت مخلص دعاگو

"جلیل"

پتہ:۔ بخدمت مجبی حضرت نادم سیتاپوری زاد لطفہ، محلہ قضیارہ۔ سیتاپور
اتر پردیش (بھارت)

مرسلہ:۔ انجمن ترقی اردو۔ اُردو روڈ۔ کراچی

چھ سال قبل کا لکھا ہوا یہ خط جب مجھے موصول ہوا تھا اس وقت یہ کتاب ترتیب کے بالکل ابتدائی مراحل میں تھی ۱۹۶۵ء میں اس کتاب کا پہلا ایڈیشن ہندوستان میں اس وقت شائع ہوا تھا جب ہندو پاک کے تعلقات میں ایک شدید بحران پیدا ہو چکا تھا اسی وجہ سے یہ کتاب پاکستان نہیں پہنچ سکی اور نہ میں حضرت جلیل قدوائی کی خدمت میں پیش کر سکا۔

اب اسی موضوع پر حضرت جلیل قدوائی کا جو تفصیلی مضمون سہ ماہی "اُردو" کراچی کے غالب نمبر (جنوری، فروری، مارچ ۱۹۶۹ء) میں شائع ہوا ہے۔ اس حقیقت کا غماز ہے کہ یہ کتاب ان کی نظر سے نہیں گذری۔ پھر بھی قدوائی نے اس سلسلے کی جو تفصیلات اپنے مضمون میں پیش کی ہیں وہ نظر انداز نہیں کی جا سکتیں۔ چنانچہ اس مضمون کو (تقریباً) من و عن نقل کر رہا ہوں تاکہ اس سانحہ کی مکمل تصویر سامنے آجائے۔

" غالباً ۱۹۲۳ء کا واقعہ ہے، میں علی گڑھ میں ایف اے کی جماعت کا طالب علم تھا۔ میرے عزیز دوست خواجہ

خواجہ مسعود علی ذوقی اور میں چھٹیوں میں عموماً ایک ساتھ سفر کرتے تھے۔ میں راستے میں اپنے سابق وطن آنا ؤ یا کانپور جہاں میرے اعزا رہتے تھے۔ ٹھہر جاتا اور وہ آگے براہ لکھنؤ اپنے مستقر گونڈہ چلے جاتے۔ کبھی وہ کچھ دن میرے ہمراہ ٹھہر کر گونڈہ جاتے، کبھی ہم دونوں اپنے اپنے مستقروں پر کچھ دن قیام کرکے لکھنؤ میں جمع ہو جاتے۔ اسی زمانے میں انھوں نے مجھے وصل بلگرامی مرحوم سے ملایا[۲] جو کچھ دن پہلے گورکھپور میں مولوی سبحان اللہ صاحب مرحوم[۳] کے حسن سلوک سے فیض یاب ہو کر لکھنؤ آئے تھے اور انھوں نے نظیر آباد میں ایک خوش قطع دو منزلہ مکان کرایہ پر لے کر اپنا ماہنامہ "مرقع" نکالنا شروع کیا تھا۔

کوئی پچاس کا سن، لانبا قد، گول سرخ و سفید چہرہ (جس پر خشخشی سے قدرے زیادہ بڑی، گول، کھچڑی داڑھی تھی)، ہونٹ ہمہ وقت مسکراہٹ کے سبب خاصے

---

[۱] اپنے زمانے کے بیحد ذہین طالب علموں اور ترقی پذیر افسانہ نگاروں اور شاعروں میں تھے۔ غزل سے زیادہ نظم سے دلچسپی رکھتے تھے۔ اب منقار زیر پر ہیں۔ تعلیم سے فراغت پانے کے بعد علی گڈھ مسلم یونیورسٹی اسکول کے ہیڈ ماسٹر ہوئے، پھر یونیورسٹی ٹریننگ کالج میں رہے۔ اب وہیں شعبۂ اردو میں استاد ہیں۔

[۲] دیسے غالباً ۱۶-۱۹۱۵ء میں جب میں گیارہ بارہ برس کا تھا اور ہردوئی (اودھ) کے ہائی اسکول میں چوتھی یا پانچویں جماعت کا طالب علم تھا، انفیس مولوی نورالحسن نیر، وکیل (بعدہٗ صاحب نوراللغات) کے ہاں جہاں میں اپنے ایک عزیز مولوی یاسین علی مرحوم کے ساتھ جو ان دنوں میری تعلیم کے نگراں تھے اور وہائٹ گنج میں نیر صاحب کے ہم محلہ تھے جایا کرتا تھا۔ دو ایک بار دیکھ چکا تھا، اس وقت وصل صاحب کیا کرتے تھے، یہ یاد نہیں آتا۔ نیر صاحب ہردوئی کی ایک آنہ فنڈ کمیٹی برائے فلاح مساجد کے صدر یا معتمد تھے اور سالانہ جلسوں میں وصل صاحب کو اپنے ساتھ رکھتے تھے۔ وہ جلسے بھی کیا شاندار ہوتے تھے جن میں علاوہ دوسرے مشاہیر علما کے مولانا شاہ سلیمان پھلواری کی یادگار تقریریں ہوتی تھیں۔ موصوف ضعیف تھے اور ڈائس پر آرام کرسی رکھ دی جاتی تھی، اسی پر لیٹے لیٹے تقریر فرماتے تھے۔

[۳] رئیس اعظم گورکھپور، بیگم سروری عرفان اللہ اور میرے مرحوم دوست معین الحق، ایڈووکیٹ کے خسر، جن کی علم دوستی اور دریا دلی کا ثبوت وہ شاندار اور گراں بہا کتب خانہ ہے جو موصوف نے علی گڈھ مسلم یونیورسٹی کی نذر کر دیا۔ حضرت ریاض خیرآبادی کو مہاراجہ سر محمد علی محمد خان آف محمود آباد کی سرپرستی کے علاوہ مولوی صاحب کی بھی اس حد تک قدر دانی حاصل تھی کہ ان کے اس مطلع پر آپ نے مبلغ دو ہزار روپے عطا کئے تھے۔

شکل معشوق کی، انداز ہیں دیوانوں کے   گل مرقع ہیں ترے چاک گریبانوں کے

کھلے ہوئے (جن کے اندر پان کھانے کے باوجود سفید چمکدار تبسیی نمایاں رہتی تھی) موٹا مگر ڈھیلا بدن، چوڑی مہریوں کا سفید پاجامہ، بغیر بنیان کے سفید ہی ڈھیلا کرتہ (جس کے اندر ان کا سرخ بدن جھلکتا تھا اور شیروانی نہ پہنے ہونے کی صورت میں وہ ہاتھ ڈال کر بدن کھجاتے اور باتیں کرتے رہتے تھے)، ڈھیلی شیروانی، ترکی ٹوپی، ذہانت کم مگر عام سمجھ بلا کی، مزاج میں متانت سے زیادہ ٹھٹھول، جلد جلد باتیں کرنے کا انداز، شعرگوئی واجبی مگر شعرا کے لئے ہمیشہ کشادہ آغوش، خاطر مدارات میں طاق، مجلس آرا وغیرہ وغیرہ۔ یہ تھے وصل بلگرامی مرحوم!

پہلی ملاقات کے بعد ہی ان سے بے تکلفی کے تعلقات قایم ہو گئے۔ ان کی ذات دوسروں کو خواہ مخواہ اپنی طرف کھینچتی تھی۔ دیر آشنائی انھیں چھو نہیں گئی تھی۔ چنانچہ کبھی میں تنہا، کبھی میں اور ذوقی دونوں ان کے ہاں جانے اور ٹھہرنے لگے۔ پھر ان سے تعلقات اتنے بڑھ گئے کہ ہمارے خانگی معاملات میں دخیل ہونے لگے۔ رسالہ "مرقع" تو نکالتے ہی تھے خاص بات یہ تھی کہ ان کے ہاں وقتاً فوقتاً اچھے اچھے شعراء اور اہل علم آتے اور ٹھہرتے رہتے تھے اور مقامی شعرا تو تقریباً ہر شام کو جمع ہوتے اور سخن آرائی کا سلسلہ رات گئے تک رہتا۔ وصل صاحب کا دسترخوان وسیع تھا۔ ہر کھانے پر ان کے مہمان اور وقتی طور پر آئے ہوئے آٹھ دس احباب ضرور ہوتے اور ناشتہ اور چائے وغیرہ کا تو کوئی حساب نہ تھا۔ قابل ذکر مہمانوں میں کبھی کبھی رامپور سے ہوش بلگرامی آتے تھے۔ ایک بار علی گڈھ سے واپسی پر اصغر صاحب بھی مہمان رہے مگر غالباً دو ہی ایک روز ریاض صاحب (خیرآبادی) کو بھی وہاں مہمان دیکھا۔ عزیز، صفی (مگر ایک ساتھ نہیں)، اثر (لکھنؤ میں ہوئے تو)، صفدر مرزا پوری، امید امیٹھوی، سراج، امین سلونوی، حکیم آشفتہ، آسی وغیرہ شام کے آنے والوں میں تھے، خصوصاً موخرالذکر جو مطبع منشی نولکشور میں ملازم تھے اور اپنا کام ختم کرکے اپنے بعض شاگردوں یا عقیدت مندوں کے ہمراہ وہاں سے سیدھے وصل صاحب کے ہاں آجاتے۔

ایک بار شام کی نشست میں آسی صاحب کا کلام سننے کے بعد کسی نے ان سے چانک کچھ اس قسم کا سوال کیا "کہیے آسی صاحب، غالب کا غیر مطبوعہ کلام کچھ ہوا؟" میں

نے یہ سمجھا کہ مروجہ دیوان غالب کے بعد جو کلام دستیاب ہو چکا ہے، موصوف اس پر کچھ کام کر رہے ہوں گے یا مزید غیر مطبوعہ کلام کی تلاش میں ہوں گے، اس کے بارے میں پوچھا جا رہا ہے۔ مگر جس آسانی، برجستگی نیز سنجیدگی اور تبسم کے ملے جلے انداز میں جواب دیا گیا اس نے مجھ پر معاملے کی حقیقت کچھ کچھ واضح کر دی آسی صاحب نے اس طور پر جواب دیا "جی کیوں نہیں؛ پچھلے دنوں تھوڑا بہت ہوا ہے وہ پیش کرتا ہوں"۔ یہ کہا اور ایک آدھ غزل یا اشعار ایسے سنائے جن پر بلاشبہ غالبؔ کے فن کی چوٹ پڑتی معلوم ہوتی تھی۔ میری نوجوانی کے زمانے میں بعض احباب غالب کی تقلید میں مزاحاً بے معنی، مغلق قسم کے اشعار ضرور کہتے تھے مگر غالب کے رنگ میں سنجیدگی کے ساتھ کہے ہوئے اور بامعنی اشعار سننے کا یہ میرا پہلا اتفاق تھا۔ میں شبے میں پڑ گیا۔ مگر یہ دیکھ کر اطمینان ہوا کہ سبھی حاضرین نے اس کو وقت گذاری اور تفنن طبع کے طور پر ایک لطیفہ سمجھا اور بس۔

اس کے بعد دو ایک بار پھر لکھنؤ جانا ہوا۔ وصل صاحب کے ہاں قیام یقینی تھا اور آسی صاحب سے ملاقاتیں اس سے بھی زیادہ یقینی، جن میں ان سے غالبؔ کا غیر مطبوعہ کلام بھی ضرور سنا جاتا۔ حالت یہ ہو گئی تھی کہ اِدھر آسی صاحب داخل ہوئے اُدھر ان کے نیازمندوں نے (جن میں اب راقم بھی شامل ہو چکا تھا) بے تاب ہو کر فرمائش کی "آسی صاحب! کچھ غالب کا غیر مطبوعہ کلام"؟ اور انھوں نے حسب معمول، بلا کسی رسمی تکلف کے اپنے مخصوص تبسم کے ساتھ سنانا شروع کر دیا۔

۱۹۲۵ء کے وسط میں پھر لکھنؤ گیا۔ ذوقی کو ساتھ لیا۔ اس سال دسمبر میں ہماری یونیورسٹی کی تاریخی جوبلی منائی جانے والی تھی اور اس موقعے پر بشیر صدیقی صاحبؔ[1] کو اور مجھے بحیثیت ایڈیٹر و جائنٹ ایڈیٹر علی گڑھ

---

[1] رشید صدیقی صاحب کے برادر نسبتی، بعد میں شبلی کالج اعظم گڑھ کے پرنسپل ہو گئے تھے۔ تقسیم کے بعد پاکستان آئے اور بورڈ آف سکنڈری ایجوکیشن کراچی کے سکریٹری ہوئے۔ اب عرصے سے پنشن لے کر کراچی میں گوشہ گیر بلکہ صحیح معنوں میں پناہ گیر ہیں:

ہیچ آفت نہ رسد گوشۂ تنہائی را

میگزین جوبلی نمبر[1] شائع کرتا تھا۔ چنانچہ لکھنؤ کے اس سفر کا مقصد وہاں کے شعرا واہل قلم سے ان کے نمونہ ہائے کمالات، تصاویر، دیگر نوادر وغیرہ حاصل کرنا تھا اور اس کام میں خاصی کامیابی ہوئی۔ اس مرتبہ بھی حسب معمول وصل صاحب کے یہاں قیام ہوا۔ آسی صاحب سے ملاقات ہوئی اور غالب کا غیر مطبوعہ کلام سنا گیا۔ اس بار آسی صاحب کے ساتھ ایک اور صاحب سے ملاقات ہوئی۔ چکنے چپڑے، مانگ پٹی سے آراستہ، منہ میں پان کی گلوری کے باوجود گالوں میں گڑھے، دبلے پتلے اور لانبے، لانبی ہی نکیلی مونچھیں، ستا ہوا چہرہ چمک دار آنکھیں جن میں کاجل کی باریک تحریر، قدرے میلا سفید چوڑی دار پاجامہ، مٹیالے رنگ کی شیروانی ہاتھ میں بس بٹیر کی کسر تھی، مسکراتے ہوئے ملے بلکہ ملائے گئے۔ معلوم ہوا ڈاکٹر عظمت الٰہی ہیں، طلا فروشی کرتے ہیں[2]۔ اور میگزین کے جوبلی نمبر میں اپنے کاروبار کا اشتہار شائع کرانا چاہتے ہیں! حضرت نے پچاس روپے بھی پیش کئے مگر ظاہر ہے ہم نے فی الفور معذوری کا اظہار کیا۔ ان سے عرض کیا "جناب! آپ میگزین میں اپنا اشتہار شائع کرانا چاہتے ہیں یا ہمیں یونیورسٹی سے نکلوانا چاہتے ہیں"؟

ایک مدت کے بعد جب میں طالب علمی کا زمانہ ختم کر کے زندگی کی مکروہات

---

[1] یادگار چیز تھی، اب نایاب ہے، میرے پاس بھی نہیں۔ اس میں علامہ اقبال کی وہ تصویر شامل تھی جس میں شاعر مشرق نظریہ تکوین اضافت کا مطالعہ فرما رہے ہیں۔ چھوٹی تصویر تھی مگر سب سے پہلی۔ اس کی بڑی تصویریں بعد میں شائع ہوئیں۔ علامہ نے میری درخواست پر سجاد حیدر یلدرم مرحوم کے ذریعے، جنھوں نے سفارش کی تھی، اس نمبر کے لئے اپنی تصویر خاص طور پر بھیجی تھی، مع خط اور ایک فارسی غزل کے۔ ان دونوں چیزوں اور تصویر کے بلاک ایک ہی صفحہ پر شائع ہوئے تھے۔ خط میں راقم کا شکریہ بھی ادا کیا گیا تھا۔ غزل کا مطلع تھا۔

نیابی در جہاں یارے کہ داند دل نوازی را
بہ خود گم شو، نگہدار آبروئے عشق بازی را

[2] طلا یا اسی قبیل کے کسی چکر میں ماخوذ ہوئے، سزا پائی اور اسی حالت میں موت واقع ہوئی۔ خدا غریق رحمت کرے۔

میں پھنس گیا، وہ زمین رہی نہ وہ آسمان، میرا علی گڈھ کا قیام ترک ہوا، لکھنؤ آنا جانا ختم ہوا اور دہلی، شملہ، لاہور وغیرہ میرے مستقر رہنے لگے تو انھیں ڈاکٹر عظمت الٰہی کی ایک خاندانی بیاض کے حوالے سے آسی صاحب کی دریافت کے طور پر نیاز صاحب[1] نے 'نگار' میں غالب کا غیر مطبوعہ کلام شائع کیا بعد میں کچھ اور چیزیں شامل کر کے آسی صاحب نے اُسے کلام غالب کا ایک مستقل حصّہ بنا دیا۔ پھر ایک طویل عرصہ گزر گیا اور تقسیم ہند کے بعد جناب عرشی رامپوری نے بھی اپنے مرتبہ دیوان غالب میں یادگار نالہ کے ذیل میں آسی کے حوالے سے اس تمام کلام کو شامل کر لیا۔ اُس کے معتبر ہونے میں ضرور شبہہ ظاہر کیا مگر کن اسباب کی بنا پر یہ انھوں نے نہیں لکھا؟

سوال پیدا ہوتا ہے کہ اتنے دنوں تک ایک ایسے اہم علمی واقعے کے بارے میں میں نے 'کتمان حقیقت' سے کیوں کام لیا اور ادبی دنیا میں یہ دھاندلی ہوتی رہی اور میں اپنے ہونٹوں پر مہر سکوت لگائے کیوں بیٹھا رہا؟ مگر معاملہ صرف اتنا نہیں ہے۔ اس سلسلے میں مجھے تفصیل سے اپنے ذاتی حالات و واقعات بتانے ہوں گے، مگر میں دیکھتا ہوں کہ اس مضمون میں پہلے ہی اصل موضوع کے علاوہ بہت سی ضمنی، اگرچہ خاصی ضروری اور معلومات افزا باتیں جمع ہو گئی ہیں۔ مختصراً صورت حال یوں ہے کہ بعض نہایت سنگین اسباب اور زندگی

---

[1] 'مرقع' کے شباب ہی کے زمانے میں 'نگار' کو بھوپال سے لکھنؤ لے آئے تھے بلکہ ابتدائی ایام دفتر 'مرقع' اور وصل صاحب ہی کے ہاں گزارے تھے۔ کچھ دن یہ مسئلہ بھی زیر غور رہا کہ دونو رسالے ایک ہی انتظام کے تحت آجائیں۔ مگر جہاں تک یاد ہے صرف طباعتی امور کی حد تک 'نگار' وصل صاحب کی زیر نگرانی رہا وہ بھی چند ماہ تک، جس کے بعد نیاز صاحب ان سے کلیتاً علیحدہ ہو گئے۔ پھر آہستہ آہستہ 'نگار' جمنے اور ترقی کرنے لگا اور 'مرقع' نے دم توڑ دیا۔ لکھنؤ میں وصل صاحب کا جیسا شاندار آغاز ہوا تھا، ان کا انجام اتنا ہی حسرت ناک ہوا۔ کاروبار ختم ہو گیا، احباب نے ساتھ چھوڑ دیا اور قیصر باغ کے ایک چھوٹے سے کمرے میں بیکسی و تنہائی کی حالت میں کمر اور پشت کے ایک نہایت گہرے زخم کی بدولت، جو سردی سے بچنے کے لیے چارپائی کے نیچے رکھی ایک دہکتی ہوئی انگیٹھی کی وجہ سے پڑ گیا تھا، ختم ہو گئے۔

کی ناانصافیوں اور محرومیوں کی وجہ سے میں عرصے تک اردو شعروادب سے بیزار رہا حتیٰ کہ کوئی سولہ سترہ برس تک میں نے اردو کی باقاعدہ خدمت سے کنارہ کشی اختیار کرلی۔ ان ناموافق حالات نے پاکستان کے قیام کے کچھ عرصے بعد پلٹا کھایا، چنانچہ جب ہی سے مجھے ادب کی طرف واپس آنے کی توفیق ہوئی، اگرچہ ظاہر ہے کہ ایسی حالت میں کہ قلم زنگ آلود ہوگیا تھا اور اس کی روشنائی خشک ہوچکی تھی۔

اگر میں نے اب تک یہ واقعہ کسی 'مقالے' کی شکل میں قلم بند نہیں کیا اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں نے اسے اپنے نہاں خانۂ دل ہی میں مقید رکھا۔ اس دوران میں جن جن اہل قلم سے بات چیت ہوئی میں نے ان سے اس کا تذکرہ کیا۔ مجبی مالک رام نے اسکندریہ سے اس کے بارے میں تحریری طور پر دریافت کیا تو میں نے انھیں بے کم و کاست صورت حال سے مطلع کردیا۔ جناب عرشی سے بھی اس مسئلے پر خط وکتابت ہوئی۔ اگرچہ سوٗ اتفاق سے ان کے تاریخی نسخے کی اشاعت کے بعد۔ نادم سیتاپوری صاحب پاکستان آئے تو ان سے اس موضوع پر بات چیت ہوئی اور بعد میں انھیں اس واقعہ کا حال لکھ کر بھی بھیج دیا۔ آج کل حامد اللہ افسر کا کراچی میں قیام ہے۔ ان سے اس سلسلے میں گفتگو ہوئی۔ انھوں نے نہ صرف اس واقعے کی مکمل تائید کی بلکہ ڈاکٹر عظمت الٰہی کے مقدمے اور موت کا قصہ انہی سے معلوم ہوا۔ اصل میں میرے علاوہ اس دور کے متعدد اشخاص کو بشمول ذوقی جن کا ابتدائے مضمون میں ذکر کیا گیا، یہ واقعہ معلوم ہے مگر تعجب ہے کہ کسی اور اہل قلم نے بھی اس کے بارے میں اب تک کچھ نہیں لکھا۔

۱۹۶۰ء میں اپنے مخدوم سید ہاشمی فریدآبادی مرحوم کی مشاورت سے بابائے اردو کی مجوزہ نود سالہ جوبلی کے موقع پر ان کی خدمت میں اپنی طرف سے پیش کرنے کے لئے میں نے غالب کا نئی ترتیب کے ساتھ ایک انتخاب شائع کیا۔ اس کا تاریخی نام کلام غالب۔ نسخۂ قدوائی اور ذیلی فقرہ 'پیش کش جشن نود سالہ بابائے اردو' ہاشمی صاحب ہی کے عطا کردہ ہیں، جن سے علی الترتیب ۱۹۶۰ء اور ۱۳۸۰ھ کے اعداد برآمد ہوتے ہیں۔ یہ انتخاب سارے کا سارا ان کی نظر سے گذرا ہوا بلکہ ان کا منظور کردہ ہے۔ انتخاب کی غایت اصلی یہ تھی کہ شاعر کو علمی تحقیقی اور علمی حلقوں ہی میں محدود رہنے دیئے جانے کی بجائے عام قاری حضرات میں بھی زیادہ

سے زیادہ مقبول بنایا جائے تاکہ جہاں تک ممکن ہو ہر چھوٹا بڑا، پڑھا لکھا شخص غالبؔ سے مستفید اور لطف اندوز ہو سکے۔ اسی لئے انتخاب بنیادی طور پر صرف اُردو کلام، وہ بھی شاعری کی مقبول عام صنف غزل تک محدود رکھا گیا۔ اس کے دیباچے میں بھی غیر مطبوعہ کلامِ غالب سے اپنی واقفیت کے بارے میں اشارتاً کچھ عرض کر دیا تھا۔

اس وقت ہمارے سامنے یہ بڑا سوال تھا کہ چوں کہ غالب کے تمام اُردو غزلیہ کلام کو سامنے رکھ کر انتخاب کرنا تھا، غیر مطبوعہ غزلیات کے اس حصے کے بارے میں کیا رویہ اختیار کیا جائے۔ ہم نے بہت غور کیا اور ہماری متفقہ رائے یہ ہوئی کہ اس کلام پر بھی ضرور نظر ڈال لی جائے مگر چونکہ اتنا عرصہ گذر جانے کے بعد میرے لئے ایک ایک شعر کے بارے میں یہ حکم لگانا دشوار تھا کہ یہ معتبر ہے اور وہ غیر معتبر، بالخصوص میرے سنے ہوئے کلام کے علاوہ اور کلام بھی آسیؔ سے منسوب ہو چکا تھا، اصول یہ طے ہوا کہ جو میرا سنا ہوا کلام یاد آئے اسے ترک کر کے باقی کے سلسلے میں آسیؔ اور نیازؔ کو شبہ کا فائدہ دے کر اس کلام سے بھی انتخاب کر لیا جائے، چنانچہ یہی کیا گیا۔ مجھے اعتراف ہے کہ یہ سو فیصد معقول طریق کار نہ تھا مگر اس کے سوا چارۂ کار بھی کیا تھا؟

عرشی صاحب کو بہ حیثیت مجموعی یہ انتخاب پسند آیا۔ مگر غیر مطبوعہ کلام کے انتخاب کے سلسلے میں، شاید اس لئے کہ اس سے پہلے میں انھیں آسیؔ سے منسوب کلام کو غیر معتبر بتا چکا تھا، جب انھیں اس اصول سے مطلع کیا گیا تو ان کی خاطر خواہ تشفی نہیں ہوئی۔ میں یہ عرض کرنے کی جسارت کروں گا کہ اس احتساب میں موصوف نے میرے ساتھ قدرے سختی روا رکھی ہے، اس لئے کہ خود اپنے مرتبہ دیوانِ غالب میں اس امر کا اقرار کرتے ہوئے بھی کہ انھیں بعض اشعار کے بارے میں الحاق کا شبہ ہے، انھوں نے ایسے سارے اشعار شامل کر لئے ہیں۔"

(سہ ماہی اُردو کراچی غالب نمبر)

جیسا کہ حضرت جلیل قدوائی نے تحریر فرمایا ہے اس "تازہ کلام غالبؔ" کا لطیفہ انھوں نے (تقریباً ۲۷-۲۸ برس ادھر) جناب مالک رام کو بھی سنایا۔ چنانچہ وہ تحریر فرماتے ہیں۔

"۱۹۳۶ء کی بات ہے۔ میں اس زمانے دلی میں تھا۔ جناب جلیل قدوائی صاحب ان دنوں مرکزی حکومت ہند کے محکمہ اطلاعات عامہ میں ملازم تھے۔ یہیں میری ان سے ملاقات ہوئی اور بتدریج ہمارے تعلقات بہت گہرے ہو گئے۔ آسی مرحوم نے اس سے تھوڑی مدت (غالباً ۳۱ء یا ۳۲ء) ہی پہلے یہ کلام غالب کے نام سے شائع کیا تھا۔ ایک دن جلیل صاحب اور میں بیٹھے گپ کر رہے تھے کہ اس کلام کا ذکر آ گیا۔ تو انھوں نے فرمایا (روائیت بالمعنیٰ) یہ کلام غالب کا نہیں۔ بلکہ آسی کا ہے۔ اس کے متعلق ایک مرتبہ میری گفتگو خود آسی سے ہوئی تھی۔ انھوں نے مجھ سے کہا! کون غالب؟ میں نے خود یہ غزلیں کہہ کے غالب سے منسوب کر دی ہیں! غالب کے رنگ میں کہنا کیا مشکل ہے؟ (صفحہ ۱۴۸۔ سہ ماہی فکر و نظر علی گڈھ جنوری ۱۹۶۱ء)

حضرت جلیل قدوائی نے اپنے محولہ بالا خط میں جن "ڈاکٹر صاحب" کا ذکر فرمایا ہے وہ بلا شبہ یہی ڈاکٹر عظمت الٰہی مرحوم تھے جن کا ذکر اوپر آ چکا ہے۔ اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ بذاتہٖ انھیں شعر و ادب سے کوئی خاص لگاؤ نہیں تھا۔ میری ان سے اچھی خاصی ملاقات تھی۔ زندگی بھر وہ بیچارے شدید مالی مصائب کا شکار رہے اور زندگی کی اسی جدوجہد میں وہ کبھی یکسوئی کے ساتھ اپنے لئے کوئی راستہ متعین نہیں کر سکے۔ یہاں تک کہ ان صدمات نے انھیں (غالباً) دق کے مہلک مرض سے دوچار کر دیا اور بالآخر انھیں علائق دنیا کے شدائد سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لئے موت کی پناہ میں جانا پڑا۔ صحیح تو نہیں کہہ سکتا لیکن میرا خیال ہے کہ ان کی وفات کو بھی بیس پچیس برس تو ضرور گذر گئے ہوں گے!

مولانا آسی کو مختلف طرز سخن پر اتنا عبور حاصل تھا کہ انھوں نے کبھی "سنجیدگی" کے ساتھ نہ تو غالبؔ کے کمال فن کو تسلیم کیا اور نہ ناسخ کے فن کا اعتراف کیا بلکہ ۱۹۲۸ء میں جب نگار نے "غالب بے حجاب" کے عنوان سے "نرگس" کے فرضی نام سے ایک سلسلہ

مضامین کا آغاز کیا تو لکھنؤ بھر میں عام طور پر یہی شہرت تھی کہ ان مضامین کے لکھنے والے حقیقتاً مولانا عبدالباری آسی ہی ہیں اور اپنے ذاتی مصالح کی بنا پر انھوں نے "آرگس" کا لبادہ اوڑھ لیا ہے؟ ہوسکتا ہے کہ "یہ شہرت عامہ" کچھ دنوں بعد بلا کسی تصدیق کے اپنی موت آپ مرجاتی اور عوام کا کمزور حافظہ ماضی کی تلخیوں کو بھلانے میں کامیاب ہوجاتا۔ لیکن مولانا آسی ان جوابات کی تاب نہ لاسکے جو "غالب بے نقاب" کے سلسلے میں لکھے گئے! ان جوابات کا سلسلہ بہت دنوں تک جاری رہا۔ حتیٰ کہ مولانا آسی کے ضبط و صبر کا پیمانہ لبریز ہوگیا اور وہ اپنے ذاتی ماہنامہ "سخنور" (لکھنؤ) میں ایسے مضامین لکھنے لگے جن سے صاف طور پر ان نظریات کی تائید ہوتی تھی جنھیں آرگس کے فرضی نام سے پیش کیا جاچکا تھا۔ مثال کے طور پر مولانا آسی کے مضمون "غالب اور تکرار مضامین" کے مندرجہ ذیل الفاظ اسی انداز فکر کی ترجمانی کرتے ہیں جن کو غالب بے نقاب میں پیش کیا جاچکا تھا۔

یہ مضمون ماہنامہ "سخن ور" لکھنؤ (بابتہ جون ۱۹۳۴ء) میں مولانا آسی ہی کے نام سے چھپا تھا جو اس کے ایڈیٹر بھی تھے مولانا آسی تحریر فرماتے ہیں۔

"چنانچہ "آرگس" کے نام سے جو ایک مضمون "غالب بے نقاب" کے نام سے ۱۹۳۲ء کے رسالہ "نگار" میں نکلا تھا۔ اس میں یہ خیال ظاہر کیا گیا تھا کہ مرزا کے یہاں کافی طور پر تکرار مضامین کا ذخیرہ ملتا ہے۔ مگر بعض حضرات نے اس "شدید لہجے" کے ساتھ اس سے اختلاف کیا کہ "الاماں"۔! بہرلوع میں آج اسی قسم کے مضامین ناظرین کے سامنے پیش کرنا چاہتا ہوں جن میں غالب نے دو خیالوں میں کہیں صرف نئے الفاظ سے تفریق پیدا کردی ہے اور کہیں اسلوب بیان سے۔! کہیں فارسی کو اردو میں لے آئے ہیں۔ کہیں اردو کو فارسی میں لے گئے ہیں۔ کہیں یہ سب کچھ نہیں بلکہ خیال کی تکرار تقریباً ویسے ہی الفاظ میں ہے اور ان میں کوئی تغیر نہیں! کہیں خیال کی بنا ایک ہی خیال پر ہے مگر دو شعروں میں ہونے سے ان کی فروع میں کچھ اختلاف پیدا ہوگیا ہے۔ (صفحہ ۴ ماہنامہ سخن ور لکھنؤ جون ۱۹۳۴ء)

کیا مولانا آسی کے مندرجہ بالا الفاظ اور خیالات اس حقیقت کا کھلا ہوا اعتراف نہیں کہ ماہنامہ نگار میں "آرگس" کے فرضی نام سے جو مضامین شائع ہوئے وہ ان کے اور صرف ان کے لکھے ہوئے تھے!

"غالب بے نقاب" کا سب سے زیادہ مدلل اور مکمل جواب پروفیسر بیخود موہانی نے "آرگس بے حجاب" کے زیر عنوان دیا تھا۔ جو بعد میں ان کے تحقیقی و تنقیدی مضامین کے مجموعہ "گنجینۂ تحقیق" میں بھی شامل کر دیا گیا۔ اور یہی مضمون مولانا آسی اور پروفیسر بیخود موہانی کے ذاتی تعلقات میں کشیدگی کا سب سے بڑا سبب بنا تھا۔ ایک بار نہیں متعدد بار پروفیسر بیخود موہانی یہی کہتے سنے گئے کہ مولانا آسی نے ایک طرف تو شرح غالب" (مکمل شرح نہیں) لکھکر غالب کی ہجو ملیح کرنے کی کوشش کی ہے دوسری طرف "آرگس" کے فرضی نام سے غالبؔ کے خلاف ایک غیر ادبی قسم کی گندگی بھی اچھالی ہے جو کسی طرح ان کی شایان شان نہ تھی۔!

اور یہ حقیقت اتنی زبان زد خاص و عام ہو چکی تھی کہ جب مولوی اقبال سہیل اعظمی نے "گنجینۂ تحقیق" پر تبصرہ کیا تو وہ بھی اسے نظر انداز نہ کر سکے۔

سہیل اعظمی نے لکھا تھا۔

> "تیسرا مضمون سرمایہ تحقیق یا "آرگس بے حجاب" بھی غالب ہی کے متعلق ہے اور اس مضمون کا جواب ہے جو کسی "معشوق" نے اہل نظر کے خوف سے "آرگس" کا نقاب ڈال کر "غالب بے نقاب" کے عنوان سے ماہنامہ "نگار" (لکھنؤ) میں شائع کیا تھا اور جس پردۂ زنگاری کی آڑ سے فریب خوردگان کو دکھانے کی کوشش کی تھی کہ غالبؔ کے تمام بہتر اشعار در اصل بزرگان سلف کی "متاع مسروقہ" ہیں۔ حالانکہ خود یہ مضمون بھی یا تو جناب یاسؔ عظیم آبادی کے اس مضمون کا چربہ ہے جو آج سے چند سال بیشتر معتقدین غالب سے انتقام لینے کے لئے شائع کیا گیا تھا یا جناب آسی کی شرح دیوان غالب کی صدائے بازگشت۔!"

(ماہنامہ معارف اعظم گڑھ نومبر ۱۹۳۰ء شمارہ ۵ جلد ۲۶)

مولانا آسی نے تقریباً ۱۹۳۰ء میں غالب کے متداول دیوان کی شرح لکھی جسے پہلی بار "صدیق بکڈپو" نے شائع کیا افسوس اس کا کوئی نسخہ اس وقت میرے سامنے نہیں اس کے بعد ہی اس "تازہ کلام غالب" کا سلسلہ شروع ہو گیا چنانچہ انھوں نے "مکمل شرح دیوان غالب" کے نام سے ایک دوسری شرح تحریر فرمائی اور یہ بھی "صدیق بکڈپو" کی طرف سے شائع کی گئی۔

تین سو اٹھارہ صفحات کی اس "مکمل شرح کلام غالب (مجلد) کے سرورق پر غالب کی اسی عکسی[۱] تصویر کا فوٹو بلاک دیا گیا ہے جس کے متعلق حضرت نیاز فتح پوری یہ انکشاف فرما چکے ہیں۔

"نگار کے غالب نمبر میں مرزا نوشہ کی جو تصویر شائع ہوئی ہے وہ کوئی تاریخی یا فنی حیثیت نہیں رکھتی۔ میں نے ایک مشہور آرٹسٹ محمد حکیم صاحب سے بنوائی تھی اور اس کا ایک بلاک تیار کر کے "نگار" میں شائع کر دیا تھا۔"

(مرقع غالب مطبوعہ اسرار کریمی پریس الٰہ آباد)

"مکمل شرح کلام غالب" کے سرورق پر تصویر صرف ایک ہی دیگئی ہے لیکن کتاب کے اندر صفحہ ۴۸ کے بعد ہی سہ رنگی بلاک اسی آب و تاب سے شائع کیا گیا ہے جیسا آپ کو مجنّی خیر بہوروی کے "مرقع غالب" میں نظر آئے گا یہ وہی تصویر ہے جس کے نیچے غالب کا یہ شعر لکھا ہوا ہے۔

یہ مسائل تصوف یہ ترا بیان غالب
تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

مجلد کتاب کے دوسرے سرورق پر اس شرح کی اہم خصوصیت کا ذکر اس سیاق و سباق کے ساتھ کیا گیا ہے۔!

مکمل شرح دیوان غالب ــــ یعنی

---

[۱] "جعلی تصویریں" کے زیر عنوان جناب ڈاکٹر مختار الدین احمد آرزو "احوال غالب" میں تحریر فرماتے ہیں "شرح کلام غالب مصنفہ عبدالباری آسی مرحوم اور (ماہنامہ) نگار "غالب نمبر" میں مرزا کی جوانی کی جو تصویر شائع کی گئی ہے اس کی کوئی اصلیت نہیں اور قطعاً فرضی ہے۔" (صفحہ ۲۲۴۔ احوال غالب)

غالبؔ کے غیر مطبوعہ کلام کی مفصل اور مکمل شرح

اسی سرورق سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ یہ کتاب "صدیق بکڈپو" نے اشاعت العلوم پریس فرنگی محل لکھنؤ میں چھپوائی تھی کسی سرورق یا خاتمہ کتاب پر سن طباعت نہیں ہے اس کا پتہ صرف مولانا آسی کے اس مقدمہ سے چلتا ہے جو صفحہ ۲ سے شروع ہوکر صفحہ ۴۸ پر ختم ہوتا ہے اور اختتام پر "عبدالباری آسی۔ ۵ مارچ ۱۹۳۱ء لکھنؤ" تحریر ہے جو اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ یہ کتاب ۱۹۳۱ء میں طباعت کے مراحل طے کرکے یقیناً بازار میں آگئی ہوگی ـــ غالب کی ان دونوں عکسی تصاویر کے علاوہ صفحہ ۴۸ کے بعد غالب کی رنگی تصویر سے پہلے آرٹ پیپر کے پورے صفحہ پر مولانا آسی کی قدآدم عکسی تصویر بھی موجود ہے۔

مولانا آسی کا مقدمہ صفحہ ۴۸ پر ختم ہوتا ہے اور صفحہ ۴۹ سے شرح کلام کا آغاز ہوتا ہے جس میں بعنوان جلی لکھا ہوا ہے۔

"اشعار غیر مطبوعہ دیوان غالب"

اور اس کے بعد "از غزل" ـــ !

نقش فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا

اور شرح کا آغاز اس شعر سے کیا گیا ہے۔

لذّت ایجاد ناز افسون عرض ذوق قتل
نعل آتش میں ہے تیغ یار سے نخچیر کا

اس جلی عنوان کے بعد کتاب بھر میں کوئی دوسرا جلی یا خفی عنوان ایسا نہیں ہے جس سے یہ ظاہر ہوتا ہو کہ اس "مکمل شرح" میں غیر مطبوعہ اشعار کے علاوہ ایسے اشعار بھی شامل ہیں جو اس سے قبل کہیں شائع ہو چکے ہیں لیکن اس کے باوجود مندرجہ ذیل اشعار کے سامنے حاشئے میں (لائن کے باہر) پھر نجانے کیوں "غیر مطبوعہ" تحریر کیا گیا ہے جن اشعار کے سامنے "غیر مطبوعہ" لکھا ہے ان کی تعداد صرف ۱۴ ہے اور اگر ان اشعار کے ہم ردیف و ہم قافیہ اشعار کی تعداد بھی شامل کرلی جائے تو کل پچھتّر شعر ہوتے ہیں۔

۱۔ بد تر از ویرانہ ہے فصل خزاں میں صحن باغ ۵ شعر
(ص ۱۴۱) خانۂ بلبل بغیر از خندۂ گل بے چراغ

۲- کرم ہی کچھ سبب لطف و التفات نہیں
(ص- ۱۸۹) انھیں ہنسا کے رلانا بھی کوئی بات نہیں ۵- شعر

۳- جوں شمع ہم اک سوختہ سامان وفا ہیں
(ص- ۱۹۰) اور اس کے سوا کچھ نہیں معلوم! کہ کیا ہیں ۹- شعر

۴- وضع نیرنگیٔ آفاق نے مارا ہم کو
(ص- ۲۰۱) ہو گئے سب ستم و جور گوارا ہم کو ۶- شعر

۵- حسن بے پروا گرفتار خود آرائی نہ ہو
(ص- ۲۰۲) گر کمیں گاہ نظر میں دل تماشائی نہ ہو ۶- شعر

۶- وفا جفا کی طلب گار ہوتی آئی ہے
(ص- ۲۴۵) ازل کے دن سے یہ اے یار ہوتی آئی ہے ۴- شعر

۷- نمائش پردہ دار طرز بیداد تغافل ہے
(ص- ۲۴۹) تسلی جان بلبل کے لئے خندیدن گل ہے ۵- شعر

۸- بھولے ہوئے جو غم ہیں انھیں یاد کیجئے
(ص- ۲۵۰) تب جا کے ان سے شکوۂ بیداد کیجئے ۷- شعر

۹- ہم سے خوبان جہاں پہلو تہی کرتے رہے
(ص- ۲۵۲) ہم ہمیشہ مشق از خود رفتگی کرتے رہے ۵- شعر

۱۰- درد ہو دل میں تو دوا کیجے
(ص- ۲۵۳) دل ہی جب درد ہو تو کیا کیجے ۷- شعر

سکوت و خامشی اظہار حالِ بے زبانی ہے

۱۱- کمین درد میں پوشیدہ راز شادمانی ہے ۶ شعر

(ص-۲۵۵-۲۵۶) وخود خود نمائی رہن ذوق جلوہ آرائی

بوہم کامرانی جذب دل کو شادمانی ہے

۱۲- کس کی برق شوخیٔ رفتار کا دلدادہ ہے ۵ شعر

(ص-۲۵۶) ذرہ ذرہ اس جہاں کا اضطراب آمادہ ہے

۱۳- اس جور و جفا پر بھی بدظن نہیں ہم تجھ سے ۵ شعر

(ص-۲۵۸) کیا طرفہ تمنا ہے امید کرم تجھ سے

ان اشعار کے سامنے (حاشیہ پر) جس طور سے "غیر مطبوعہ" کا لفظ تحریر کیا گیا ہے اس سے یہ معلوم کرنا سخت دشوار ہے کہ جن اشعار کی شرح کی گئی ہے ان میں بقول مولانا آسیؔ کتنے غیر مطبوعہ ہیں اور کتنے اشعار "نسخہ حمیدیہ" سے لئے گئے ہیں؟ سرسری مطالعہ سے اس "غیر مطبوعہ" کے ابہام کو صاف کرنا کچھ آسان کام نہیں ہے؟ مولانا آسیؔ نے اپنے اس مقدمہ میں مطبوعہ اور غیر مطبوعہ اشعار یا غزلوں کی کوئی خاص صراحت نہیں کی ہے بلکہ مقدمہ کی عبارت سے یہی شبہہ ہوتا ہے کہ اس شرح میں جتنے اشعار زیر بحث لائے گئے ہیں وہ "غیر مطبوعہ" ہی ہیں۔

حالانکہ واقعہ یہ نہیں ہے۔ "نسخہ حمیدیہ" کا تذکرہ اور ڈاکٹر بجنوری مرحوم کے مقدمہ پر تبصرہ کرتے ہوئے مولانا آسیؔ نے ایک جگہ پر مجملاً اس کا ذکر بھی کیا ہے کہ اس مکمل شرح میں "نسخہ حمیدیہ" کے اشعار کی بھی شرح کی گئی ہے۔ فرماتے ہیں:-

"میں نے اسی زمانہ میں ارادہ کیا کہ اردو کے مروجہ دیوان غالب کی طرح اس کی بھی شرح ہو جائے تو وہ صرف مفید مطلب ہی نہیں بلکہ عجیب بھی ہوگی مگر اس ارادہ کا قوت سے فعل میں آنا اور اس خیال کو عملی جامہ پہنانا کوئی آسان بات نہ تھی۔ ایک دو رکاوٹیں نہیں بلکہ متعدد موانع موجود تھے۔ اشغال کی

کثرت، فرصت کی کمی، غور و فکر کے لئے موقع نہ ملنا۔ کلام کا غائر نظر سے مطالعہ کر کے قابل شرح شعروں کا انتخاب سب سے بڑی کمی اس بات کی کہ لکھ بھی لیں اور شرح کر بھی ڈالیں تو کون چھاپے گا۔ اور کون خریدیگا؟ یونہی ایک فرقہ ہے جو اس کلام کو دیکھ کر چیں بر جبیں ہے اور اپنی معلومات کی بنا پر قیاسی بنیادیں قائم کر کے یہ کہتا پھرتا ہے کہ "یہ کلام ہرگز غالب کا کلام نہیں ہے" پھر بھلا اس کوشش اور سعی کو نظر استحسان سے کون دیکھے گا۔ اور کہاں سے اس کے قدردان پیدا ہوں گے"۔ (صفحہ ۲۳-۲۴۔ مقدمہ مکمل شرح کلام غالب)

مولانا آسی کی مندرجہ بالا عبارت سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس وقت بعض لوگوں کا یہ بھی خیال تھا کہ "نسخہ حمیدیہ" میں غالب کا جو کلام شائع کیا گیا ہے وہ دراصل غالب کا نہیں ہے بلکہ کسی دوسرے شخص نے خود کہہ کر ان کے نام سے منسوب کر دیا ہے؟ یہ خیال کس فرقہ یا طبقہ کا تھا۔ مولانا آسی نے اس کی وضاحت نہیں فرمائی؟ جہاں تک میں سمجھتا ہوں اس قیاس کی کوئی بنیاد نہیں ہے۔ "نسخہ حمیدیہ" میں جو کلام شامل ہے اس کے بارے میں اس چالیس سال کے اندر اہل نظر نے کسی شک و شبہہ کا اظہار نہیں کیا۔؟

عرض کیا گیا ہے کہ مولانا آسی نے جس غیر واضح انداز میں مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کلام کے ذکر کو خلط ملط کر دیا ہے اس سے مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کلام کے متعلق صریحی طور پر کوئی رائے قائم کرنا دشوار ہے پھر بھی اس واقعہ کا اظہار تو ہو ہی جاتا ہے کہ اس "مکمل شرح کلام غالب" میں وہ اشعار بھی شامل ہیں جو "نسخہ حمیدیہ" میں شائع ہو چکے ہیں اور کلام غالب کے شارحین نے اس طرف اس وقت تک کوئی خاص توجہ نہیں کی تھی چنانچہ مولانا آسی نے اپنی اس شرح میں اس کمی کو بھی پورا کر دیا۔!

پلیش بندی کے طور پر مولانا آسی نے "نسخہ حمیدیہ" کے بارے میں یہ الفاظ۔!

"یونہی ایک فرقہ ہے جو اس کلام کو دیکھکر چین بر جبیں ہے اور اپنی معلومات کی بنا پر قیاسی بنیادیں قائم کر کے یہ کہتا پھرتا ہے کہ — یہ کلام ہرگز غالب کا کلام نہیں ہے"۔

لکھکر بظاہر ان دونوں مبینہ بیاضوں کو "شک و شبہہ" سے محفوظ کر لیا جن کی کچھ غزلوں

کو بھی "غیر مطبوعہ" قرار دے کر اس شرح میں شامل کر لیا ہے۔! اور "غیر مطبوعہ" کا لفظ مولانا نے جہاں بھی استعمال فرمایا ہے اپنی وسیع معنویت کے اعتبار سے ایک معمہ ہی بن گیا نولکشور پریس نے دیوان غالب (اردو) کے بہت سے ایڈیشن شائع کئے۔ خود مولانا آسی کے زمانہ ملازمت (نولکشور پریس) ۱۹۱۴ء لغایتہ ۱۹۴۶ء اس کے کئی ایڈیشن شائع ہوئے۔

چنانچہ "نسخہ حمیدیہ" (مطبوعہ ۱۹۲۱ء - ۱۹۲۲ء) کے تین ہی چار سال کے بعد جب نولکشور پریس لکھنؤ سے جون ۱۹۲۵ء میں دیوان غالب (اردو) کا نیا ایڈیشن مولانا آسی کے زیر اہتمام ان کے حواشی کے ساتھ شائع کیا تو اس کے صفحہ ۱۱۵ پر جلی عنوان میں لکھا ہوا تھا۔

"انتخاب غزلیات غیر مطبوعہ مرزا غالب مرحوم"

اور اس عنوان کے تحت یہ انکشاف کیا گیا تھا۔

"چونکہ مرزا غالب کی "غیر مطبوعہ" غزلیں یا وہ کلام جسے غالب نے خود "قابل طبع" نہ سمجھا تھا اکثر بیدل اور شوکت اسیر وغیرہ کے رنگ میں ہیں اور اسی وجہ سے وہ بعید الجہمی ہوئی اور بعید الفہم ہیں لہٰذا ان غزلوں میں سے وہ اشعار انتخاب کئے گئے ہیں جو اس رنگ میں بیحد سہل اور آسان ہیں۔ ہمارا ارادہ تھا کہ ان اشعار کو ان کے مروجہ دیوان کی غزلوں میں شامل کر دیا جائے مگر چونکہ خود مرزا نے ان کو علیحدہ کر دیا ہے لہٰذا ہم نے بھی مصنف مرحوم کا اتباع کیا۔ فقط"

لیکن اس "غیر مطبوعہ کلام" کو دیکھ کر متحیر نہ ہونا چاہئے کیونکہ غالب کا یہ تمام کلام چند سال قبل "نسخہ حمیدیہ" میں شائع ہو چکا تھا۔ صرف چند اشعار ایسے ضرور نظر آتے ہیں جن کے متعلق ابھی تک یہ تحقیق نہیں ہو سکا کہ یہ خود مولانا آسی کے "نتائج افکار" سے تعلق رکھتے ہیں یا کسی اور ذریعہ سے فراہم کئے گئے ہیں۔

اس سے زیادہ حیرت کا مقام یہ ہے کہ اس کے بعد دیوان غالب کے "دو" اور ایڈیشن مجتی مولوی امیر حسن نورانی کے دور اہتمام میں نولکشور پریس لکھنؤ سے (۱۹۵۶ء اور ۱۹۶۰ء میں) شائع ہوئے اس میں بھی غالب کا یہ تمام "غیر مطبوعہ کلام" من و عن مندرجہ بالا نوٹ کے

ساتھ موجود ہے۔ دیوان غالب کے ان دونوں ایڈیشنوں میں سرورق پر مولوی نورانی کا نام اس اہتمام کے ساتھ لکھا ہوا ہے۔

"معہ تصحیح واضافہ حالات زندگی"

از

سید امیر حسن نورانی معلّم اسلامیہ کالج لکھنؤ

مولوی نورانی نے ان نئے ایڈیشنوں کی "تصحیح" کس طرح پر کی؟ اس کے متعلق صرف اتنا ہی عرض کر دینا کافی ہے کہ مولانا آسی کے زمانہ میں (ایڈیشن ۱۹۲۵ء میں) غالب کا وہ مشہور سہرا۔

خوش ہو اے بخت کہ ہے آج ترے سر سہرا
باندھ شہزادہ جواں بخت کے سر پر سہرا

جو اس وقت تک دیوان غالب کے درجنوں ایڈیشنوں میں شائع ہو چکا تھا۔ جس طرح پر مولانا آسی کے زمانے میں "غیر مطبوعہ" قرار پا گیا تھا مولوی نورانی نے ۱۹۵۷ء اور ۱۹۶۷ء میں "تصحیح" کے بعد بھی بدستور "غیر مطبوعہ" ہی رہنے دیا حالانکہ اس کو چھپے ہوئے کم و بیش ایک صدی تو ضرور بیت چکی ہوگی۔

یہ قلمی بیاضیں کہاں سے آئیں؟ ان میں غالب کے نام سے جو کلام درج ہونا بتایا گیا ہے۔ اس کی کہانی طویل بھی ہے اور دلچسپ بھی اس کی تفصیل مولانا آسی مرحوم کی ہی زبانی سنئے تو بہتر ہے۔ مولانا تحریر فرماتے ہیں۔

"اتفاق وقت کہ میری لکھی ہوئی شرح دیوان غالب جو "صدیق بکڈپو" میں طبع ہوئی ہے ختم ہو گئی اور ارادہ ہوا کہ اس کو دوبارہ طبع کیا جائے۔ مولانا محمد صدیق صاحب مالک "صدیق بکڈپو" نے مجھ سے ارشاد فرمایا کہ اس میں اگر غالب کے وہ اشعار بھی شامل کر دیئے جائیں جو اگرچہ طبع ہو گئے ہیں مگر مطبوعہ دیوان میں شامل نہ ہونے کی وجہ سے اب تک منظر عام پر نہیں آئے ہیں تو شرح مکمل ہو جائے۔ میں نے بھی اس رائے میں کوئی خرابی نہ دیکھتے ہوئے قبول کر لیا اور ارادہ کیا کہ بعض ایسے اشعار کا شرح میں اضافہ کر دیا جائے جو

اس دیوان کے اشعار سے ملتے جلتے ہوں اور جو بے تکلف کھپ جائیں ارادہ ابھی معرضِ التواء میں تھا اور دماغ ہنوز اس فکر میں سرگرم کار تھا کہ مولانا (صدیق) کو معلوم ہوا کہ ڈاکٹر عظمت الٰہی سلونوی ایڈیٹر اخبار "قیامت" کے پاس ایک "بیاض" ہے جو ان کو بالکل غیر متوقع طور پر کسی جگہ سے ہاتھ لگ گئی ہے اس میں پندرہ بیس غزلیں ایسی ہیں جو اس دیوان میں بھی نہیں ہیں جو "حمیدیہ نسخہ" کے نام سے موسوم ہے! مولانا نے نہایت عجلت کے ساتھ ڈاکٹر صاحب سے ملکر اس بات کو معلوم کر لیا کہ جو کچھ سنا ہے وہ صحیح ہے! میں نے خود بھی اس بیاض کو ڈاکٹر صاحب کے پاس دیکھا تھا مگر کبھی اس کے حاصل کرنے کا اس واسطے خیال نہیں آیا تھا کہ وہ خود اس کے طبع کرنے کا ارادہ رکھتے تھے اور اس کا کبھی کبھی مجھ سے ذکر بھی کیا تھا مگر مولانا صدیق صاحب نے کوشش بلیغ کر کے اس "بیاض" کو حاصل کر لیا — اور اب میں نے اپنے پہلے ارادہ کو بدل کر یہ ارادہ کیا کہ اس کلام "غیر مطبوعہ" کے ساتھ اسی بیاض کی غزلوں کو بھی شریک کر دیا جائے گا تو ان کی شرح کی ایک خاص ضخیم کتاب ہو جائے گی۔ اسی خیال پر کاربند ہو کر خدا کا نام لے کر میں نے شرح لکھنا شروع کر دی۔

شرح کس انداز پر لکھی ہے! اس کی توضیح تو آخر مضمون میں لکھوں گا۔ پہلے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس بیاض کے متعلق مفصل طریق پر کچھ لکھدیا جاوے۔

یہ بیاض مکمل نہیں معلوم ہوتی اس لئے کہ اس میں صرف ایک جزو ہے اسی لئے پتہ چلتا ہے کہ یہ کسی ضخیم بیاض سے کسی صورت سے جدا ہو گیا ہے اس کی دوسری دلیل یہ بھی ہے کہ یہ جزو جزو اوّل ہے بلکہ یہ ایک کشکول کا ابتدائی حصّہ ہے! کیونکہ اس میں غالبؔ کے اشعار کے علاوہ دوسرے اساتذہ کے بھی بعض شعر ہیں — اور آخر میں کچھ نسخے کچھ تعویز وغیرہ بھی ہیں۔ غزلوں کی ترتیب بھی اس صورت سے ہے کہ اوّل میں مرزا کی غزلیں ہیں اور آخر میں دوسرے لوگوں کی: ان میں بھی بعض غزلیں ملی جلی ہیں۔

یہ بیاض قدیم زمانے کی روش کے مطابق تمام وکمال ایک خط ہی میں لکھی ہوئی ہے اور ایک ہی کاغذ و روشنائی ہے اس وجہ سے یہ بات آسانی سے سمجھ میں آجاتی ہے کہ کسی دوسری جگہ سے اس بیاض پر غزلیں وغیرہ نقل کیگئی ہیں میرے خیال میں کم از کم ساٹھ ستر برس ادھر کی نہیں تو چالیس پچاس برس اُدھر کی لکھی ہوئی ضرور ہے اس کا کاغذ وہی قدیم ہے طرز تحریر جدولیں تمام تر قدیم وضع پر ہیں۔

آب رسیدہ ہے اور اسی وجہ سے بعض جگہ سیاہی پھیل گئی ہے اور بعض مصرعے نہیں پڑھے جاتے بوسیدہ تو نہیں ہے مگر کرم خوردہ ہے کہیں کہیں زمانے کے امتداد کی وجہ سے اتنی فرسودہ ہوگئی ہے کہ بعض مصرعے غائب ہیں۔ یا نہیں پڑھے جاتے ـــ حاشئے پر چوہوں کے دانتوں کی دست درازیاں بھی ہوئی ہیں اور ان سے بھی اچھا خاصا ایک گل کاری کا منظر پیش ہوگیا ہے! اس کے پہلے حصّہ پر ایک عبارت درج ہے جو کسی دوسری جگہ آپ ملاحظہ فرمائیں گے! اس میں درج ہے کہ کوئی صاحب "شاکر" تھے ان کو مرزا نے وقت بے وقت رام پور میں یہ غزلیں لکھوائیں اور وہ ان کے پاس رہیں۔ ان کا خیال تھا کہ جب دیوان طبع ہوگا تو یہ غزلیں بھی اس میں شریک کردی جائینگی مگر نہ معلوم کیا اسباب پیش آئے کہ یہ ارادہ پورا نہ ہوسکا اور وہ غزلیں شریک دیوان نہ ہوئیں! تعجب اس بات کا ہے کہ مرزا کے دوستوں میں ایک شخص "مولوی عبدالرزاق شاکر" ضرور تھے مگر اور کوئی شاکر بظاہر انکے دوست نہ تھے! اور ان شاکر کا یہاں تک آنا ذرا دشوار تھا مگر یہ صرف میرا خیال ہے ممکن ہے کہ وہی شاکر کبھی رامپور آئے ہوں کیونکہ لکھنے والے صاحب رامپوری نہیں ہیں بلکہ شاہجہان آبادی ہیں۔ بہرصورت زمانے کے امتداد نے اب اس بات پر ایک پردہ ڈال دیا ہے اور یہ معلوم ہونا دشوار معلوم ہوتا ہے کہ بیاض کے جمع کرنے والے کون صاحب تھے! مگر جہاں تک میرا خیال ہے یہ

بیاض اس اصلی بیاض کی نقل ہے اصل نہیں۔

.............میں نے اس بیاض کو بعض ادیبوں کو دکھا کر چاہا کہ ان کی رائے بھی حاصل کر لی جائے۔ اور اس لئے سب سے پہلے اپنے معزز اور معتمد دوست مولانا نیاز فتح پوری کی خدمت میں یہ بیاض پیش کی جس میں سے انھوں نے اکثر غزلوں کو بطور انتخاب چن لیا۔ اور رسالۂ "نگار" ماہ فروری ۱۹۳۱ء میں اس پر اپنی رائے کا اس طرح اظہار فرما کر وہ انتخاب شائع کیا۔

"اس وقت غالب کے اردو کلام کے دو مجموعے ملک میں نظر آتے ہیں ایک وہ عام اور متداول نسخہ جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ مولانا فضل حق خیر آبادی کے مشورہ سے غالب نے مرتب کیا تھا اور جس میں سے زیادہ ثقیل اور دشوار اشعار نکال دیئے تھے۔ دوسرا وہ جو "نسخہ حمیدیہ" کے نام سے معروف ہے اور جس کو ڈاکٹر بجنوری مرحوم نے کتب خانہ بھوپال کے ایک قدیم نسخہ کے موافق مرتب کیا اور انجمن ترقی اردو نے شائع کیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اس نسخہ میں تمام وہ اشعار موجود ہیں جن کے حذف کرنے کے بعد متداول نسخہ مرتب کیا گیا تھا۔ چونکہ کتبخانہ بھوپال کا نسخہ جس کے مطابق "نسخہ حمیدیہ" شائع کیا گیا ہے وہ ہے جسے خود غالبؔ نے نواب بھوپال کے پاس حذف و اصلاح کے بعد روانہ کیا تھا اس لئے خیال کیا جاتا تھا کہ اب کوئی حصہ کلام غالب کا ایسا نہیں ہے جو شائع ہونے سے رہ گیا ہو لیکن حال ہی میں ایک قلمی بیاض "صدیق بکڈپو" کو ایسی دستیاب ہوئی ہے جس میں متعدد غزلیں غالب کی ایسی درج ہیں جو نہ متداول نسخہ میں پائی جاتی ہیں نہ نسخہ حمیدیہ میں — اب یہاں دو سوال پیدا ہوتے ایک یہ کہ یہ غزلیں واقعی غالب کی ہیں یا نہیں؟ اور دوسرا یہ کہ اگر غالب ہی کی ہیں۔ تو اس نسخہ میں کیوں نہیں پائی جاتیں جو بھوپال بھیجا گیا تھا۔ امر اول کے متعلق گفتگو فضول ہے کیونکہ غالبؔ کا رنگ سخن

ایسا نہیں ہے جو چھپا ہے اور جس پر دو رائیں قائم ہو سکیں رہ گیا امر ثانی سو یہ ہو سکتا ہے کہ بھوپال والے نسخہ کی ترتیب کے بعد غالب نے اور غزلیں کہی ہوں اور ان میں سے بعض کسی نے اس بیاض میں نقل کر لی ہوں۔ یا پھر یہ وہ غزلیں ہیں جو مختلف اوقات میں غالب نے بغیر مسودہ رکھے ہوئے کسی کو سنائی ہوں اور اس نے محفوظ کر لیا ہو! بہر حال بیاض زیر بحث میں جتنی غزلیں پائی جاتی ہیں۔ وہ یقیناً غالب کی ہیں۔ جیسا کہ اقتباس ذیل سے ظاہر ہوگا۔

معلوم ہوا ہے کہ صدیق بکڈپو ان کو مع ان کی شرح کے علیحدہ یا دیوان غالب کے ساتھ شائع کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔

"نیاز"

اسی طرح اپنے قابل دوست اور فاضل نقاد مولانا صدیق احمد صاحب مجنوں گورکھپوری ایڈیٹر "ایوان" کو بھی یہ بیاض میں نے دکھائی انھوں نے بھی بعض غزلوں کا انتخاب شائع کر کے یہ رائے دی ہے۔ وہ رسالہ "ایوان" جنوری ۳۱ء میں تحریر فرماتے ہیں۔

غالب کا غیر مطبوعہ کلام

"ابھی کچھ زیادہ عرصہ نہیں گذرا جب کہ چند گنی ہوئی غزلوں کو دیوان غالب کا نام دیا جا رہا تھا اور غالب کے پوجنے والے انھیں کو غنیمت سمجھ رہے تھے اس کے بعد "نسخہ حمیدیہ" شائع ہوا اور لوگوں نے دیکھ لیا کہ الہامی کتاب درحصل کتنی ضخیم اور کتنی ہے! خیال کیا یقین تھا کہ غالب کا سارا سرمایہ سخن اب اس سے زیادہ نہ ہوگا؛ میں نے بھی یہی سمجھ کر "نسخہ حمیدیہ" کا مطالعہ کیا تھا لیکن میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب کہ میں ابھی پچھلے ہفتے لکھنؤ گیا اور اپنے مکرم دوست جناب مولانا عبدالباری آسی کے پاس ایک قلمی بیاض دیکھی جس میں علاوہ اور شعرا کے غالب کی بھی چند غزلیں ہیں۔ ان میں ایک یا دو تو ایسی ہیں جو "نسخہ حمیدیہ" اور دیوان غالب متداول دونوں میں موجود ہیں باقی سب غیر مطبوعہ ہیں بیاض یقیناً

اَب سے چالیس پچاس سال پہلے کی لکھی ہوئی ہے۔ کوئی شاکر شاہجہان آبادی تھے جو غالب کے ہم عصر تھے اور جس زمانے میں غالب رام پور میں مقیم تھے یہ بھی وہیں موجود تھے۔ یہ بیاض انھیں شاکر شاہجہان آبادی کی بیاض کی نقل ہے غالب نے وقتاً فوقتاً شاکر کو یہ غزلیں لکھوائی تھیں۔ طے یہ تھا کہ جب غالب ان غزلوں کو طلب کریں گے تو شاکر ان کو بھیج دینگے اور وہ دیوان میں شامل کرلی جائیں گی لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اس کی نوبت نہیں آئی اور یہ غزلیں کسی نسخہ میں درج نہ ہو سکیں!

یہ غزلیں واقعی غالب کی ہیں یا نہیں؛ اس کا ثبوت یوں تو ایک یہ بھی ہے کہ ان میں ایک یا دو غزلیں ایسی بھی ہیں جو غالب کے مطبوعہ دیوان میں موجود ہیں۔ لیکن اگر اس دلیل سے برطرف ہو کر صرف رنگِ کلام کو دیکھا جائے تو بھی کہنا پڑتا ہے کہ یہ غزلیں غالب کی ہیں وہی بندشِ الفاظ۔ وہی اختصار و بلاغت! وہی دقتِ نظر۔ وہی شاعرانہ جلال جس نے غالب کو غالب بنا دیا ہے۔ ان غزلوں کی امتیازی شان ہے۔

یہ غزلیں قطعاً غالب کے درمیانی دور کی ہیں جبکہ ان میں توازن اور اعتدال آچکا تھا اور جب کہ ان کے بہکنے میں دوسروں کو بھی مزا آنے لگا تھا۔ یعنی جبکہ ان کی پیچیدہ خیالی اور مشکل بیانی سلاست اور شستگی رونما ہو چکی تھی۔ چار غزلیں یہاں درج کی جاتی ہیں جن میں سے ایک مومن کی اس غزل کے ساتھ کی ہے جس کا ایک مشہور شعر یہ ہے۔

ایک ہم ہیں کہ ہوئے ایسے پشیمان کہ بس
ایک وہ ہیں کہ انھیں چاہ کے ارماں ہونگے

کچھ عرصے سے نکتہ چین اور عیب بین نگاہیں غالب کو طرح طرح بے نقاب کرتی رہی ہیں اور غالب کا بت توڑنے کی مسلسل کوشش ہوتی رہی ہے لیکن غالب اب بھی غالب ہے اور اس کا بت اپنی جگہ اسی طرح قائم ہے اور پوجنے والے اس کو اسی طرح پوجتے ہیں امید ہے یہ غزلیں بھی تبرکات

غالب سمجھی جائیں گی اور اس کی قدر کی جائے گی۔

مجنوں گورکھپوری

(صفحہ ۳۸-۳۹ مکمل شرح غالب) ۲۳ جنوری ۱۹۳۱ء

لیکن ان تفصیلات کے پیش فرمانے کے باوجود شاید مولانا آسی کو یہ "اندیشہ" باقی رہا کہ اس بیاض کے بارے میں کسی وقت محققین نے اگر چھان بین کی تو۔! چنانچہ انھوں نے ارباب نظر کا بوجھ کم کرنے کے لئے "حقائق" پر انداز سخن اور طرز کلام کی خصوصیات کے پردے ڈالتے ہوئے یہ لکھدینا بھی ضروری سمجھا۔

"یہ بات اب بھی رہی جاتی ہے کہ یہ غزلیں کہاں سے اور کیونکر بہم پہونچی ہیں؟ سو اس کے بارے میں جو کچھ میں پہلے لکھ چکا ہوں وہ کافی ہے اور اصل تو یہ ہے کہ جب ہم سمجھ چکے ہیں کہ یہ کلام مرزا کے کلام کے سوا اور کسی کا ہو ہی نہیں سکتا تو پھر کسی اور کاوش کی ضرورت ہی کیا ہے؟ "کہیں سے بہم پہونچا ہو اور کسی طرح سے پہونچا ہو"! بہرصورت کلام ان کا ہے"

(صفحہ ۴۳ مکمل شرح کلام غالب)

مولانا آسی کے ان الفاظ سے بالکل واضح ہے کہ اس (مفروضہ) "بیاض" کے وجود حقیقی کی "تحقیق" کا مسئلہ ان کے نزدیک ایسا نہیں تھا جس پر کسی وقت بھی غور کیا جائے یا ارباب تحقیق اس کے "وجود" کی بحث میں اپنا وقت ضائع کریں۔ ان کے نزدیک اس کلام کو غالب کا کلام تسلیم کرنے کے لئے صرف اتنا ہی کافی ہے کہ اس کا کچھ حصہ بادی النظر میں غالب کے رنگ کلام سے مشابہت رکھتا ہے اور بس۔!

اس قلمی بیاض کے علاوہ ایک دوسری قلمی بیاض کا تذکرہ بھی مولانا آسی نے اسی مقدمہ میں کیا ہے؟ جو "حسن اتفاق" سے خود مولانا کے قبضے میں کسی طرح سے آگئی تھی۔ فرماتے ہیں مولانا۔!

"میرے پاس جو دوسری بیاض ہے اور جس میں علاوہ ان دو غزلوں کے دو غزلیں اور بھی اس بیاض کی ملتی ہیں وہ بیاض ساٹھ پینسٹھ برس کی لکھی ہوئی ہے اور اس میں جابجا تاریخیں بھی ہیں۔ اس میں غالب کے علاوہ

دوسرے اساتذہ کی غزلیں بھی ہیں بمتفرق لوگوں نے اس کو لکھا ہے اور
جابجا تاریخ ہائے تحریر بھی اس میں درج ہیں ۔مگر اس کے اصل جامع منشی
عبدالغفار متخلص بہ اخگر الدنی ہیں جن کے اخلاف بھی قصبہ" الدن" میں موجود
ہیں۔ یہ بیاض بہت ہی قدیم ہے ۔ دو غزلیں مرزا کی ایسی اس میں اور بھی
پائی جاتی ہیں ۔ جو اس بیاض (متذکرہ) میں بھی موجود ہیں ۔

(صفحہ ۴۴۔ مکمل شرح کلام غالب)

قبل اس کے کہ میں خود مولانا آسی کے ان بیانات پر کوئی تنقیدی تبصرہ کروں مناسب ہے کہ مولانا آسی کے پیش کردہ" غیر مطبوعہ کلام غالبؔ" پر مشہور غالب شناس جناب محمد اکرام کا وہ محاکمہ پیش کردوں جو بالدلائل" غالب نامہ" میں کیا گیا ہے ۔

جناب محمد اکرام لکھتے ہیں ۔

"مضمون ختم کرنے سے پہلے ہم اتنا کہہ دینا چاہتے ہیں کہ" مکمل شرح کلام غالبؔ" کی جن غزلوں کو مولانا نیاز (فتحپوری) مولانا عبدالباری آسیؔ مجنوں گورکھپوری اور دوسرے اہل قلم حضرات نے غالب کے نتائج مان لیا ہے انھیں کلام غالب ماننے میں ہمیں بہت تامل ہے ہمارے وجوہ بالاختصار یہ ہیں

(۱) جس بیاض سے یہ اشعار نقل ہوئے ہیں اس کے مالک، مرتب اور کاتب کے متعلق کوئی قابل ذکر واقفیت نہیں ! تاریخ کتابت بھی اس پر درج نہیں۔

(۲) کہا جاتا ہے کہ کوئی صاحب شاگرد تھے ! ان کو مرزا نے وقت بے وقت رامپور میں غزلیں لکھوائیں اور وہ ان کے پاس رہیں ان کا خیال تھا کہ جب دیوان طبع ہوگا تو یہ غزلیں اس میں شریک کردی جائیں گی ۔مرزا کے خطوط سے ظاہر ہے کہ وہ رام پور فقط دو دفعہ گئے ! ایک دفعہ جنوری ۱۸۶۰ء کے آخر میں ۔ اور دوسری دفعہ اکتوبر ۱۸۶۵ء میں ۔ دوسری دفعہ جب مرزا رام پور گئے تو ان کی عمر اڑسٹھ ۶۸ سال سے زیادہ تھی اور صحت کی حالت ناگفتہ بہ ۔ ! ایسی حالت میں یہ خیال کرنا عبث ہے کہ انھوں نے پچیس ایسی غزلیں لکھی ہوں گی جو دقیق خیالات سے پر ہیں پھر لطف یہ کہ غزلیں فرمائش

پر بھی نہیں لکھی گئیں ۔ اور ان میں نواب رام پور کی طرف کسی جگہ اشارہ نہیں۔ مرزا نے بہادر شاہ کی فرمائش پر جو غزلیں لکھیں ان میں بادشاہ کا ذکر اکثر آجاتا ہے اب اگر مرزا نے یہ غزلیں بہ امر مجبوری فرمانروائے رام پور کے ارشاد پر لکھیں تو کم از کم ایک غزل میں (تو) نواب کا ذکر ہوتا غالبؔ نے رام پور کا سفر ۱۸۶۰ء میں اختیار کیا اس سفر کے دوران میں انھوں نے نواب ضیاء الدین کی فرمائش پر نواب صاحب رام پور سے انھیں دیوان کے ایک نسخہ کے لئے کہا۔ اور جیسا کہ مرزا کے خطوط سے ظاہر ہے انھوں نے نواب ضیاء الدین سے یہ نسخہ لیکر میرٹھ بھیجدیا۔ اب اگر ان پچیس غزلوں کے متعلق یہ بیان درست ہے کہ وہ دیوان کی طباعت کے وقت شامل کی جانے والی تھیں تو بڑا تعجب ہے کہ اس فیصلے کے تھوڑے عرصے کے بعد جب مرزا نے میرٹھ میں اپنے دیوان کی اشاعت کا فیصلہ کیا تو اپنے تازہ ترین کلام کو اس میں کیوں شامل نہیں کیا۔؟

(۳) مولوی عبدالرزاق شاکر کے نام غالب کے اردو خطوط موجود ہیں لیکن رام پور کے سفر میں وہ غالبؔ کے شریک نہ تھے غالب انھیں ایک خط میں لکھتے ہیں۔ " قبلہ و کعبہ۔ فقیر پا در رکاب ہے سہ شنبہ، چہار شنبہ! ان دونوں دنوں میں سے ایک دن عازم رام پور ہوں گا ....

... اب جو کوئی خط آپ بھیجیں مکان کا پتہ لکھنا ضروری نہیں۔ شہر کا نام اور میرا نام کافی ہے"۔

ظاہر ہے کہ اگر شاکر صاحب رام پور میں ہوتے تو انھیں مرزا کے نام (اور شہر کے نام سے) خط لکھنے کی ضرورت نہ ہوتی غالب کے خطوط میں مولوی عبدالرزاق (شاکر) کے سوا اور کسی "شاکر" کا ذکر نہیں۔؟

(۴) اس زمانے میں مرزا نے جو غزلیں لکھیں ان کے خیالات سادہ اور زبان صاف ہے مثلاً۔!

میں ہوں مشتاق جفا۔ مجھ پہ جفا اور سہی
تم ہو بیداد سے خوش! اس سے سوا اور سہی

لیکن مولانا آسی نے جو اشعار شائع کئے ہیں ان میں سے اکثر دقیق ہیں اور مرزا کی اس زمانے کی طرز شعر گوئی کے مطابق نہیں! جو اشعار سادہ ہیں وہ بھی مرزا کے کلام کی خصوصیات سے عاری ہیں جو ان کے اس زمانے کے اردو اشعار کا مایۂ الامتیاز ہیں ایک شعر تو ایسا ہے کہ اس کے پڑھنے سے میر امانی اسد کا وہ مطلع یاد آجاتا ہے جس کی وجہ سے مرزا نے اپنا تخلص بدل دیا تھا۔

وفا جفا کی طلبگار ہوتی آئی ہے

ازل کے دن سے یہ اے یار ہوتی آئی ہے

(۵) مرزا کے علاوہ غالب علی خان اور دو تین دوسرے شعراء کا تخلص بھی "غالب" تھا اگر بیاض کے سارے اشعار غالب کے ہیں تو ممکن ہے کہ وہ کسی اور غالب کے ہوں۔ مرزا کے یقیناً نہیں؟

ان وجوہ کی بنا پر ان "غیر مطبوعہ غزلیات" کو ہم نے مرزا غالب کے اشعار نہیں مانا اور ان کا انتخاب ان کی شاعری کے کسی دور میں نہیں دیا۔"

(صفحہ ۱۷۰۔ لغایۃ ۱۷۲۔ غالب نامہ تیسرا ایڈیشن)

پہلی بات تو ان بیاضوں کے "وجود حقیقی" کی ہے؟ جو از سر تا پا ایک افسانۂ خیالی" سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتی؟ جس بیاض کا غیر متوقع طور پر ڈاکٹر عظمت الٰہی سلونوی کے ہاتھ آجانا بیان کیا جاتا ہے اس کے وجود کی خوشخبری سب سے پہلے ماہنامہ "ایوان" گورکھپور (جنوری ۱۹۳۱ء) نے دی اور اس کے بعد فروری ۱۹۳۱ء میں ماہنامہ "نگار" لکھنؤ نے۔!

یہ بیاض ڈاکٹر صاحب مرحوم کو کہاں سے ملی؟ اور کب؟ اس کی کوئی تفصیل اب تک معلوم نہیں ہو سکی! اور نہ مولانا آسی نے اپنی اس "مکمل شرح کلام غالب" میں اس کے کسی صفحہ کا عکس تحریر دینا ضروری سمجھا حالانکہ اس شرح میں غالب کے دو فوٹو بلاک اور ایک تصویر آرٹ پیپر پر خود مولانا آسی کی شائع ہوئی ہے۔ غالب اور مولانا آسی کی جو دو تصویریں آرٹ پیپر پر چھپی ہیں ان کا پچھلا صفحہ بالکل سادہ ہے اگر ایسی کوئی نایاب تحریر موجود ہوتی تو اس کا عکس کیوں نہ شائع کیا جاتا۔! اس کے علاوہ مولانا

آسی نے اس بیاض کے صفحۂ اوّل پر ایک عبارت کے وجود کا تو ذکر کیا ہے۔ لیکن یہ عبارت بڑی تلاش و جستجو کے بعد بھی مجھے کہیں نظر نہیں آئی۔ مولانا آسی لکھتے ہیں۔ !

"اس (بیاض) کے پہلے صفحہ پر ایک عبارت درج ہے" جو بجنسہٖ دوسری جگہ آپ ملاحظہ فرمائیں گے" اس میں درج ہے کہ کوئی شاکر صاحب تھے' ان کو مرزا نے وقت بیوقت رام پور میں غزلیں لکھوائیں اور وہ ان کے پاس رہیں ان (غالب) کا خیال تھا کہ جب دیوان طبع ہوگا تو یہ غزلیں بھی اس میں شریک کر دی جائینگی مگر نہ معلوم کیا اسباب پیش آئے کہ یہ ارادہ پورا نہ ہو سکا اور وہ غزلیں شریک دیوان نہ ہوئیں" (صفحہ ۴۳ مکمل شرح)

غالب اور شاکر کے مابین جو "معاہدہ" ہوا تھا اس کے بارے میں کچھ بھی عرض نہیں کیا جا سکتا کیونکہ حسب وعدہ "پہلے صفحہ" کی عبارت اس مقدمہ میں کہیں نقل نہیں کی گئی۔ لیکن مولانا آسی کی متذکرہ عبارت سے اتنا تو صاف ظاہر ہے کہ جب غالب اور شاکر کے مابین یہ "معاہدہ" ہوا تھا تو ان کا دیوان طبع نہیں ہوا تھا — اور یہ بات بھی ان سطور میں غیر مبہم طور پر موجود ہے کہ یہ غزلیں "رام پور" کے زمانۂ قیام میں شاکر کو لکھوائی گئیں — اور اسی وقت یہ "قول و قرار" بھی ہوا کہ جب دیوان چھپے گا تو یہ غزلیں (شاکر سے منگوا کر) اس میں شامل کر دی جائیں گی۔ !

یہ "شاکر" کون تھے ؟ اسے خود مولانا آسی نے تسلیم کیا ہے کہ غالب کے دوستوں میں سوائے مولوی عبدالرزاق شاکر کے کسی دوسرے "شاکر" کا پتہ نہیں چلتا ؟ اور یہی بات اسی سلسلے میں دوسرے ارباب نظر نے بھی لکھی ہے پھر بھی "شاکر" کے وجود کا مسئلہ بھی اس "بیاض" کی طرح ہنوز حل طلب رہ جاتا ہے جس کے متعلق کچھ بھی نہیں کہا جا سکتا اگر مولانا آسی کے اس بیان کو مان بھی لیا جائے کہ یہ غزلیں غالب نے اپنے زمانۂ قیام رامپور میں کسی "شاکر" کو لکھوا دی تھیں اس خیال سے کہ جب دیوان چھپے گا تو یہ غزلیں ان سے منگوا کر دیوان میں شامل کر دی جائیں گی۔ تو یہ بات کسی طرح قابل قبول نہیں ہو سکتی کیونکہ غالب پہلی بار سنہ ۱۸۶۰ء میں رام پور گئے اور ان کا دیوان اس سے پہلے سنہ ۱۸۴۱ء میں شائع ہو چکا تھا اس کے علاوہ خود رام پور میں ان کے بہت سے شاگرد موجود تھے۔ اگر

انھوں نے اپنے قدر شناس سرپرست اور مربی "نواب رام پور" کو یہ غزلیں دینا کسی وجہ سے مناسب نہیں سمجھا تو ان شاگردوں میں سے کسی کو بلا کر یہ غزلیں اسے لکھوا دیتے کہ ضرورت کے وقت بھیجدینا۔ اور یہ شاگرد ایک دو بھی نہیں، پورے ایک درجن تھے۔ جن کا ذکر جناب مالک رام نے "تلامذۂ غالبؔ" میں کیا ہے۔ ملاحظہ ہو۔

۱۔ حکیم مظہر احسن احسنؔ رام پوری ـــــ وفات ۱۸۹۱ء

۲۔ حکیم فتحیاب خاں آخگرؔ رام پوری ـ وفات تخمیناً ۱۹۱۴ء یا ۱۹۱۵ء

۳۔ صاحبزادہ عباس علی خاں بیتابؔ (فردوس مکان نواب یوسف علی خاں ناظمؔ کے حقیقی چچازاد بھائی) ـــــ وفات ۶؍ جون ۱۸۸۳ء

۴۔ مولوی عبدالسمیع بیدلؔ رام پوری

۵۔ صاحبزادہ عبدالوہاب خاں سروشؔ رام پوری .... غالب کی وفات کے بعد انتقال ہوا۔

۶۔ نادر شاہ خاں شوخیؔ رام پوری۔ بیسویں صدی کے اوائل میں وفات پائی۔

۷۔ شہاب الدین خاں شہابؔ رام پوری۔ " " " " "

۸۔ حافظ خان محمد خاں شہیرؔ رام پوری ـ غالب کی وفات کے بعد بھوپال میں ملازمت کا سلسلہ شروع ہوا۔

۹۔ صاحبزادہ محمد فدا علی خاں فداؔ رام پوری (فردوس مکان کے بھتیجے) " "

۱۰۔ سید افتخار الدین مغلوبؔ رام پوری ـــــ وفات ۱۸۶۵ء

۱۱۔ فخر الدین نادمؔ رام پوری ۱۳۲۰ھ تک بقید حیات تھے۔

۱۲۔ فردوس مکان نواب یوسف علی خاں ناظمؔ والئی رام پور ـــــ وفات اپریل ۱۸۶۵ء

ان ایک درجن شاگردوں میں "والئی رام پور" کے علاوہ کچھ اور نام بھی ایسے ملتے ہیں جن کا شمار اس زمانے کے عمائدین رام پور میں تھا۔ لیکن غالبؔ نے ان میں سے کسی ایک کو بھی اس "امانت" کا اہل نہ سمجھا ـ اور ایک دو نہیں پوری پچیس[۲۵] غزلیں ایک ایسے شخص کو قلمبند کرا دیں جس کا نام نہ تو کہیں ان کے احباب میں نظر آتا ہے اور نہ شاگردوں میں ـ!

۱۸۶۰ء کے بعد غالب دوسری مرتبہ اکتوبر ۱۸۶۵ء میں رام پور گئے ـ ان دو موقعوں کے علاوہ نہ تو ان کے خطوط سے اور نہ کسی معتبر روائت سے ان کے قیام رامپور

کا پتہ چلتا ہے۔ اگر یہ فرض کرلیا جائے کہ دیوان کی طباعت سے غالب کا مفہوم یہ ہوگا کہ جب دیوان کا کوئی دوسرا ایڈیشن چھپے گا تو یہ غزلیں اس میں شامل کردی جائیں گی۔ اور غزلیں لکھوا دینے کے واقعہ کو ۱۸۶۰ء کا واقعہ فرض کرلیا جائے تو بھی دیوان غالب کے تیسرے ایڈیشن مطبوعہ مطبع احمدی (آخر جولائی ۱۸۶۱ء) چوتھے ایڈیشن مطبوعہ نظامی کان پور (جون ۱۸۶۲ء) اور پانچویں ایڈیشن (مطبوعہ آگرہ ۱۸۶۳ء) میں بھی ان غزلوں کا کہیں پتہ نہیں چلتا۔ یہی نہیں بلکہ ۱۸۶۶ء میں جو انتخاب کیا گیا ان پچیس غزلوں کا ایک شعر بھی اس نہیں ہے۔

ان تاریخی حقائق و شواہد کی روشنی میں کسی طرح یہ یقین نہیں کیا جاسکتا کہ غالب نے یہ غزلیں کہہ کر کسی "شاکر" کے حوالے کردی ہونگی اور پھر وہ بیاض ایک دوسری جگہ نقل ہو کر ڈاکٹر عظمت الٰہی تک پہنچ گئی ہوگی۔ خصوصاً ان حالات میں جب اس بیاض کے کسی بھی ورق کا عکسی فوٹو پیش نہیں کیا جاسکا۔! اگر ایسی کسی بیاض کا وجود ہوتا تو زمانہ کی بدلی ہوئی قدریں مولانا آسی۔ اور ناشر کتاب کو یقیناً اس کے لئے مجبور کرتیں کہ جہاں وہ تصویروں کے تین بلاک شائع کر رہے ہیں کم از کم ایک ورق کے عکس کا اس میں اور بھی اضافہ کردیا جائے۔

اب رہی دوسری قلمی بیاض جس کی دو غزلیں غالب سے منسوب کی گئی ہیں۔ مولانا آسی نے اس کے جامع کا نام منشی عبدالغفار اخگر الدنی" تحریر فرمایا ہے ہوسکتا ہے کہ اس نام کے کوئی بزرگ کسی زمانے میں "الدن" میں رہتے ہوں اور ان کے اخلاف بھی وہاں موجود ہوں! لیکن صرف یہ "نشاندہی" کسی بیاض کے وجود کو ثابت کرنے کے لئے کافی نہیں ہے جہاں تک میں سمجھتا ہوں اس "بیاض" کی روایت بھی اس طرح "طبعزاد" ہے جس طرح مولانا آسی نے ماہنامہ "نگار" لکھنؤ (جنوری و فروری ۱۹۴۱ء) میں اپنے خودنوشت حالات لکھتے وقت یہ لکھدیا تھا۔

"میرا نام عبدالباری۔ تخلص آسی! ابن منشی خلیفہ حسام الدین احمد حسام تلمیذ مرزا غالب ابن مولوی شیخ خدا بخش عاجز ابن" عبدالحکیم عاشق عرف نتھن معاصر و ہم جلیس میر تقی میر مرحوم ....!

حالانکہ ان خود نوشت حالات لکھنے سے چند ہی ماہ قبل جب انھوں نے ۱۷ اکتوبر ۱۹۴۰ء کو کلیات میرؔ (مطبوعہ نولکشور پریس لکھنؤ) کا طویل مقدمہ اور اس مقدمہ میں میرؔ کے محققانہ حالات تحریر فرمائے تو اس وقت ان کے ذہن میں بھی یہ نہیں تھا کہ ان کے پردادا "عبدالحکیم عاشق" (عرف نھتن) کو کسی وقت میر تقی میرؔ کا ہم جلیس و معاصر کہنا پڑے گا۔ چنانچہ اسی مقدمہ میں (میر صاحب کے وہ دوست جو شاعر تھے"؟) ایک ضمنی عنوان کے تحت مولانا آسی نے لکھا ہے!

"میر صاحب کی افتادِ طبیعت۔ خودداری، عزلت پسندی۔ استغناء۔ کی وجہ سے کسکو گمان ہوسکتا ہے کہ ان کے کچھ شاعر دوست بھی ہونگے! مگر ایسا نہیں ہے! وہ خوددار سہی، خودبین سہی۔! مگر ان کی خودداری اور خودبینی نااہلوں کے ساتھ تھی۔ وہ گردوں ملندوں کے سامنے سرِ نیاز نہیں جھکاتے تھے اور ان سے ہم چشمی اور مساوات کا برتاؤ رکھتے تھے جیسا کہ ان کے اکثر اوقات سے ظاہر ہوتا ہے۔ مگر اپنے دوستوں کے ساتھ سراپا ارتباط اور سراسر اختلاط تھے۔ اور جب ان کی دیر آشنائی، ختم ہو کر دوستی و محبت کا رنگ بدلتی تھی پھر اس میں کبھی فرق نہ آتا تھا۔ چنانچہ نجم الدین علی خاں سلام خلف شرف الدین علی خاں پیامؔ ان کے ہر وقت کے دم ساز اور رفیق حریف، ظریف اور خالص دوست تھے۔ ان کے ساتھ برابر مشق سخنی بھی ہوتی تھی اور گپیں بھی لڑائی جاتی تھیں۔

(۲) خواجہ میر دردؔ۔ یہ بھی میر صاحب کے مخلص دوست تھے اور میر صاحب خود بھی ان سے خلوص برتتے تھے ان کے یہاں جو ہر مہینہ کی پندرہ تاریخ کو مشاعرہ ہوتا تھا میر صاحب اس میں برابر شریک ہوتے تھے اور آخر میں انھیں کے ایماء سے یہ مشاعرہ میر صاحب کے مکان پر منعقد ہونے لگا تھا۔

(۳) میر سجاد۔ اکبر آباد کے باشندے تھے مگر قیام ان کا بھی شاہجہان آباد میں تھا۔ ان کے یہاں بھی مشاعرہ ہوتا تھا اور میر صاحب التزاماً اس میں شریک ہوتے تھے۔ ان کے ساتھ میر صاحب کو اخلاص تھا۔

۴- میر ولایت علی خاں - برادر محتشم علی خان حشمت۔
۵- اشرف علی خان فغاںؔ۔
۶- محمد اسمٰعیل بیتابؔ۔
۷- انعام اللہ خاں یقینؔ۔
۸- میاں شہاب الدین ثاقبؔ۔
۹- سید عبدالولی عزلتؔ۔
۱۰- میر عبدالحیٔ تاباںؔ۔
۱۱- حسن علی شوقؔ۔
۱۲- قائمؔ چاند پوری۔
۱۳- فضل علی داناؔ۔
۱۴- میر حسن
۱۵- ہدایت اللہ ہدایتؔ۔
۱۶- محمد عارف۔ عارفؔ۔
۱۷- بیدار (میر محمدی)۔
۱۸- لالہ ٹیک چند بہارؔ۔
۱۹- میر عبدالرسول نثارؔ۔
۲۰- محمد امان اللہ غریبؔ۔
۲۱- محمد محسن۔ محسنؔ
۲۲- ضیاء الدین ضیاءؔ۔
۲۳- میاں ابراہیم۔
۲۴- میر گھاسی۔ میر علی نقی (ان کے یہاں بھی مشاعرہ ہوتا تھا)
(صفحہ ۵۵ ۵۶ کلیات میرؔ)

میر کے ان دوستوں میں کہیں مولانا آسی نے اپنے پردادا "عبدالحکیم عاشقؔ (عرف نحقن) کا نام نہیں لیا۔ جو بقول مولانا آسی کے میر کے "ہم جلیس" تھے اور صاحب

دیوان شاعر بھی اس مرتبہ کے؟ جن کی غزلوں پر میرؔ نے غزلیں کہی تھیں۔ اور ان کے دیوان کا حاشیہ بقول آسی ایک تذکرے کی شان رکھتا ہے۔ مولانا آسیؔ قمطراز ہیں۔

"میں بیشتر فارسی کے دیوان اور اپنے پردادا مرحوم (عبد الحکیم عاشق) کا دیوان دیکھتا رہا۔ اس وقت نہ اس ضخیم مجلد کتاب سے مجھے کچھ زیادہ لگاؤ تھا نہ ان کے کلام سے کچھ زیادہ لطف اندوز ہوتا تھا۔ بلکہ اس کے حواشی کی عبارتیں دیکھکر مزہ آتا تھا۔ (جس پر)

کہیں لکھا تھا کہ یہ غزل میر تقی میرؔ کی غزل پر کہی اور میر صاحب کو سنائی!
میر صاحب نے اس کی بڑی داد دی ۔ ؟

"کہیں یہ تھا کہ ۔ میر صاحب نے میری اس غزل پر غزل کہی اور میری غزل سے اچھی نہ کہہ سکے اور میں نے ان کے اس شعر پر اعتراض کئے"۔

"کہیں ۔ قائمؔ کی ملاقات کا حال"!

"کہیں ۔ سوداؔ کی بات چیت . . . . !"

میرؔ کے یہ بے تکلّف دوست اور "ہم جلیس" عبد الحکیم عاشقؔ" جن کا ذکر نہ تو میرؔ نے اپنے تذکرے میں کیا ہے نہ مصحفیؔ اور میر حسنؔ وغیرہ نے یہاں تک کہ خود ان کے پرپوتے مولانا آسیؔ میرؔ کے معاصر شعراء کا ذکر کرتے ہیں تو وہ بھی اس بلند پایہ شخصیت کو میرؔ کے احباب کی فہرست سے خارج کر دیتے ہیں۔؟ سمجھ میں نہیں آتا کہ ایسی عظیم شخصیت جسے میرؔ کی ہم جلیسی اور ہم نشینی کا شرف حاصل ہو چکا ہے اس کے نام کو "قلم انداز" کر دینے میں کیا مصلحت تھی! "کلیات میرؔ" کے اس مقدمہ میں میرؔ کے حریفوں کا بھی ایک جگہ ذکر کیا گیا ہے چونکہ مولانا آسی نے اپنے پردادا کے دیوان کے حاشیئے پر ایسی عبارتیں بھی دیکھی ہیں جن سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ انھوں نے میرؔ پر اعتراضات بھی کئے تھے اس لئے مولانا آسی کے اس عنوان (میر صاحب کے حریف) کا بھی جائزہ لینا ضروری ہے؟

(۱) خاکسار ۔ انھوں نے "سید الشعراءؔ" اپنے لئے خطاب تجویز کیا تھا جو غالباً "تخلص میرؔ کا جواب تھا۔ میر صاحب کے تذکرے "نکات الشعراءؔ" کے جواب میں ایک تذکرہ لکھا تھا جو ہمیشہ نایاب رہا اور اب بھی نایاب ہے!

میر صاحب نے ان کے کلام پر اعتراض بھی کیا ہے؛ اور معلوم ہوتا ہے کہ ان کو اس سے ایک قسم کی مخاصمت تھی۔

(۲) عاجز۔ یہ بھی میر صاحب کے حریف تھے اور میر صاحب نے ان کے کلام پر اعتراض بھی کئے ہیں۔

(۳) بقاؔ۔ میر و سودا دونوں کے حریف تھے اور دونوں استادوں کے کمالات فن کے قائل نہ تھے چنانچہ ایک مرتبہ میر صاحب کے لئے کہا ہے

پگڑی اپنی سنبھالئے گا میرؔ
اور بستی نہیں یہ دلیؔ ہے

سوداؔ۔ اگرچہ میرؔ ان کو اور یہ میرؔ کو استاد فن جانتے تھے پھر بھی دونوں کے دیوانوں میں ایسے شعر موجود ہیں جن میں ایک دوسرے پر چوٹیں کیگئی ہیں ان لوگوں کے علاوہ بہت سے ایسے لوگ ہیں جن کے لئے میر صاحب کے قلم سے توصیفی جملے نکلے ہیں یا ان کی مذمت کی گئی ہے مگر ہر ایک کو انتخاب کرنا فرصت چاہتا ہے۔" (صفحہ ۵۶-۵۷ کلیات میر)

لیکن — حیرت کا مقام یہ بھی ہے جو اس میں بھی میر کے ہم جلیس، حریف یا معترض "عبدالحکیم عاشق"، کا نام کہیں نظر نہیں آتا — کیونکہ مولانا آسی نے ہوا کا رخ پہچانتے ہوئے اپنے والد ماجد خلیفہ حسام الدین احمد حسامؔ مرحوم کو بلا ثبوت کے "غالبؔ کے کمال فن کا راز دان" تک کہہ دینے میں کوئی جھجھک نہیں محسوس فرمائی تو "عہد میرؔ" کے بارے میں یہ جانتے ہی تھے کہ اس زمانے کے واقعات کی تردید کرنے کی جرأت کیسے ہوسکتی ہے! پورے سوا سو سال کے بعد — ؟

اس میں کوئی شک نہیں کہ ان دونوں مبینہ "قلمی بیاضوں" کی تفصیلات مولانا آسی نے جس ذہانت کے ساتھ پیش کی ہیں انھیں دیکھ کر اس یقین کے قدم ڈگمگا جاتے ہیں کہ یہ بیاضیں حقیقتاً عالم اسباب سے تعلق رکھتی بھی ہیں یا نہیں؛ حالانکہ ان بیاضوں کے وجود کو ثابت کرنے کے لئے وہ تمام لوازم فراہم کئے گئے ہیں جو اس قسم کی بیاضوں پر مہر تصدیق ثبت کرسکتے ہیں۔ مثلاً ڈاکٹر عظمت الٰہی سلوتوی سے منسوب بیاض کی۔

مرقع کشی اِن الفاظ میں کی گئی ہے۔

"میرے خیال میں کم از کم ساٹھ ستر برس ادھر کی نہیں تو چالیس پچاس برس ادھر کی لکھی ہوئی ضرور ہے اس کا کاغذ وہی قدیم ہے۔ طرزِ تحریر و جدولیں تمام تر قدیم وضع پر ہیں۔

آب رسیدہ ہے اور اسی وجہ سے بعض جگہ سیاہی پھیل گئی ہے اور بعض مصرعے غائب ہیں یا نہیں پڑھے جاتے۔ حاشیہ پر چوہوں کے دانتوں کی دست درازیاں بھی ہوئی ہیں" (صفحہ ۳۴۔ مکمّل شرح)

جس بیاض کی شکل صورت ان الفاظ میں بیان کی جائے ظاہر ہے اس کی حقیقت پر کسے شک و شبہ ہو سکتا ہے؟ اور جس کتاب کی صوری حیثیت اس انداز کی ہوگی تو اس کے "معنوی" چہرے کے خد و خال کچھ اسی قسم کے ہونے بھی چاہئے؟

"اس بیاض میں اٹھائیس ۲۸ غزلیں مرزا کی ہیں ان اٹھائیس ۲۸ میں دو غزلیں وہ ہیں جو مطبوعہ ہیں ایک یہ کہ ؎

بہت سہی غمِ گیتی شراب کم کیا ہے
غلامِ ساقیٔ کوثر ہوں مجھکو غم کیا ہے

مگر یہ مطلع نہیں ہے بلکہ دوسرا یہ مطلع ہے۔

رقیب پر ہے اگر لطف تو ستم کیا ہے
تمھاری طرزِ روش جانتے ہیں ہم کیا ہے

یہ غزل دیوان مطبوعہ میں موجود ہے دوسری غزل یہ ہے ؎

میں ہوں مشتاقِ جفا مجھ پہ جفا اور سہی
تم ہو بیداد سے خوش اس سے سوا اور سہی

یہ غزل مطبوعہ دیوان غالب میں تو نہیں ہے مگر "اردوئے معلّٰی" میں موجود ہے اور نواب علاء الدین خاں علائی تخلص کے لئے لکھی گئی چنانچہ مقطع میں لکھتے ہیں۔

مجھ سے غالب یہ علائی نے غزل لکھوائی
ایک بیداد گرِ رنج فزا اور سہی

.... یہ وہ غزلیں ہیں جو مطبوعہ موجود ہیں اور اس بیاض میں بھی پائی جاتی ہیں۔ یہ خیال ضرور پیدا ہوتا ہے کہ ان غزلوں کے اس بیاض میں موجود ہونے کی کوئی خاص وجہ نہیں ہے مگر اس خیال سے ایک قسم کی تسکین ہوجاتی ہے کہ ممکن ہے مرزا نے یادداشت کے طور پر لکھائی ہوں اور یہی سبب ہو کہ جس کی وجہ سے یہ اصل دیوان میں موجود نہیں ہیں۔ ایک غزل کا ایک مطلع صرف بیاض میں ہے اور ایک نہیں۔ "کم کیا ہے اور ہم کیا ہے"۔ والی غزل کا یہ پہلا مطلع ہے

بہت سہے غم گیتی شراب کم کیا ہے
غلام ساقیٔ کوثر ہوں مجھکو غم کیا ہے

ممکن ہے کہ یہ غزل مرزا کو یاد ہو اور انھوں نے اپنی یاد کی بنا پر مطبوعہ دیوان میں لکھوا کر ایک مطلع اور زیادہ کہہ لیا ہو۔ باقی تمام غزلیں وہ ہیں کہ جن کا کوئی شعر نہ مطبوعہ دیوان غالب میں ہے اور نہ غیر مطبوعہ میں! اور نہ اس کے متعلق کہیں سے کوئی پتہ چلتا ہے البتہ شرح لکھتے وقت بعض اشعار کی نسبت بعض لوگوں نے کہا کہ یہ ہم نے پہلے بھی سنے تھے۔

(صفحہ ۳۴ - ۳۶ مکمل شرح)

مولانا آسی نے جس مصلحت سے ان دو مطبوعہ غزلوں کا اس بیاض میں شامل ہونا ظاہر کیا ہے؟ وہ سامنے کی بات ہے۔ ان غزلوں کے ذکر کا مقصد سوائے اس کے اور کیا ہوسکتا ہے کہ ان غزلوں کے سہارے اس کلام کی بھی توثیق کرالی جائے جس کا تعلق غالب سے نہیں ہے۔

اس مفروضہ بیاض میں دو مطبوعہ غزلوں کے وجود سے مولانا آسی نے جو نتیجہ نکالا ہے وہ صحیح نہیں ہے۔ بلکہ جہاں تک میں سمجھتا ہوں یہ مطبوعہ غزلیں ہی اس بیاض کے وجود کی تردید کے لئے کافی ہیں۔ اور مولانا آسی کے ارشاد کے مطابق۔

"ممکن ہے کہ یہ غزل مرزا کو یاد ہو اور انھوں نے اپنی یاد کی بنا پر مطبوعہ دیوان میں لکھوا کر ایک مطلع اور زیادہ کہہ لیا ہو۔!"

یہ بات صاف ہو جاتی ہے (بقول مولانا آسی) کہ غالب نے شاکر کو قیام رام پور کے زمانے میں یہ غزلیں لکھوائی تھیں — اور اس وقت تک ان کا دیوان شائع نہیں ہوا تھا۔ چنانچہ جب دیوان کی طباعت کا وقت آیا تو انھوں نے اپنی یاد سے اس غزل کے سب اشعار ایک مطلع کا اضافہ کر کے اس دیوان میں شامل کر دیئے یعنی قیام رام پور کا یہ واقعہ دیوان غالب کے طبع اول ۱۸۴۱ء سے پہلے ہی ظہور میں آ چکا تھا — مگر حقیقت یہ ہے کہ اس وقت تک غالب کا تعلق ہی دربار رام پور سے نہیں ہوا تھا وہاں جانے کا کیا سوال؟ وہ پہلی بار ۱۸۶۰ء اور دوسری مرتبہ ۱۸۶۵ء میں رام پور گئے اس کے علاوہ ان کا رام پور میں قیام نہ ان کے کسی خط سے ثابت ہے نہ کسی دوسری شہادت سے۔

بالفرض محال اگر کسی ایسی بیاض کا وجود بھی مان لیا جائے تو اس میں جو غزلیں مولانا آسی نے ملاحظہ فرمائی ہیں شک و شبہ سے خالی نہیں ہیں۔

خود مولانا آسی نے سات شعر کی اس غزل پر جس کا مطلع ہے۔

یا مجھے شبنم گریاں ہی بنایا ہوتا
ورنہ یارب گل خنداں ہی بنایا ہوتا

ان الفاظ میں شک و شبہہ کا اظہار کیا ہے۔

"غزل مندرجہ ذیل اگرچہ دو مختلف قدیم بیاضوں میں "مرزا غالب" ہی کے نام سے ملتی ہے مگر جہاں تک میرا خیال ہے میں نے کہیں کسی اور کے نام سے بھی دیکھی ہے اور حقیقتاً یہ ایک عجیب و غریب بات ہے کہ اس میں مرزا غالب کا رنگ بالکل نہیں ملتا۔ شاہ ظفر کے رنگ سے ملتی جلتی ہے۔ جس کی ایک خوش عقیدہ یہی تعبیر لے سکتا ہے کہ شاید مرزا نے کبھی "بادشاہ" کی فرمائش سے یہ غزل لکھی ہو۔ اور وہ انھیں کے پاس رہ گئی ہو — اور انھیں کے نام لوگوں نے سنی ہو۔ بہر حال غزل یہ ہے۔ اگر حقیقتاً یہ غزل مرزا غالب ہی کی ہے تو کمال ہے؟ ان لوگوں کو خصوصیت سے داد دینی چاہیئے جو کہتے ہیں کہ مرزا اس خاص رنگ پر قادر نہیں تھے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے دراصل اپنے واسطے ایک جداگانہ روش نکالی تھی اور اس

مضبوطی سے قائم تھے"۔ (صفحہ ۹۱ مکمل شرح)

غالب، ذوق کی وفات ۱۸۵۴ء کے بعد "قلعۂ معلی" سے وابستہ ہوئے۔ ظاہر ہے "بادشاہ" (شاہزادہ نہیں) نے اس غزل کی فرمائش اسی زمانے میں کی ہوگی۔ اور اسی زمانے میں غالب نے اسے کہا بھی ہوگا؟ پھر کسی طرح یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ یہ غزل عالم وجود میں آنے سے پہلے اس بیاض میں کس طرح پہنچ گئی جو مسلمہ طور پر ۱۸۴۱ء سے پہلے کا مخطوطہ کہا جاتا ہے سات شعر کی یہ غزل جس کا مطلع

یا مجھے شبنم گریاں ہی بنایا ہوتا
ورنہ یارب گل خنداں ہی بنایا ہوتا

اور آخری شعر ـــــ !

ایک عالم کی جو آنکھوں سے گرایا جوں اشک
کاش کے گوہر غلطاں ہی بنایا ہوتا

ایسے عام فہم اور پیش پا افتادہ مضامین پر مشتمل ہے جس کی "شرح" لکھنے کا بظاہر کوئی سوال ہی نہیں تھا لیکن انھیں غالب کے "نوادر" میں جگہ دینے کے لئے اس کے علاوہ کوئی "میدان" بھی تو نہیں تھا ـــ اسی طرح حافظ عبدالرحیم حقیر عظیم آبادی کی اس غزل کو بھی "غیر مطبوعہ کلام غالب" قرار دے کر اس کی بھی شرح لکھدی گئی ہے (ملاحظہ ہو مکمل شرح ص ۲۴۲-۲۴۴)

بتائیں ہم تمھارے عارض کا کل کو کیا سمجھے
اسے ہم سانپ سمجھے اور اسے من سانپ کا سمجھے

اسی غزل کا ذکر کرتے ہوئے مولانا عرشی رام پوری نے حواشی "نسخۂ عرشی" میں تحریر فرمایا ہے

"غالب کے نام سے (یہ اشعار) مندرج ہیں۔ نیز پہلی بیاض (منسوب بہ ڈاکٹر عظمت الٰہی سلونوی) کا مرتب مجہول محض ہے اور رنگ کلام کو شہادت میں پیش کرنا بیحد خطرناک ہے۔ اس لئے میں اس کلام کو غالب کے یقینی کلام کا درجہ اس وقت تک نہیں دے سکتا جب تک کہ کوئی اور مستند شہادت سامنے نہ آجائے"۔ (دیوان غالب (نسخۂ عرشی) صفحہ ۳۸۵-۳۸۶)

مولانا آسی کے پیش کردہ "غیر مطبوعہ کلام غالب" کے بارے میں جس قدر تفصیلات پیش کی جا چکی ہیں ان سے غالباً یہ نتیجہ نکالنا کچھ زیادہ دشوار نہیں ہے کہ یہ تمام کلام قطعاً الحاقی ہے اور غلط طور پر غالب کے نام سے منسوب کر دیا گیا ہے اس سلسلے میں مشہور غالب شناس جناب مالک رام اور جناب محمد اکرام کا زاویۂ نگاہ پیش کیا جا چکا ہے۔ اب ڈاکٹر مولوی عبدالحق مرحوم (بابائے اردو) کا وہ تبصرہ بھی ملاحظہ فرمائیں جو "مکمل شرح کلام غالب" کی اشاعت کے بعد ہی سہ ماہی "اردو" نے شائع کیا تھا اور بعد میں "تنقیدات عبدالحق" کے نام سے کتابی شکل میں بھی شائع ہو چکا ہے۔

ڈاکٹر مولوی عبدالحق مرحوم لکھتے ہیں ــ

"حال میں "مکمل شرح" کے نام سے ایک شرح دیوان غالب کی شائع ہوئی ہے اس کے مؤلف مولوی عبدالباری آسی الدنی سکریٹری انجمن خازن ادب لکھنؤ ہیں۔ یہ ایک بڑی ضخیم کتاب ہے مولف نے اس کے لکھنے میں بڑی محنت کی ہے۔ معانی و مطالب کے بیان کرنے میں اپنی طرف سے کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی اکثر دوسرے اساتذہ کے (اور کہیں کہیں اپنے بھی) شعر نظیر میں پیش کئے ہیں۔ اگرچہ بعض مقامات پر بے جوڑ اور بے محل معلوم ہوتے ہیں دوسرے شارحوں کی بھی موقع بموقع اصلاح کرتے جاتے ہیں اور جہاں کہیں ضرورت ہوتی ہے بعض اشعار کے کئی کئی معنی بیان کرتے ہیں یہ کام کم و بیش دوسرے شرح نویسوں نے بھی کیا ہے لیکن ایک خاص بات جو اس شرح میں ہے وہ سب سے نرالی ہے۔ فاضل شارح نے اس کتاب میں جودت طبع غیر معمولی اور جدت اور طباعی کا عجیب و غریب ثبوت دیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ایک آدھ اور شرح میں بھی کہیں کہیں جدت نظر آتی ہے مگر اس سے بدمذاقی کا رنگ جھلکتا ہے۔ مگر یہاں فاضل شارح نے ذوق سخن کے پردے میں "جو گل کھلائے" ہیں وہ قابل دید ہیں اس کے متعلق کچھ زیادہ لکھنا عبث ہے ......!

غرض یہ شرح لطفِ سخن کے تمام اوصاف کے ساتھ "سامان تفریح بھی

ہے۔ صدیق بکڈپو امین آباد لکھنؤ سے مفصلہ ذیل قیمت پر مل سکتی ہے۔

(صفحہ ۱۶-۲۲ تنقیدات عبدالحق مطبوعہ شمس الاسلام پریس حیدرآباد دکن ۱۹۳۲ء)

مولوی عبدالحق مرحوم کی طرح مولانا عرشی نے "نسخۂ عرشی" کی تکمیل تک کچھ زیادہ احتیاط سے کام لیا۔ مگر ان الفاظ میں بہت کچھ وہ غیر اعتمادی موجود ہے جو اس کو مشکوک و مشتبہ کر سکتی تھی۔ مولانا عرشی تحریر فرماتے ہیں۔

"یہ شعر۔ نیز آئندہ جو شعر آسی کے حوالے سے درج ہوں گے وہ سب بھی جناب عبدالباری آسی الدنی کی کتاب "مکمل شرح کلام غالب" شائع کردہ صدیق بکڈپو لکھنؤ سے ماخوذ ہیں۔ یہ کامل و ناقص غزلیں انھیں ایک بیاض مملوکہ ڈاکٹر عظمت الٰہی سلونوی میں دستیاب ہوئی تھیں جس میں میرزا کے علاوہ اور شعراء کا کلام بھی درج تھا۔ ان غزلوں کے شروع میں پہلے صفحہ پر جو اندراج ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی صاحب شاکر تھے ان کو مرزا نے وقت بیوقت رام پور میں یہ غزلیں لکھوائیں اور وہ ان کے پاس رہیں۔ (دیباچہ شرح ۴۸۳)

(صفحہ ۲۸۵۔ نسخۂ عرشی)

مولانا عرشی کی مذکورہ بالا عبارت تو "نسخۂ عرشی" کی تشریحات سے تعلق رکھتی ہے لیکن مولانا کا مندرجہ ذیل مکتوب "حرف آخر" کا درجہ رکھتا ہے۔

۵ رجون ۶۴ء

محترم و مکرم

مکرمت نامے ملے! یاد فرمائی کا دلی شکریہ پیش ہے۔

میں اب بحمداللہ اچھا ہوں۔ آپ کی فرمائش کی تعمیل میں تاخیر میری سستی سے ہوئی ہے آج میں نے اکبر سلمہٗ سے کہا ہے کہ وہ میرا "نسخہ دیوان" (نسخۂ عرشی) دیکھ کر آپ کو لکھ بھیجیں کہ کون کون سی غزلیں میری "دانست" میں جالی (جعلی) ہیں۔ مجملاً عرض کروں گا کہ "بھوپالی والی" غزل کے علاوہ آسی الدنی" کے حوالے سے شائع شدہ تمام غزلیں قطعاً "جعلی" ہیں اب اس میں مطلق شبہ کی گنجائش نہیں ان کے علاوہ بعض مفردات

بھی دوسروں کے ہیں جو غالب کے نام سے مشہور کردیئے گئے ہیں کبھی رامپور بھی تشریف لائیے نا۔؟ والسلام

مخلص۔ عرشی

(مکتوب گرامی مولانا عرشی بنام نادم سیتاپوری)

محبی قاضی معراج دھول پوری مرحوم لکھتے ہیں ـــ!

"مولوی عبدالباری آسی نے بھی اس ضمن میں بڑی کوشش سے کام لیا ہے اور مرزا کے غیر متداولہ کلام کو ہدیہ شائقین کیا ـ لیکن وہ تحقیق کی کسوٹی پر پورا نہ اترا۔ چنانچہ مقبول بھی نہ ہو سکا اور ذمہ دار اہل قلم نے اس کو غالب کا کلام تسلیم کرنے سے بالوجوہ انکار کر دیا۔ غالباً اس وجہ سے بھی کہ مرحوم (مولانا آسی) نے "خلط مبحث" کر کے اصل و نقل میں کوئی امتیاز قائم نہیں رکھا۔"

(ہفت روزہ ہماری زبان علیگڈھ۔ یکم اگست ۱۹۶۱ء)

جناب اکبر علی خاں رام پوری (ایڈیٹر ماہنامہ نگار رام پور) کی غالب شناس شخصیت بھی کسی تعارف کی محتاج نہیں ہے ارشاد فرماتے ہیں ـــ!

"ان اعتراضات سے قطع نظر جلیل قدوائی کے بیان کے مطابق یہ غزلیں خود آسی مرحوم کی فکر کا نتیجہ ہیں اور یہ احباب کی تفریح طبع کی خاطر غالب کے نام سے مختلف مجالس میں پیش کی جاتی رہی ہیں۔ ان محفلوں کے شرکا، سب یہ جانتے تھے کہ ان اشعار کا اشارہ غالب کی طرف محض ایک "لطیفے" کی حیثیت رکھتا ہے نہ معلوم کیسے آسی صاحب نے اس معاملے میں سنجیدگی اختیار کرتے ہوئے "فسانہ طرازی" سے کام لیا اور پہلے "نگار" (لکھنؤ) اور پھر اپنی مذکورہ شرح (مکمل شرح کلام غالب) میں تحریری طور پر غالب کے نامۂ اعمال میں داخل کر دیا جلیل قدوائی ان شرکاء میں سے ایک ہیں ـ خود مولانا نیاز فتح پوری صاحب نے ایک موقع پر زیر لب تبسم کے ساتھ اس "جعل" کی تصدیق فرمائی تھی۔"

(مضمون ضمیمہ نسخۂ عرشی غیر مطبوعہ)

علی جواد زیدی اپنے مضمون (اودھ کی ادبی اور شعری محفلیں) میں تحریر فرماتے ہیں ـــ

"آسی الدنی کچھ تو لکشور پریس سے وابستگی کی بنا پر اور کچھ افتادِ طبع کی وجہ سے اساتذہ کے کلام پر اچھی نظر رکھتے تھے۔ ایک زمانے میں انھوں نے غالب کے رنگ کی کچھ غزلیں خود لکھکر غالب کے نام سے چھپوا دیں۔ اس کا اقرار انھوں نے خود مجھ سے ایک بار "تعلّی" کے انداز میں کیا کہ ـــــ

" بڑے بڑے غالب پرست اس کو بھانپ نہ پائے "

بعضوں کا یہ کہنا ہے کہ دیوانِ غالب کے آسی ایڈیشن میں کچھ اس طرح کی بھی غزلیں شامل ہو گئی ہیں"

(ماہنامہ "صبح دہلی" ستمبر ۱۹۶۵ء صفحہ ۱۹-۲۰)

مولانا آسی مرحوم نے اپنی "مکمّل شرح کلام غالب" میں "نسخہ حمیدیہ" کے اشعار اور "الحاقی کلام" کو کچھ اس طرح خلط ملط کر دیا ہے کہ اصل اور نقل میں امتیاز دشوار ہے! ذیل میں "مکمّل شرح" مذکور کی جن الحاقی غزلوں کو پیش کیا جا رہا ہے وہ زیادہ تر "نسخہ عرشی" سے نقل کی گئی ہیں اس کے علاوہ چند غزلیں جو "نسخہ عرشی" میں شامل ہونے سے رہ گئی تھیں انھیں مولانا آسی کی "مکمّل شرح" سے نقل کیا جا رہا ہے جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں مولانا آسی نے "مکمّل شرح" میں جس حد تک الحاقی کلام شامل کیا ہے وہ یہی غزلیں ہیں جنھیں درج ذیل کیا جا رہا ہے پھر بھی اس کا امکان ہے کہ کوئی کلام سہواً رہ گیا ہو! اس کی تصحیح کی جا سکتی ہے۔

ان غزلوں کو نقل کرنے میں کسی خاص ترتیب کو ملحوظ نہیں رکھا گیا ـــ!

(۱)

آفت آہنگ ہے کچھ نالۂ بلبل ورنہ
پھول ہنس ہنس کے گلستاں میں فنا ہو جاتا

کاش ناقدر نہ ہوتا ترا اندازِ خرام
میں غبارِ سرِ دامانِ فنا ہو جاتا

یک شب فرصتِ شوخی ہے اک آئینہ غم
رنگِ گل کاش گلستاں کی ہوا ہو جاتا

مستقل مرکزِ غم پر ہی نہیں تھے ورنہ
ہم کو اندازۂ آئینِ وفا ہو جاتا

دستِ قدرت ہے مرا خشت بدیوارِ فنا
گر فنا بھی میں نہ ہوتا تو فنا ہو جاتا

حیرت اندوزئ اربابِ حقیقت مت پوچھ
جلوہ اِک روز تو آئینہ نما ہو جاتا

قصد کعبہ تھا مگر موت کی عجلت طلبی
.. ..

(۲)

بدتر از ویرانہ ہے فصل خزاں میں صحن باغ
خانۂ بلبل بغیر از خندۂ گل بے چراغ

پتہ پتہ اب چمن کا انقلاب آمودہ ہے
نغمۂ مرغ چمن زا ہے صدائے بوم و زاغ

ہاں بغیر از خواب مرگ آسودگی ممکن نہیں
رخت ہستی باندھنا حاصل ہو دنیا سے فراغ

شور طوفان بلا ہے خندۂ بے اختیار
کیا ہے گل کی بیزبانی کیا ہے یہ لالے کا داغ

چشم پرنم رہ - زمانہ منقلب ہے اے اسدؔ
اب یہی ہے بس مئے شادی سے پُرتا ایاغ

(۳)

جوں شمع ہم اک سوختہ سامانِ وفا ہیں
اور اس کے سوا کچھ نہیں معلوم کہ کیا ہیں

اک سرحدِ معدوم میں ہستی ہے ہماری
سازِ دلِ بشکستہ کی بیکار صدا ہیں

جس رخ پہ ہوں ہم سجدہ اسی رخ پہ ہے واجب
گو قبلہ نہیں ہیں مگر اک قبلہ نما ہیں

مت ہوجیو اے سیل فنا ان سے مقابل
جانبازِ الم نقش بداماں بقا ہیں

پائی ہے جگہ ناصیۂ بادِ صبا پر
خاکستر پروانۂ جانبازِ وفا ہیں

ہر حال میں ہیں مرضیٔ صیاد کے تابع
ہم طائر پرسوختۂ رشتہ بپا ہیں

اے وہم طرازانِ مجازی و حقیقی
عشاق فریبِ حق و باطل سے جدا ہیں

ہم بیخودیٔ شوق میں کر لیتے ہیں سجدے
یہ ہم سے نہ پوچھو کہ کہاں ناصیہ سا ہیں

اب منتظرِ شورِ قیامت نہیں غالبؔ
دنیا کے ہر اک ذرے میں سو حشر بپا ہیں

(۴)

وضع نیرنگیٔ آفاق نے مارا ہم کو
ہو گئے سب ستم و جور گوارا ہم کو

دشت وحشت میں نہ پایا کسی صورت سے سراغ
گرد جولانِ جنوں تک نے پکارا ہم کو

عجز ہی اصل میں تھا حاملِ صد رنگ عروج
ذوق پستیٔ مصیبت نے ابھارا ہم کو

ضعف مشغول ہے بیکار بہ سعی بیجا
کر چکا جوشش جنوں اب تو اشارا ہم کو

صور محشر کی صدا میں ہے فسونِ امید
خواہش زیست ہوئی آج دوبارا ہم کو

(۵)

حسن بے پروا گرفتار خود آرائی نہو ‏ گر کمیں گاہ نظر میں دل تماشائی نہو
ہیچ ہے تاثیر عالمگیریٔ ناز و ادا ‏ ذوق عاشق گر اسیر دام گہرائی نہو
خود گداز شمع آغاز فروغ شمع ہے ‏ سوزش غم درپئے ذوق شکیبائی نہو
تار تار پیرہن ہے اک رگ جان جنوں ‏ عقلِ غیرت پیشہ حیرت سے تماشائی نہو
بزم کثرت عالم وحدت ہے بینا کیلئے ‏ بے نیاز عشق اسیر زور تنہائی نہو

ہے محبت رہزن ناموس انساں اے اسد
قامت عاشق پہ کیوں ملبوس رسوائی نہو

(۶)

نہ پوچھ حال اس انداز اس عتاب کے ساتھ ‏ لبوں پہ جان بھی آجائیگی جواب کے ساتھ
مجھے بھی تاکہ تمنا سے ہو نہ مایوسی ‏ ملو رقیب سے لیکن ذرا حجاب کے ساتھ
نہو! بہرہ زہ روادار سعی بیہودہ ‏ کہ دور عیش ہے مانا خیال و خواب کے ساتھ
بہر نمط غم دل باعثِ مسرت ہے ‏ نموئے حسرت دل ہے ترے شباب کے ساتھ
.. .. ‏ سکون دل کو تعلق ہے اضطراب کے ساتھ
لگاؤ اس کا ہے باعث قیام ہستی کا ‏ ہوا کو لاگ بھی ہے کچھ! مگر حباب کے ساتھ

ہزار حیف کہ اتنا نہیں کوئی غالب
کہ جاگنے کو ملا دیوے آکے خواب کے ساتھ

(۷)

نسیم صبح جب کنعاں میں بوئے پیرہن لائی ‏ پئے یعقوب ساتھ اپنے نوید جان و تن لائی
وقار ماتم شب زندہ دار ہجر رکھنا تھا ‏ سپیدی صبح غم کی دوش پر رکھ کر کفن لائی
ز آفت گاہ صحرائے ازل تا عرصۂ امکاں ‏ مگر روح رواں فتراک میں رنج و محن لائی
شہید شیوۂ منصور ہے اندازِ رسوائی ‏ مصیبت پیشگی مدعا دار و رسن لائی

وفا دامن کش پیرایۂ ہستی ہے اے غالب
کہ پھر نزہت گہ غربت سے تا حدِ وطن لائی

(۸)

وفا جفا کی طلبگار ہوتی آئی ہے — ازل کے دن سے یہ اے یار ہوتی آئی ہے
جواب جنت بزم نشاط جاناں ہے — مری نگاہ جو خونبار ہوتی آئی ہے
عفو سے جوش جنون و حشیو مبارک ہو — بہار ہدیۂ انظار ہوتی آئی ہے
دل و دماغ وفا پیشگاں کی خیر نہیں — جگر سے آہ شرربار ہوتی آئی ہے

(۹)

وجہ مایوسیٔ عاشق ہے تغافل ان کا — نہ کبھی قتل کریں گے نہ پشیماں ہونگے
دل سلامت ہے تو صدموں کی کمی کیا ہم کو — اُن سے اُن سے تو بہت جاں کے خواہاں ہونگے
منتشر ہو کے بھی دل جمع رکھیں گے یعنی — ہم بھی اب پیرو گیسوئے پریشاں ہونگے
گردش بخت نے مایوس کیا ہے لیکن — اَب بھی ہر گوشۂ دل میں کئی ارماں ہونگے
ہے ابھی خوں سے فقط گرمیٔ ہنگامۂ اشک — پر یہ حالت ہے تو نالے شرر افشاں ہونگے
باندھکر عہد وفا اتنا تنفر "ہے ہے" — تجھ سے بے مہر کم - اے عمرِ گریزاں ہونگے
اس قدر بھی دل سوزاں کو نہ جان افسردہ — ابھی کچھ داغ تو اے شمع فروزاں ہونگے
عہد میں تیرے کہاں گرمیٔ ہنگامۂ عیش؟ — گل مری قسمت واژونہ پہ خنداں ہونگے
خوگر عیش نہیں ہیں ترے برگشتہ نصیب — ان کو دشوار ہیں وہ کام جو آساں ہونگے

موت پھر زیست نہ ہو جائے یہ ڈر ہے غالب
وہ مری نعش پہ انگشت بہ دنداں ہونگے

(۱۰)

نمائش پردہ دار طرز بیداد تغافل ہے — تسلی جان بلبل کے لئے خندیدن گل ہے
نمود عالم اسباب کیا ہے لفظ بے معنی — کہ ہستی کی طرح مجھکو عدم میں بھی تامل ہے
نہ رکھ پابند استغنا کو قیدی اسم عالم کا — ترا دست دعا بھی رخنہ انداز توکل ہے
نہ چھوڑا قید میں بھی وحشیوں کو باد گلشن نے — یہ چاک پیرہن گویا جواب خندۂ گل ہے

ابھی دیوانگی کا راز کہہ سکتے ہیں ناصح سے
ابھی کچھ دقت ہے غالبؔ ابھی فصل گل و مل ہے

(١١)

بھولے ہوئے جو غم ہیں انھیں یاد کیجیے
تب جا کے ان سے شکوۂ بیداد کیجیے

خود جان دے کے روح کو آزاد کیجیے
تا کے خیالِ خاطرِ جلّاد کیجیے

حالانکہ اب یاں میں نہیں طاقتِ فغاں
پر دل یہ چاہتا ہے کہ فریاد کیجیے

بس ہے دلوں کے واسطے اک جنبشِ نگاہ
اُجڑے ہوئے گھروں کو پھر آباد کیجیے

کچھ دردمند منتظرِ انقلاب ہیں
جو شاد ہو چکے انھیں ناشاد کیجیے

شاید کہ یاس باعثِ افشائے راز ہو
لطف و کرم بھی شاملِ بیداد کیجیے

بیگانۂ رسومِ جہاں ہے مذاقِ عشق
طرزِ جدید ظلم کچھ ایجاد کیجیے

(١٢)

ہم سے خوبانِ جہاں پہلو تہی کرتے رہے
ہم ہمیشہ مشقِ از خود رفتگی کرتے رہے

کثرت آرائی خیالِ ماسوا کی وہم تھی
مرگ پر غافل گمانِ زندگی کرتے رہے

داغہائے دل چراغِ خانۂ تاریک تھے
تا مغاکِ قبر پیدا روشنی کرتے رہے

شورِ نیرنگِ بہارِ گلشنِ ہستی نہ پوچھ
ہم خوشی اکثر رہینِ ناخوشی کرتے رہے

رخصت اے تمکینِ آزاد فراقِ ہمرہاں
ہو سکا جب تک غمِ واماندگی کرتے رہے

(١٣)

درد ہو دل میں تو دوا کیجے
دل ہی جب درد ہو تو کیا کیجے

ہم کو فریاد کرنی آتی ہے
آپ سنتے نہیں تو کیا کیجے

ان بتوں کو خدا سے کیا مطلب
توبہ توبہ خدا خدا کیجے

رنج اٹھانے سے بھی خوشی ہوگی
پہلے دل درد آشنا کیجے

عرضِ شوخی نشاطِ عالم ہے
حسن کو اور خود نما کیجے

دشمنی ہو چکی بقدرِ وفا
اب حقِ دوستی ادا کیجے

موت آتی نہیں کہیں غالب
کب تک افسوس زیست کا کیجے

(١٤)

سکوت و خامشی اظہار حال بے زبانی ہے — کمین درد میں پوشیدہ راز شادمانی ہے
عیاں ہے حال و قال شیخ سے انداز دلچسپی — مگر رند قدح کش کا ابھی دور جوانی ہے
ثبات چند روزہ کار فرمائے غم و حسرت — اجل سرمایہ دار دور عیش و کامرانی ہے
گداز داغ دل شمع بساط خانہ ویرانی — تپش گاہ محبت میں فروغ جاودانی ہے
وفور خود نمائی ہے رہین جلوہ آرائی — بر وہم کامرانی جذب دل کو شادمانی ہے
دل فرماں لقب کی داد دے اے چرخ بے پروا — بغاوت وادۂ رخت و متاع کامرانی ہے

(١٥)

کس کی برق شوخئ رفتار کا دلدادہ ہے — ذرہ ذرہ اس جہاں کا اضطراب آمادہ ہے
ہے غرور سرکشی صورت نمائے عجز بھی — منقلب ہو کر بسان نقش پا افتادہ ہے
خانہ ویراں سازئ عشق جفا پیشہ نہ پوچھ — نامرادوں کا خط تقدیر تک بھی سادہ ہے
جز نشاط و سرخوشی ہے آمد فصل بہار — آج ہر سیل رواں عالم میں موج بادہ ہے

زندگانی رہرو راہ فنا ہے اے اسد
ہر نفس ہستی سے تا ملک عدم اک جادہ ہے

(١٦)

اس جور و جفا پر بھی بدظن نہیں ہم تجھ سے — کیا طرفہ تمنا ہے امید کرم تجھ سے
امید نوازش میں کیوں جیتے ہیں ہم آخر — سہتے ہی نہیں کوئی جب درد و الم تجھ سے
وارفتگئ دل ہے یا دست تصرف ہے — ہیں اپنے تخیل میں دن رات بہم تجھ سے
یہ جور و جفا سہنا پھر ترک وفا کرنا — اے حرزہ پژوہی بس عاجز ہوئے ہم تجھ سے

غالب کی وفا کیشی اور تیری ستم رانی
مشہور زمانہ ہے اب کیا کہیں ہم تجھ سے

(١٧)

یا مجھے شبنم گریاں ہی بنایا ہوتا — ورنہ یارب گل خنداں ہی بنایا ہوتا
داغ پر داغ اگر دے کے جلانا تھا مجھے — یک قلم سرو چراغاں ہی بنایا ہوتا

ان کو مطلب تھا اگر میری پریشانی سے
سر بسر زلف پریشاں ہی بنایا ہوتا

مجھکو دنیا میں سیہ بخت اگر رکھنا تھا
رنگ خال رخ خوباں ہی بنایا ہوتا

تھا جو حیراں مجھے اس شکل سے رکھنا منظور
صاف آئینہ حیراں ہی بنایا ہوتا

گر خوشی تیری یہی تھی کہ یہ نالاں ہووے
تو مجھے بلبل بستاں ہی بنایا ہوتا

ایک عالم کی جو آنکھوں سے گرایا جوں اشک
کاش کے گوہر غلطاں ہی بنایا ہوتا

(۱۸)

چاک زخم گل سے ہے رنگ تبسم بھی عیاں
بلبلوں کی سعئ ناکارہ کا حاصل کیا ہوا

عمر سب بت خانے میں نذر پرستش ہو گئی
اب ہوا بھی تو خیال حق و باطل کیا ہوا

سایہ ساں افتادگی تھی عجز بسمل کی دلیل
اے اسد زور آزما بازوئے قاتل کیا ہوا

نازش سرمایۂ عالم تھا نظروں میں وہی
ہم نوا۔ آخر مرے پہلو سے وہ دل کیا ہوا

ہر طرح جو نازش سرمایۂ کونین تھا
کیا بتاؤں ہم نوا تجھ سے کہ وہ دل کیا ہوا

(۱۹)

ہیچ ہے قدر جنوں آشفتہ سامانی بغیر
ننگ وحشت ہے گریباں چاک دامانی بغیر

پائے بند عشق رسم دہر سے آزاد ہیں
کر رہے ہیں ذکر تیرا سجدہ گردانی بغیر

محشر آشوب رسوائی ہے انداز کرم
مجرموں کا دل نہیں رہتا پشیمانی بغیر

دل کا پہلے خوگر آلام ہونا شرط ہے
کوئی مشکل رہ نہیں سکتی ہے آسانی بغیر

ہو گدائے عجز ہمت اے غرور معصیت
رنگ خارا بھی نہیں آئینہ حیرانی بغیر

ہو ندامت آشنائے عشق ممکن ہی نہیں
فکر ایجاد گریباں۔ ذوق عریانی بغیر

.. ..
اے اسد دشوار ہے جینا گراں جانی بغیر

(۲۰)

خزینہ دار مسرت ہوئی ہوائے چمن
بنائے خندۂ عشرت ہے بر بنائے چمن

بہرزہ سنجئ گلچیں نہ کھا فریب نظر
ترے خیال کی وسعت میں ہے فضائے چمن

یہ نغمہ سنجئ بلبل متاع زحمت ہے
کہ گوش گل کو نہ راس آئیگی صدائے چمن

صدائے خندۂ گل تا قفس پہونچتی ہے
نسیم صبح سے سنتا ہوں ماجرائے چمن

گل ایک کاسۂ دریوزۂ مسرت ہے
کہ عندلیب نوا سنج ہے گدائے چمن

بہار راہرو جادۂ فنا ہے اسد
گل شگفتہ ہیں گویا کہ نقش پائے چمن

حریف نالہ پرواہ ہے تو ہو پھر بھی
ہے اک تبسم پنہاں ترا بہائے چمن

(۲۱)

کرم ہی کچھ سبب لطف و التفات نہیں
انہیں ہنسا کے رلانا بھی کوئی بات نہیں

.... بزدلے آفرینش غم
غرضکہ دل کی کسی شے کو بھی ثبات نہیں

کہاں سے لاکے دکھائے گی عمر کم مایہ
سیہ نصیب کو وہ دن کہ جس میں رات نہیں

زبان حمد کی خوگر ہوئی تو کیا حاصل
کہ تیری ذات میں شامل تری صفات نہیں

خوشی خوشی کو نہ کہہ غم کو غم نہ جان اسد
قرار داخل اجزائے کائنات نہیں

(۲۲)

رنگ نے گل سے دم عرض پریشانی بزم
برگ گل ریزہ مینا کی نشانی مانگے

آمد خط سے نہ کر خندۂ شیریں کو مباد
چشم مور آئینۂ دل نگرانی مانگے

ہوں گرفتار کمیں گاہ تغافل کہ جہاں
خواب صیاد سے پرواز گرانی مانگے

وحشت شور تماشا ہے کہ جوں نکہت گل
نمک زخم جگر بال فشانی مانگے

وہ تپ عشق تمنا ہے کہ جوں رشتۂ شمع
شعلہ تا نبض جگر ریشہ دوانی مانگے

گر ملے حضرت بیدل کا خط لوح مزار
اسد آئینۂ پرواز معانی مانگے

بھوپال والی غزل

قد و گیسو میں قیس و کوہکن کی آزمائش ہے
جہاں ہم ہیں وہاں دار و رسن کی آزمائش ہے

(غالبؔ)

وسط ۱۹۵۷ء میں جب "دیوانِ غالب" مرتبہ جناب مالک رام آزاد کتاب گھر دہلی نے شائع کیا تو میرا قیام بھوپال میں تھا اور تصنیفی کاموں میں کچھ اتنا الجھا ہوا تھا کہ مجھے اس کی اشاعت کی خبر بھی نہیں ہوئی چند ماہ کے بعد غالباً مجی ڈاکٹر گیان چند کے یہاں سرسری طور پر یہ دیوان دیکھنے کا موقع ملا تو صفحہ ۲۸۶ و ۲۸۷ پر ایک غزل نظر پڑی جس کا مطلع ہے۔

بھولے سے کاش وہ ادھر آئیں تو شام ہو
کیا لطف ہے جو ابلق دوراں بھی رام ہو

لیکن نو شعر کی اس غزل کے مقطع پر جب پہنچا تو اچانک چونک پڑا۔

پیرانہ سال غالب میکش کرے گا کیا
بھوپال میں مزید جو دو دن قیام ہو

اوّل تو اس غزل کے ساتھ ماہنامہ ہمایوں لاہور (بابتہ اپریل ۱۹۳۹ء) کا حوالہ بھی موجود تھا دوسرے میرے دل میں جناب مالک رام کی "محتاط نگاری" کا اتنا اعتماد بھی تھا کہ میں کچھ عرصے کے لئے اسی غزل میں الجھ کر رہ گیا۔ "ذکر غالب" کا پہلا ایڈیشن سیتاپور میں تھا ادھر ادھر لائبریریوں میں غالب پر کچھ کتابیں الٹیں پلٹیں تو ان میں بھی کہیں غالب کے سفر بھوپال کا ذکر نہیں ملا۔ شبہ کو کچھ اور تقویت ہوئی۔ والاجاہ نواب صدیق حسین مرحوم کے عہد کا بھوپال آنکھوں میں پھر گیا۔ اور اسی کے ساتھ ساتھ وہ معتبر روایات بھی کہ۔

"علامہ فضل حق خیرآبادی اور حضرت اسمٰعیل دہلوی کے عالمانہ مناظروں کا نواب صاحب کے ذہن و شعور پر کافی گہرا اثر تھا انھوں نے صرف اس جرم میں کبھی غالب کو قابل التفات نہیں سمجھا کہ انھوں نے علامہ فضل حق کی فرمائش پر مثنوی "امتناع نظیر" لکھی تھی بقول حالی کے غالب سے یہ مثنوی علامہ نے جبراً لکھوائی تھی۔ لیکن حد درجہ خلوص اور بے تکلفی کے باوجود علامہ پوری طرح غالب کو اپنا ہم خیال نہیں بنا سکے تھے لیکن (بقول حالی) غالب کو وہابیوں سے کوئی خصومت نہیں تھی۔!!"

یہ مناظرانہ مسائل خالص عالمانہ مسائل تھے لیکن والاجاہ نواب صدیق حسن خاں کا دل و دماغ ان کے اثرات سے کبھی پاک و صاف نہیں رہا یہی وجہ تھی کہ نہ خود غالب نے کبھی بھوپال کی طرف نگاہ بھر کر دیکھا اور نہ کبھی بھوپال کے اقتدار نے انھیں پوچھا۔ نواب صاحب کے دل و دماغ پر ماضی کی یادیں کن تلخیوں کے ساتھ مسلط تھیں اس کا اندازہ صرف ایک واقعہ سے لگایا جا سکتا ہے کہ انھوں نے ایکبار علامہ سیّد اعظم حسین خیرآبادی سے شمس العلمأ علامہ عبدالحق خیرآبادی کی ملاقات کا اشتیاق ظاہر فرمایا اور کہا کہ انھیں کسی طرح سے بھوپال بلوائیے۔ علاّمہ اعظم حسین نے شمس العلماء کو خط لکھکر اطلاع دی کہ نواب صاحب آپ سے ملنے کے مشتاق ہیں؟ کچھ دنوں بعد شمس العلمأ بھوپال پہنچے علاّمہ اعظم حسین کے یہاں قیام فرمایا۔ اور انھیں کے ساتھ نواب صاحب سے ملنے کے لئے تشریف لے گئے۔ نواب صاحب اس وقت محل سرا میں فروکش تھے۔ علاّمہ اعظم حسین نے اپنی اور شمس العلمأ کی آمد کی اطلاع کرائی۔ لیکن نواب صاحب آمد نہیں ہوئے بڑی دیر کے بعد اندر سے اطلاع آئی کہ نواب صاحب بیمار ہیں اس لئے باہر نہیں آسکتے ۔ اور اسی کے ساتھ دو سو روپے بھی کہ یہ "شمس العلمأ" کو بطور "زاد راہ" میری جانب سے پیش کر دیا جائے"!

نواب صاحب کی اس "اطلاع دہی" میں نہ تو کوئی خاص معذرت تھی۔ نہ شمس العلماء کے مزید قیام کی خواہش ۔ اور نہ ملاقات نہ ہونے پر اظہار افسوس!۔ "زاد راہ" تو کیا قبول کرتے شمس العلمأ! علاّمہ اعظم حسین کے یہاں واپس آئے اور اسی وقت اسٹیشن چلے آئے ۔!

ان حالات میں غالب کے بھوپال پہنچنے کا سوال ہی کیا تھا؟ غالب کے آخری ایام زندگی نہایت مصائب تحن گزرے! معمولی پنشن کے علاوہ ریاست رام پور کی مالی امداد ان کا آخری سہارا تھی ــــ مگر والاجاہ نواب صدیق حسن خاں سے کیا شکایت! جب ان کے حقیقی بھانجے مرزا عباس بیگ التعلقدار

بڑا گاؤں ضلع سیتاپور) نے اپنے حقیقی ماموں کو نہ پوچھا۔!

غالب کے بھوپال آنے یا نہ آنے کا مسئلہ ابھی میرے دل و دماغ پر طاری ہی تھا کہ اچانک جناب مالک رام کا ایک خط مجھے ملا۔ یہ خط ۱۰ فروری ۱۹۵۴ء کو دہلی سے پوسٹ کیا گیا تھا اور ۱۱ فروری کو مجھے بھوپال میں موصول ہوا تھا۔ جناب مالک رام نے اس خط میں تحریر فرمایا۔

کرم فرمائے من ــــ

بہت دن سے آپ نے یاد نہیں فرمایا۔ امید ہے مزاج گرامی بہمہ نوع بخیر ہوگا! میں بھی اس طرف بہت مصروف رہا اس لئے نہ لکھ سکا۔!

پیرانہ سال غالبؔ میکش کرے گا کیا
بھوپال میں مزید جو دو دن قیام ہو

یہ غزل پہلی مرتبہ "دین و دنیا" (دہلی) میں شائع ہوئی تھی وہاں سے "ہمایوں" (لاہور) میں نقل ہوئی میں نے اسے "ہمایوں" (اپریل ۱۹۳۹ء) سے لیکر شامل دیوان کیا ہے۔ میرے ذہن میں یہ تھا کہ "ہمایوں" میں یہ "منادی" سے نقل ہوئی ہے۔ تھوڑے دن ہوئے ہمایوں کا متعلقہ پرچہ دیکھنے کو ملا تو معلوم ہوا کہ میرے حافظے نے غلطی کی یہ دین و دنیا سے لی گئی تھی۔ "دین و دنیا" میں جب یہ غزل شائع ہوئی ہے تو تمہید میں یہ عبارت تھی!

"مرزا غالب کی ایک غیر مطبوعہ غزل"

"فصیح الملک خدائے سخن نواب مرزا اسد اللہ خاں غالب رحمتہ اللہ علیہ کی ایک "غیر مطبوعہ غزل" وہ متبرک روحانی تحفہ جو اب تک مرزا غالب کے کسی دیوان یا ضمیمہ میں شائع نہیں ہوا اور جو امیر الملک نواب یار محمد خاں مرحوم کے کتب خانہ قدیم سے بذریعہ خاص حاصل کر کے "دین و دنیا" میں شائع کیا جا رہا ہے۔ (جوہر قریشی بھوپال)

اب آپ سے یہ درخواست ہے کہ ان جوہر قریشی صاحب کا پتہ

نکالئے! یہ کون صاحب ہیں؟ کیا واقعی یہ غزل انھیں شوکت مرحوم (نواب یار محمد خاں) کے کتب خانے سے دستیاب ہوی تھی؟ وہاں کس کتاب یا بیاض میں یہ درج تھی؟ کیا اس کا عکس مل سکتا ہے؟ وغیرہ! جملہ کوائف معلوم کر کے مطلع فرمائیے۔

آپ نے کسی خط میں لکھا تھا کہ بھوپال کا "نسخۂ حمیدیہ" خدا بخش لائبریری پٹنہ میں پہنچ گیا ہے؟ یہ خبر پڑھ کر بہت خوشی ہوئی تھی لیکن افسوس کہ تحقیق کرنے پر غلط ثابت ہوئی۔ کتاب وہاں نہیں پہنچی! خدا معلوم کہاں ہے؟ آپ کو یہ سن کر ضرور مسرت ہوگی کہ "تلامذۂ غالب" چھپ گئی۔ جلد ساز کے پاس ہے۔ خدا چاہے تو اسی ہفتے عشرے میں شائع ہو جائے میں نے اس پر واقعی بہت محنت کی ہے خدا کرے اسے حسن قبولیت نصیب ہو آمین۔ آپ میری کوتاہ قلمی سے قطع نظر کر کے کبھی کبھی لکھتے رہیں تو تعلق قائم رہے گا ورنہ آہستہ آہستہ یہ ختم ہو جائے گا۔ پتہ محض حافظے کی بنا پر لکھ رہا ہوں ممکن ہے اس میں تسامح ہو گئی ہو۔ خدا کرے خط مل جائے

والسلام والکرام

خاکسار مالک رام

جوہر قریشی" نام کی ادبی شخصیت بھوپال میں نہیں تھی۔ ایک صاحب اس نام کے تھے ضرور مگر ادب کے ساتھ ان کا ذکر ہی "بے ادبی" ہے کرایہ کی سائیکلوں کی ایک معمولی سی دوکان ان کا ذریعہ معاش تھا۔۔ اور چرس و بھنگ کے ایک لائسنسدار کے ساتھ ملکر ایک اردو کا ہفتہ وار اخبار نکالا کرتے تھے جس کی پالیسی شریفوں کی پگڑی اچھالنا۔۔ اور سرکاری ملازمین کو مرعوب کر کے اپنا الّو سیدھا کرنا تھا۔ ان جوہر قریشی اور ان کے رسوائے زمانہ اخبار کو بھوپال کے سنجیدہ حلقوں میں بہت ہی بُری نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ اس اخبار کے جواب میں کئی اور اخبار بھی نکالے گئے جو اس کی "بلیک میلنگ" کی پالیسی کے خلاف لکھا کرتے تھے۔

میں نے جناب مالک رام کے جواب میں ان جوہر قریشی کا پتہ لکھدیا۔ اور یہ بھی

کہ آپ چاہیں تو اس پتہ پر ان سے خط وکتابت کرلیں اس قسم کے لوگوں سے میری کوئی ملاقات نہیں ؟

جناب مالک رام نے جوہر قریشی کو (غالباً) کئی خطوط لکھے۔ مگر جواب ظاہر تھا۔ نہ ملنا تھا نہ ملا! مجھے اس معاملے کی فکر یونہی تھی۔ مالک رام صاحب کے خطوط نے اور بھی زیادہ متفکر کردیا — !

میرے دوستوں میں ایک صاحب تھے بھوپال میں! مولانا محمد ابراہیم خلیل مرحوم! صورتاً سخت قسم کے مولوی۔ مگر سیرتاً ایک باغ و بہار انسان! بڑے ہی زندہ دل! بامذاق اور شگفتہ آدمی! ان کا ادبی مذاق اتنا بلند تھا کہ بڑی بڑی ادبی صحبتوں میں چھا جایا کرتے تھے۔ شاعر تھے مگر مشاعروں کے نہیں؛ ادیب تھے لیکن شہرت سے بھاگنے والے! نثر بڑی ہی ٹھوس لکھتے تھے اور اتنی ہلکی پھلکی کہ یہ یقین کرنا دشوار تھا کہ یہ کسی ایسے شخص کی لکھی ہوئی ہے جو عربی اور فارسی کا منتہی ہے ان کے بزرگ لکھنؤ سے بسلسلہ معاش بھوپال میں جاکر رہ بس گئے تھے۔ خود یہ بھوپال ہی میں پیدا ہوئے تھے اور یہیں تعلیم و تربیت پائی تھی! میں کبھی کبھی ان سے ملنے کے لئے جایا کرتا تھا۔ منگلوارہ کے پاس ہی "محلہ چھاؤنی" میں ان کا مکان تھا۔ سردار ولبھ بھائی پٹیل کالونی کے قریب!

مالک رام صاحب کا خط آئے ہوئے ایک مہینے سے زیادہ گذر چکا تھا اور اس مسئلہ کا حل ابھی نہیں نکلا تھا۔

اسی زمانے میں میں حسب دستور ایک دن مولانا خلیل سے ملنے گیا۔ مولوی سید احمد حسن زیدی (سابق سپرنٹنڈنٹ وزارت مال ریاست بھوپال) اور میاں نظیر محمد خاں بہتر بھوپالی میرے ساتھ تھے۔ غالب پر گفتگو ہونے لگی۔ مولانا کہنے لگے میرے والد محمد یوسف صاحب اور غالب سے بڑے دوستانہ تعلقات تھے دونوں میں باہمی خط وکتابت بھی تھی چنانچہ غالبؔ کا ایک غیر مطبوعہ خط آج بھی ان تعلقات کی یادگار میرے پاس محفوظ ہے!

مولانا یہ کہکر گھر کے اندر تشریف لے گئے اور فریم کیا ہوا فارسی کا اصل

خط لاکر میرے سامنے رکھدیا۔ یہ خط واقعی غالب کا لکھا ہوا تھا اور غیر مطبوعہ بھی تھا خط پر "۵ ذوالحجہ ۱۲۷۳ھ یوم دوشنبہ" پڑا ہوا تھا۔ اس خط کے کسی جزو سے مکتوب الیہ کے نام کا پتہ نہیں چلتا تھا لیکن یہ خط جسے بھی لکھا گیا ہو وہ غالب کا قریبی دوست ضرور تھا۔ شاید غدر شروع ہونے سے ہفتہ عشرہ پہلے لکھا گیا تھا اور مکتوب الیہ کے اس عزم وارادہ کا خیر مقدم کیا گیا تھا کہ وہ عنقریب ان سے ملنے کے لئے دہلی پہنچنے والا ہے۔

مولانا نے اس خط کے سلسلے میں ایک تعارفی مضمون بھی لکھا تھا جس میں اپنے والد اور غالب کے دوستانہ روابط پر روشنی ڈالی تھی۔!

یہ خط واقعی ایک نادر چیز تھی۔ دیکھکر روحی خوشی ہوئی لیکن میں نے خط کی نقل حاصل کرنے کی کوشش نہیں کی کیونکہ یہ غیر مطبوعہ تھا —— اور اس پر خود مولانا نے ایک مضمون لکھا تھا جو کہیں بھی شائع کرایا جا سکتا تھا۔

اثنائے گفتگو میں غالب کے فن شعری کا ذکر چھڑ گیا۔ اور پھر بھوپال والی غزل کا تذکرہ۔! مولانا مسکرائے اور بلا کچھ کہے ہوئے گھر کے اندر چلے گئے۔ چند منٹ کے بعد واپس ہوئے تو کپڑے کے بستے میں لپٹے ہوئے کچھ کاغذات ان کے ہاتھ میں تھے۔ بستہ کھولکر انھوں نے ایک پرچہ نکالا جس پر یہی "بھوپال والی غزل" لکھی تھی حنائی کاغذ کی کہنگی اور روشنائی کی قدامت سے صاف ظاہر ہوتا تھا۔ کہ یہ مسودہ بیس پچیس برس ادھر کا لکھا ہوا ہے۔ مولانا نے مسکراتے ہوئے بستہ سے ماہنامہ "گوہر تعلیم" بھوپال (بابتہ اپریل ۱۹۳۷ء) کا وہ شمارہ بھی نکالا جس میں "اپریل فول" کے عنوان سے یہ غزل چھپی تھی۔!

خوشی اور حیرت کے ملے جلے جذبات سے دیر تک میں ان دونوں چیزوں کو دیکھتا رہا۔ ایک طرف تو مجھے مولانا کی خداداد ذہانت پر حیرت تھی دوسری طرف اس بات کی خوشی بھی کہ بھوپال والی غزل کا بالکل غیر متوقع طور پر پتہ چل گیا۔

مولانا سے دیر تک اس دلچسپ غزل اور غالب کے طرز سخن پر گفتگو ہوتی رہی مولانا نے اسی رنگ کی کئی اور غزلیں بھی سنائیں جو بطور تفنن طبع انھوں نے غالب کے رنگ میں کہی تھیں!

اپنے گھر واپس آکر میں نے اسی وقت تمام تفصیلات جناب مالک رام کو لکھ بھیجیں اور مالک رام صاحب کو مولانا خلیل کا پتہ بھی بھیجدیا کہ اگر وہ چاہیں تو اس پتہ پر خط و کتابت کرکے اصل واقعات کی تصدیق فرمالیں۔

۲۲ مارچ ۱۹۵۸ء کو جناب مالک رام نے تحریر فرمایا۔

"آپ کے دونوں گرامی نامے ملے۔ شکریہ!

میں بشرط فرصت خلیل صاحب کی خدمت میں لکھوں گا۔ ان دنوں بیحد مصروف ہوں اور انھیں خط لکھنے کے لئے جس سکونِ اطمینان کی ضرورت ہے ابھی مفقود ہے ...." خاکسار مالک رام

پھر ۲۴ مارچ ۱۹۵۸ء کے کارڈ میں لکھا۔

لیجئے حضرت! میں نے ابھی خلیل صاحب قبلہ کی خدمت میں خط لکھا ہے اب اس کا جواب دلوائیے۔ میں نے دونوں باتوں سے متعلق لکھا ہے غزل اور غالب کا خط! آپ کو معلوم ہے کہ ذوق ادب اور مال دنیا کم ہی ایک جگہ جمع ہوئے ہیں اس لئے اگر انھوں نے کچھ میری بساط سے زیادہ طلب فرمایا تو با حسرت و یاس مجھے دستبردار ہونا پڑیگا اگرچہ درست ہے کہ میں اپنے آپ کو ایسی چیزوں کا وارث اور حقدار سمجھتا ہوں لیکن دنیا والے کب ایسی باتیں مانتے ہیں۔ بہرحال "حسبی اللہ ونعم الوکیل"......!

خاکسار ... مالک رام

اس عرصہ میں دو ایک خطوط مالک رام صاحب کے اور بھی ملے جن میں مولانا خلیل کے جواب آنے کا شکوہ تھا میں برابر مولانا سے ملکر ان کی یاد دہانی کرتا رہا بالآخر جناب مالک رام کو مولانا کا جواب موصول ہوگیا۔ وہ "مصر" جانے کی تیاریوں میں مصروف تھے اس لئے بمبئی پہنچکر ۲۳ اپریل ۵۸ء کو انھوں نے مجھے یہ اطلاع دی!

مکرّم بندہ ـــــ!

جناب مکرم خلیل صاحب کا گرامی نامہ مجھے دہلی سے روانہ ہونے کے چند گھنٹے قبل ملا تھا۔ پچھلے ہفتے سامان کے تیار کرنے اور باندھنے اور پھر

دوست احباب کی ملاقاتوں اور دعوتوں میں جو بھاگ دوڑ رہی ــــ
آپ اس کا اندازہ نہیں کر سکتے یہاں پہنچ کر بھی فرصت نصیب نہیں ہوئی
بہر حال آج ہی انھیں شکریہ کا خط لکھا ہے۔!
انھوں نے اگرچہ معاملہ کچھ شاعرانہ گومگو میں رکھا لیکن مفہوم تحریر
یہی ہے کہ غزل انھوں نے ۱۹۳۷ء میں اپریل فول کے طور پر کہی اور یہ اسی
زمانے میں ماڈل ہائی اسکول بھوپال کے پرچہ "گوہر تعلیم" میں شائع ہوئی
تھی۔ ربع صدی کا زمانہ گذر گیا۔ لہٰذا اسہل الحصول تو نہیں ہو سکتا
لیکن اگر کہیں سے وہ پرچہ جس میں یہ غزل پہلی مرتبہ شائع ہوئی تھی
مل جائے تو کیا کہنا؟
غالب کے خط سے متعلق جو کچھ انھوں نے لکھا ہے وہ کچھ صاف نہیں
الگ کرنے سے متعلق ایک لفظ نہیں بلکہ یہ تک تحریر نہیں فرمایا کہ
اس کا مکتوب الیہ کون ہے؟ آپ کی توجہ درکار ہے!
مصر میں میرا پتہ حسب ذیل ہوگا ....!

والسلام والاکرام
خاکسار ـــــــ مالک رام

اس غزل کے بارے میں یہ تمام تفصیلات فراہم ہو جانے کے بعد جناب
مالک رام "دیوان غالب" کے دوسرے ایڈیشن کے انتظار میں خاموش نہیں ہو گئے بلکہ
ان کی دیانتداری نے اس "نادانستہ غلطی" کے اعتراف میں وہ سب کچھ کیا جس
کی توقع ان جیسے بلند پایہ انسان سے کرنا چاہئے! جس قسم کا دھوکا جناب مالک رام
نے کھایا تھا اس سے نہ تو "ہمایوں" (لاہور) کے ایڈیٹر بچ سکے تھے اور نہ مولانا عرشی
جیسے محتاط بزرگ! ان سب نے اس غزل کو غالب کی غزل سمجھ کر شائع کیا۔ اور
اس وقت تک انھیں کوئی اشتباہ پیدا نہیں ہوا جب تک خود جناب مالک رام
نے انھیں اصل حقیقت سے باخبر نہیں کیا؟ اب ان تفصیلات کو بلا کم و کاست
جناب مالک رام کی زبان سے بھی سن لیجئے۔

"یادگار نالہ (نسخۂ عرشی) صفحہ ۳۰۲ پر غزل ہے جس کا مطلع ہے۔

بھولے سے کاش وہ ادھر آئیں تو شام ہو
کیا لطف ہو جو ابلق دوراں بھی رام ہو

اور مقطع ہے ——!

پیرانہ سال غالب میکش کرے گا کیا؟
بھوپال میں مزید جو دو دن قیام ہو

چونکہ جناب عرشی صاحب کی طرح میں بھی اس غزل کو اپنے مرتبہ دیوان میں شامل کرنے کا گنہگار ہو چکا ہوں اس لئے اس سے متعلق چند لفظ لکھ دینا بے محل نہیں ہوگا۔

یہ غزل سب سے پہلے دلی کے رسالہ "دین دنیا" میں چھپی تھی۔ لاہور کے مشہور رسالہ ہمایوں (مرحوم) میں ہم عصر رسائل کے اہم اقتباس بھی شائع ہوا کرتے تھے۔ ہمایوں نے اسے وہاں سے اپنی اپریل ۳۹ء (صفحہ ۳۱۶) کی اشاعت میں نقل کیا۔ اس کے شروع میں یہ تمہید تھی۔!

(یہ عبارت جناب مالک رام کے مندرجہ بالا خط میں موجود ہے)

"میں نے اسے "دین دنیا" میں نہیں دیکھا تھا یہ پہلی مرتبہ میری نظر سے "ہمایوں" ہی میں گذری! نواب یار محمد خاں کی شخصیت معروف تھی اور غالب سے ان کے خاندان کے تعلقات بھی مخفی نہیں تھے! خود ان کا تخلص شوکت تھا اور وہ غالب کے شاگرد تھے۔ دیوان غالب کا وہ مخطوطہ جو بعد کو "نسخۂ حمیدیہ" کے عنوان سے شائع ہوا انھیں کے والد میاں فوجدار محمد خاں کے کتب خانہ سے دستیاب ہوا تھا۔ ان شہادتوں کی موجودگی میں بظاہر شبہ کی کوئی وجہ معلوم نہیں ہوئی! اس لئے میں نے اس غزل کو غالب ہی کا کلام خیال کیا؟ دیوان میں تو میں نے اسے ۱۹۵۷ء میں شامل کیا۔ اس کے مقطع کو میں نے "ذکر غالب" کے دوسرے ایڈیشن مطبوعہ ۱۹۵۰ء میں استعمال کیا تھا اور یہی صورت تیسرے ایڈیشن ۱۹۵۵ء میں بھی ہے

جب میرا مرتبہ دیوان ۱۹۵۵ء میں شائع ہوا تو جناب ڈاکٹر گیان چند صاحب نے مجھے بھوپال سے تحریر فرمایا کہ یہ غزل کہاں سے لی گئی ہے؟ غالب کا بھوپال میں آنا کہیں سے ثابت نہیں! (ان کا اصلی خط اس وقت میرے سامنے نہیں) اب مجھے ٹھیک سے یاد نہیں کہ میں نے کیا جواب دیا۔ اور یہ خط و کتابت بھی دو تین خطوں سے آگے نہیں بڑھی۔ بہر حال میں نے اس غزل سے متعلق تحقیق کرنا ضروری خیال کیا؟ اور ایک دوست کو بھوپال لکھا کہ "جوہر قریشی" کا پتہ لگائیں اور نواب یار محمد خاں کے کتاب خانے کا کھوج نکالیں کہ اب کہاں ہے؟ اور دیکھیں کہ اس کی کون سی کتاب میں یہ غزل ملی ہے؟ انھوں نے "جناب جوہر قریشی" سے متعلق جو کچھ لکھا وہ تو غیر متعلق ہے البتہ جستجو کے بعد اطلاع دی کہ جناب ابوالارشاد مولوی محمد ابراہیم خلیل صاحب جو سابق میں نارمل ٹیچرس ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ بھوپال میں اردو فارسی اور عربی کے شعبہ کے صدر مدرس تھے فرماتے ہیں کہ میں نے یہ غزل "اپریل فول" کے طور پر لکھی تھی اور اس زمانہ میں اسکول کے پرچہ "گوہر تعلیم" کے اپریل ۱۹۳۶ء کے شمارے میں یہ شائع بھی ہوئی تھی۔ اس کے بعد میری درخواست پر مولوی صاحب موصوف نے پوری روداد لکھ کر مجھے بھیجدی میں نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ اس کی اطلاع مولانا عرشی صاحب کو دی۔ کیونکہ مجھے خیال ہوا کہ وہ بھی اسے اپنے دیوان میں شائع کریں گے۔ لیکن میرا خط ملنے سے پہلے دیوان کا یہ حصہ چھپ چکا تھا۔ بہر حال انھوں نے "غلط نامے" میں اس کی تصحیح کر دی۔ پچھلے دنوں دہلی یونیورسٹی کے شعبہ اردو کی طرف سے "اردوئے معلیٰ" کا پہلا شمارہ شائع ہوا تو اس میں ڈاکٹر گیان چند صاحب نے "غالب اور بھوپال" کے عنوان سے ایک مختصر مضمون قلم بند فرمایا اس میں انھوں نے پہلے میرے مرتبہ دیوان اور اس میں اس غزل کی شمولیت کا ذکر کیا ہے! مجھے ان کے لب و لہجہ سے شکایت رہی: لکم دینکم ولی دین

لیکن دو سوال ضرور پوچھنا چاہتا ہوں (۱) اگر آپ ہمایوں کے اپریل ۱۹۳۹ء کے شمارے میں اس غزل کو اس تمہید کے ساتھ جو صدر میں درج ہوئی ہے دیکھتے تو کیا کرتے؟ بلکہ کیا آپ نے "ہمایوں" میں یہ غزل دیکھی بھی تھی یا نہیں! اگر دیکھی تھی تو آپ نے کیا کیا؟ (۲) اگر مولوی محمد ابراہیم خلیل مدظلہٗ کی کارگذاری منظرِ عام پر نہ آتی۔ (اور یہ بھی خود میری تلاش کا نتیجہ ہے) اور میں یا جناب عرشی صاحب اس غزل کو شامل دیوان نہ کرتے تو آپ ہمیں کوتاہی کا ذمہ دار گردانتے یا نہیں؟"

(صفحہ ۱۵۱-۱۵۲- سہ ماہی فکر و نظر علی گڑھ جنوری ۱۹۶۱ء)

ڈاکٹر گیان چند جین اور جناب مالک رام کے مابین کیا خط و کتابت ہوئی؟ اس کی کوئی تفصیلات ہمارے سامنے نہیں ہیں لیکن اردوئے معلیٰ (غالب نمبر فروری ۱۹۶۰ء) میں "غالب اور بھوپال" کے عنوان سے جو مضمون ڈاکٹر صاحب نے لکھا ہے میں سمجھتا ہوں کہ ڈاکٹر جین جیسے شریف، نیک دل، نیک نفس اور سنجیدہ اہل قلم کی شایان شان نہیں ہے۔ کیونکہ اس مضمون کے سیاق و سباق سے ایسا ظاہر ہوتا ہے کہ شاید ڈاکٹر صاحب کو جناب مالک رام کی خوش نیتی کے بارے میں کچھ غلط فہمی ہوگئی ورنہ جہاں تک جناب مالک رام کے ادبی اور تحقیقی کردار کا تعلق ہے وہ بہر نوع شک و شبہ سے بالاتر ہے۔ یہ درست ہے کہ بعض وقت ان کی کاوش تحقیق کو "ذوق جستجو" میں منزل مقصود تک پہنچنے میں خلاف توقع کچھ زیادہ مسافت طے کرنا پڑتی ہے لیکن اس تاخیر کا اثر نہ تو ان کے دیانتدارانہ کردار پر پڑتا ہے اور نہ اصابت رائے پر! میں ذاتی طور پر عرض کر سکتا ہوں کہ تلامذۂ غالبؔ کی اشاعت کے بعد سے وہ برابر اس ادھیڑ بن میں مصروف ہیں کہ یہ تذکرہ ان حشو و زوائد سے پاک ہو جائے جس کا سامنا ہر دیانتدار اہل قلم کو کرنا پڑتا ہے۔

مجھ سے اور جناب مالک رام سے اس بھوپال والی غزل کے سلسلہ میں جو خط و کتابت ہوئی اس کا ضروری حصہ مندرجہ بالا سطور میں پیش کیا جا چکا ہے اور میں پورے وثوق کے ساتھ یہ عرض کر سکتا ہوں کہ اس تمام مراسلت کا لب لباب ہی جناب

جناب مالک رام کا وہ جذبہ تحقیق ہے جس نے انھیں مجبور کیا کہ وہ اس غزل کے بارے میں مولانا عرشی کو حقیقت حال سے مطلع فرمادیں۔

جناب مالک رام پر کیا منحصر! نظریاتی اختلاف ہر شخص سے کیا جاسکتا ہے لیکن "احترام نیت" کے ساتھ۔ اور اگر جناب مالک رام اپنی نیک نیتی کے بارے میں کوئی مطالبہ کریں تو اسے نامناسب نہیں کہا جاسکتا۔۔!

جیسا کہ سطور بالا سے ظاہر ہے یہ غزل میرے مرحوم دوست مولانا خلیل کا ایک کھلا ہوا مذاق تھا جس کا عنوان ہی "اپریل فول" قرار دیا گیا تھا اور یہی عنوان ان کی خوش نیتی کا سب سے بڑا ثبوت ہے البتہ اس لطیف مذاق کو جس غیر ذمہ دارانہ سنجیدگی کے ساتھ "دین و دنیا" (دہلی) کے اوراق تک پہنچایا گیا وہ طریقہ کار ہر لحاظ سے غیر ادبی غیر مستحسن اور فریب کن تھا جس کی ذمہ داری نہ مولانا خلیل مرحوم کے سر عاید کی جاسکتی ہے اور نہ ان غالب پسندوں پر جو صرف غالب اور میاں یار محمد خاں رئیس بھوپال کے نام سے دھوکہ کھا گئے۔! اور فریب خوردگی بہرحال جرم نہیں ہے۔

اس بھوپال والی غزل پر غالب سے نسبت پانے کے بعد چونکہ "الحاقی کلام" کا اطلاق ہوتا ہے اس لئے یہ پوری غزل دیوان غالب (مرتبہ مالک رام) سے نقل کی جارہی ہے۔

بھولے سے کاش وہ اِدھر آئیں تو شام ہو
کیا لطف ہو جو ابلق دوراں بھی رام ہو

تا گردش فلک سے یونہی صبح و شام ہو
ساقی کی چشم مست ہو اور دور جام ہو

بیتاب ہوں بلا سے کن انکھیوں سے دیکھ لیں
اے خوش نصیب کاش قضا کا پیام ہو

کیا شرم ہو حریم ہے محرم ہے راز دار
میں سربکف ہوں تیغ ادا بے نیام ہو

میں چھیڑنے کو کاش اسے گھور لوں کبھی
پھر شوخ دیدہ برسرِ صد انتقام ہو

وہ دن کہاں کہ حرفِ تمنا ہو لب شناس
ناکام بدنصیب کبھی شاد کام ہو

گھس مِل کے چشمِ شوق قدم بوس ہی سہی
وہ بزمِ غیر ہی میں ہوں پر اژدحام ہو

اِتنی پیؤں کہ حشر میں سرشار ہی اٹھوں
مجھ پر جو چشمِ ساقی بیت الحرام ہو

پیرانہ سال غالبؔ میکش کرے گا کیا؟
بھوپال میں مزید جو دو دن قیام ہو

(صفحہ ۲۸۶ - ۲۸۷)

”تحریف و تصرف“

گھستے گھستے مٹ جاتا آپ نے عبث بدلا
ننگِ سجدہ سے میرے سنگِ آستاں اپنا

(غالبؔ)

غالب کے اردو کلام کو غلط انتساب و الحاق ہی کا سامنا نہیں کرنا پڑا بلکہ تحریف. تصرّف اور ترمیمات سے بھی دوچار ہونا پڑا۔ اصلاحیں بھی دی گئیں اور ان کے اشعار کے غلط معانی بیان کرکے ان کی فنّی عظمت کا استہزا بھی اڑایا گیا۔ یہاں تک کہ آج غالب کا ایک ایک شعر اور ایک ایک مصرعہ مشکوک و محکوک ہوکر رہ گیا!

شارح غالب نواب حیدر یار جنگ نظم طباطبائی (وفات مئی ۱۹۳۳ء) نے اپنے ایک مختصر سے مراسلے میں ایسی ہی ایک مثال پیش کی ہے جو کتابت کی ایک معمولی سی غلطی کی وجہ سے بہت دنوں تک معمّہ بنی رہی! تحریر فرماتے ہیں:۔

"میرے دوستوں میں ایک صاحب دیوان غالب کا "نسخہ حمیدیہ" لئے ہوئے میرے پاس آئے اور اس مطلع کے معنی مجھ سے پوچھنے لگے۔

جنوں گرم انتظار و نالہ بیتابی کمند آیا
سویدا تا بلب "زنجیر" سے" دود سپند آیا

شعر کے الفاظ سے یہ سب باتیں پیش نظر ہوگئیں کہ "سپند" کو سویدائے دل سے تشبیہہ دیتے ہیں۔ لیکن "سویدا تا بلب زنجیر کیا معنی؟ اور پھر "زنجیر سے" دود سپند آیا۔ کیا معنی؟ اسی کے ساتھ ہی یہ خیال پیدا ہوا کہ شاعر یہ بات کہنا چاہتا ہے کہ سویدا لبوں تک آگیا۔ یعنی کلیجہ منہ کو آگیا!۔ "آیا" اگر سویدا کے ساتھ ہے تو پھر "دود" کے ساتھ اسے تعلق ہونا چاہئے؟ کچھ کاتب کا تصرف تو اس میں نہیں ہے۔؟ گمان غالب ہوا کہ ضرور تصرف ہے۔ اب سے پچاس ساٹھ برس پیشتر یائے معروف و مجہول کا فرق کتابت میں نہ تھا۔ یقین ہوگیا شاعر نے یوں کہا تھا۔ ع

سویدا تا بلب "زنجیری" دودِ سپند آیا

"ی" کو اس طرح پر لکھئے کہ اس پر "سی" کا شبہ ہوسکے — اب شعر کے معنی کھل گئے۔ یعنی "سویدا دود سپند" کا زنجیری ہوکر لب تک آیا۔ اس میں شاعر نے "دود سپند" کو زنجیر سے تشبیہہ دی ہے۔

اب میں نے دعویٰ کے ساتھ یہ کہہ دیا کہ جس طرح میں پڑھتا ہوں

یہی صحیح ہے۔ غرضیکہ بھوپال میں لکھا گیا کہ اصل نسخۂ (حمیدیہ) سے مقابلہ کیا جائے۔ اس کا جواب بھوپال کے ناظم تعلیمات کی طرف سے انھیں میرے عنایت فرما کے نام آیا کہ اصل نسخہ (میں) "زنجیریٔ دودِ سپند" ہے "زنجیر سے" کاتب کی غلطی ہے"۔

(صفحہ ۳۔ کالم ۲/۳ اودھ پنچ لکھنؤ۔ ۱۹ اگست ۱۹۲۵ء۔ جلد ۱۰ شمارہ ۳۱)

یہ مثال نہ اصلاح کی ہے نہ تحریف و تصرف کی۔ لیکن مروجہ دیوانوں کی ایسی ہی غلطیوں کا سہارا لیکر "تحریف خیزی" کی ایک پوری تحریک کو جنم دے دیا گیا ہے اور جس طرح "شرح غالبؔ" کے پردہ میں مولانا عبدالباری آسیؔ مرحوم نے اپنا بہت سا کلام شیر و شکر کر کے غالب کے نام سے منسوب کر دیا ہے بالکل اسی طرح مجدد السنہ شرقیہ مولانا شوکت میرٹھی مرحوم اس سے بھی پہلے غالبؔ کے اردو کلام کو تحریف و تصرّف کا نشانہ بنا چکے ہیں۔ ہوشیار جنگ سید ناظر الحسن ہوش بلگرامی مرحوم اپنے ایک مضمون "دیوان اردو غالب اور حضرت شوکت میرٹھی" میں تحریر فرماتے ہیں۔

"جب تک حضرت شوکت میرٹھی نے دیوان غالب کی ایک نامکمل شرح نہیں چھاپی تھی اس وقت تک نسخوں میں ہندو مسلمانوں کی طرح اختلاف نہ تھا ان کا اپنے اجتہاد شاعری پر اعتماد کر کے شرح کو چھپوانا تھا کہ دنیائے شاعری میں اختلاف پھیل گیا۔ جناب شوکت غالب کے شعروں میں تصرف ہی کر کے خاموش نہیں ہوئے بلکہ اس حد تک اصلاح دی کہ غالب کو مرنے کے بعد اپنے تلمذ ہونے کا خود ہی شرف بخش دیا۔ پھر دو ایک جگہ کے سوا کہیں یہ ظاہر بھی نہیں فرماتے کہ مطبوعہ نسخوں میں یہ لفظ تھا۔ میں یہاں پر دوسرا لفظ مناسب سمجھتا ہوں۔ یہ اخلاقی جرم اگر غالب کی روح معاف کر دے تو شاید معاف ہو جائے۔ اس قسم کی جسارتوں سے واقف ہو کر اجتہادات شوکت کا پردہ مقلدین غالب کے لئے اٹھانا پڑا تاکہ غالب پرست "میرٹھی اجتہاد" پر ایمان نہ لے آئیں۔

غالبؔ مرحوم کا صحیح کیا ہوا نسخہ جس کے آخر میں وہ فرماتے ہیں کہ۔

"اس کے پروف اور کاپیاں سب میری نظر سے گذری ہیں"، پیدا کیا — اور شوکت صاحب کی شرح بھی قیمتاً منگوا کر اپنی مالیات پر بلا قصور جرمانہ کیا۔ اوّل سے آخر تک دونوں نسخوں کو ملایا اور مقابلہ کیا جس نے یہ ثابت کر دیا کہ شوکت صاحب نے جو "من گڑھت تحریفیں" کی ہیں وہ ۱۹۰۷ء کے "میرٹھی نسخہ" کے سوا کسی میں نہیں پائی جاتیں۔

ان تحریفوں کے جابدہ قوم کے سامنے حضرت شوکت ہی ہو سکتے ہیں مگر دلدادگان اُردو کو کیا غرض کہ وہ "اجتہادات شوکت" میں دخل دیکر اپنی شاعری کا ایمان بگاڑیں۔ دیوان غالب کے کئی نسخے اس وقت میرے پیش نظر ہیں اور وہ سب کے سب اپنے اتحاد و مطابقت سے بغلگیر ہیں۔

امید ہے ناظرین ان تحریفوں کو ملاحظہ فرما کر شوکت صاحب کی "روح شاعری" پر فاتحہ پڑھیں گے"

(صفحہ ۴۷-۴۸ عروس ادب مطبوعہ نگار مشین پریس لکھنؤ ۱۹۲۷ء)

مولانا سید احمد حسن شوکتؔ میرٹھی اپنے دور کی ایک "عہد آفریں" شخصیت تھے رواج زمانہ کے مطابق "مجدد السنہ شرقیہ" کو اپنے نام کا جزو بنانے میں انھوں نے کبھی جھجک محسوس نہیں کی اور "امیر اللغات" کے ان تمام ادبی ہنگاموں میں ہمیشہ پیش پیش رہے جو اخبار طوطئ ہند "میرٹھ"۔ اودھ پنچ لکھنؤ اور ریاضؔ خیرآبادی کے "ریاض الاخبار" میں چل رہے تھے۔ یہ سلسلہ برسہا برس جاری رہا یہاں تک کہ ماہنامہ "پروانہ" میرٹھ میں ایک ایسا تنقیدی سلسلہ شروع کر دیا گیا جس کی زد سے ریاضؔ (خیرآبادی) تو خیر کیا بچتے مولانا شوکتؔ نے مرزا غالب کو بھی نہیں بخشا۔ سید عقیل احمد جعفری نے لکھا ہے۔

"مجدد الوقت جناب شوکت میرٹھی نے اپنے رسالہ پروانہ میں ایک بار حضرت امیر مینائیؔ مرحوم اور مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ مغفور کی چوری پکڑی تھی۔ اس کے بعد داغؔ اور جلالؔ (حکیم ضامن علی) کے کلام کو مہمل بتاتے ہوئے حضرت ریاضؔ (خیرآبادی) کی فکر کو قابل اصلاح قرار

دے کر تحریر فرمایا تھا......!"

(صفحہ ۱۸۱- نثر ریاض خیرآبادی مطبوعہ اسٹیم پریس حیدرآباد دکن)

غالب کے کلام میں تحریف و تصرف کا آغاز شوکت میرٹھی کے "حلِ کلیات غالب" سے ہوا- جو غالب کی باضابطہ شرحوں میں دوسری شرح کہی جاتی ہے اس سے قبل نظم طبا طبائی کی شرح غالب شائع ہو چکی تھی لیکن جہاں تک کلام غالب کی شرح کاری کا تعلق ہے اس کی ابتدا طبا طبائی سے بہت پہلے سید محمد مرتضیٰ بیآن و یزدانی میرٹھی (وفات مارچ ۱۸۹۹ء) کر چکے تھے.

مرحوم ماہنامہ العصر لکھنؤ نے اپنے ادارتی نوٹ میں لکھا ہے:-

"(رسالہ) لسان الملک (میرٹھ- اجرائے ۱۸۸۷ء) میں ایک عرصہ تک "حلّ المطالب" کے نام سے ایک سلسلہ مضامین نکلتا رہا- یہ حضرت بیآن کی "شرح دیوان غالب" ہے. غالباً یہ شرح کتابی صورت میں آجتک شائع نہیں ہوئی ہے ورنہ ادب اردو میں ایک قابل قدر اضافہ ہوتا"

(ماہنامہ العصر لکھنؤ. بابتہ اگست و ستمبر ۱۹۱۳ء)

—— مولانا سید عبدالرزاق راشد حیدرآبادی مرحوم کا بیان ہے -

(حل غالب مصنفہ سید مرتضیٰ بیآن و یزدانی میرٹھی)

"بیآن رسالہ "لسان الملک" نکالتے تھے. اشعار غالب کا حل چیدہ چیدہ اس رسالے میں شائع ہوتا تھا- شرح پوری ہوئی یا ادھوری - اس کا علم نہ ہو سکا"

(صفحہ ۵۷. اصلاحات غالب مطبوعہ اعجاز پرنٹنگ پریس حیدرآباد دکن ۱۹۶۶ء)

بیآن میرٹھی کی یہ شرح غالباً نامکمل ہی رہی اس کے سرسری خد و خال کا کچھ پتہ چل سکا جس کا ذکر میں نے اپنے مضمون (دیوان غالب کی ابتدائی شرحیں مطبوعہ ماہنامہ صبح نو پٹنہ ستمبر ۱۹۶۲ء) میں کر دیا ہے.

اگرچہ اس کا کوئی تحریری ثبوت تو نہیں ملتا لیکن قیاس یہی کیا جا سکتا ہے کہ ۱۸۸۱ء میں جب مولانا شوکت میرٹھی رام پور سے ترک وطن کر کے میرٹھ پہنچے تو انہیں

میرٹھ کا ایک چابسا ادبی ماحول مل گیا اور وہ سید محمد مرتضیٰ بیاںؔ کے ساتھ مل جل کرادبی سرگرمیوں میں کھو گئے۔ اخبار "طوطیٔ ہند" اور رسالہ "لسان الملک" میرٹھ کے فائل کمیاب ہی نہیں تقریباً نایاب ہو چکے ہیں اس لئے قطعی طور پر تو یہ نہیں کہا جاسکتا کہ مولانا شوکتؔ کا براہ راست تعلق ان کے ادارۂ تحریر سے تھا؟ مگر ماضی کے ادبی معرکوں میں جب طوطیٔ ہند۔ اودھ پنچ اور ریاض الاخبار کا ذکر آجاتا ہے تو مولانا شوکتؔ میرٹھی کی دلفریب شخصیت ماضی کے جھروکوں میں مسکراتی ضرور نظر آتی ہے جس کا ہلکا سا عکس مولانا عبدالرزاق راشدؔ حیدرآبادی کے ان الفاظ میں بھی موجود ہے۔

"شرح غالب۔ مصنفہ سیّد احمد حسین شوکتؔ میرٹھی جو اپنے آپ کو "مجدّد السنہ شرقیہ" لکھا کرتے تھے۔ کسی رسالہ کے ایڈیٹر تھے اس زمانے کے اخباروں اور رسالوں میں آپ کے "بلند بانگ دعوے" شائع ہوتے تھے کہ ان کے مانند کوئی شخص عرفیؔ۔ خاقانیؔ اور غالبؔ کے اشعار کو نہیں سمجھ سکتا۔

اس شرح (غالب) میں بہت سے اشعار حذف کئے ہیں اور غالبؔ پر غلط اصلاحیں دی ہیں۔" (صفحہ ۵۷۔ اصلاحات غالب)

بیاںؔ میرٹھی آخری عمر میں مراق اور مالیخولیا کا شکار ہوکر ذہنی توازن کھو بیٹھے تھے۔ جب تک سورج کی شعاعیں رہتیں وہ اندھیرے میں چھپے رہتے تھے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ مولانا شوکتؔ ان کے خاص مقربین میں ممتاز مقام رکھتے تھے اور "حل المطالب" کا جو کام بیاںؔ میرٹھی نے ادھورا چھوڑ دیا تھا "حل کلیات" کی بگڑی ہوئی شکل میں انھیں کے ہاتھوں پایۂ تکمیل تک پہنچا اور "حل کلیات غالب" جو بیاںؔ میرٹھی کی وفات کے چند ماہ بعد اکتوبر ۱۸۹۹ء میں مولانا شوکتؔ میرٹھی نے اپنے شوکت المطابع میرٹھ سے چھاپ کر شائع کیا تھا اس کا ابتدائی تصور بیاںؔ میرٹھی کی ہی شرح "حل المطالب" تھی۔ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ مولانا شوکتؔ کی شرح کلیات غالب کا بیاںؔ میرٹھی کی شرح سے دور کا بھی علاقہ نہ تھا وہ ایک علمی و

تعمیری کاوش تھی اور یہ ایک تجربی اور محض کاروباری چیز! بلکہ سچ تو یہ ہے کہ اس عہد کے علمی و ادبی ماحول میں اسے شرح کا درجہ دیا ہی نہیں گیا۔

چنانچہ جب مولانا شوکت نے ایک اعلان کیا تو اس کا ردّ عمل بہت ہی سخت ہوا۔ ہوشؔ بلگرامی کا بیان ہے۔

"شوکت صاحب نے غالب کے کلام میں جو تحریفیں کی تھیں ان کا ظاہر کردینا تو مجھ پر فرض تھا اس لئے کہ "صلائے عام" (دہلی) اور مخزنؔ (لاہور) وغیرہ میں شوکت صاحب نے انجمن ترقی اردو کو مخاطب کرکے اس امر کا اظہار کیا ہے کہ ابھی تنّو شعرِ غالب کے اور ہیں جو غلط چھپ گئے ہیں اور ہم نے اپنی شرح میں یہ سمجھ کر چھوڑ دیئے ہیں کہ دیکھیں کوئی سمجھتا ہے یا نہیں۔ ؟" (صفحہ ۶۳۔ عروس ادب)

مولانا شوکت نہ صحیح معنوں میں محقق تھے نہ نقّاد — "مجدّد السنہ شرقیہ" ہونے کا دعویٰ بھی ان کا ایک طرح سے خودستائی تھی۔ کیونکہ اس شرح میں انھوں نے جابجا غلط اور بے سروپا حکایتیں بیان کرکے اپنی سخن فہمی کی پردہ پوشی بھی کی ہے اور "مجدّد لسان" بننے کے لئے لغات کی غلط اور مہمل تعبیرات کی ہیں۔ غالب کے اس شعر کی شرح کرتے ہوئے مولانا شوکت نے (بلا کسی حوالے کے) ایک عجیب و غریب حکایت تحریر فرمائی ہے۔

میں مضطرب ہوں وصل میں خوفِ رقیب سے
ڈالا ہے تم کو وہم نے کس پیچ و تاب میں

فرماتے ہیں اس سلسلے میں —!

"ہم کو معلوم ہوا ہے کہ جب مرزا غالب نے یہ شعر مشاعرے میں پڑھا تو ختم مشاعرہ کے بعد مولوی امام بخش صہبائی مرحوم نے جو ایک مقدس اور متورع بزرگ تھے مرزا صاحب سے پوچھا کہ آپ نے اس شعر میں کیا معنی پنہاں دیئے ہیں۔ ؟

مرزا صاحب نے کہا— مولانا آپ اس شعر کے کیا معنی سمجھیں گے۔

نہ آپ نے کبھی رنڈی بازی کی۔ نہ خانگی بازی کی۔ نہ امرد بازی کی۔
نہ فاعل بنے نہ مفعول۔!
میں نے تو اپنا ایک واقعہ لکھا ہے یعنی جس "مسماۃ" پر میں فریفتہ تھا بڑی بڑی تدبیروں سے اور چالوں سے اس کو "کسی کھدڑے" میں ڈھب پر چڑھایا۔ مگر اس خوف سے (کہ) کوئی آ کھڑا ہوگا۔ رجولیت چوہے کے بل میں گھس گئی۔ "مسماۃ" سمجھی کہ غالب محض نامرد اور عنین ہے۔ میں نے معذرت میں یہ شعر پڑھا"

(صفحہ ۸۸۔ حل کلیات مرزا غالب دہلوی اردو مطبوعہ شوکت المطابع میرٹھ ۱۸۹۹ء)

اب سے چالیس پچاس سال ادھر اس قسم کی متبذل رکیک اور اہانت آمیز حکایت سازی بعض نجی محفلوں کی جان سمجھی جاتی تھی پھر غالب کی ہجو ملیح تو اس انداز سے کیگئی کہ —:

ناطقہ سر بگریباں ہے ......!

مرزا یاس یگانہ چنگیزی (وفات ۱۹۵۶ء) نے "چراغ سخن" (رسالہ عروض و قوافی) میں بلا کسی حوالے کے ایک اسی قسم کی حکایت تحریر فرمائی ہے۔

"غالب پر کیا؟ کتنے ہونہار شاعر اس قوت متخیلہ کی آزادی اور مطلق العنانی کی بدولت گمراہ ہو گئے اور بعضے جو گمراہ ہوئے وہ اس وقت تک راہ پر نہیں آئے جب تک قوت ممیزہ کو تخیل پر حاکم نہ بنالیا۔
میر تقی میر کیا جوہری سخن تھا۔ مرزا غالب کے شعر سن کر صاف کہدیا کہ اس لڑکے کو اگر کوئی استاد کامل مل گیا اور سیدھے راستے پر لگادیا تو لاجواب شاعر بن جائے گا ورنہ مہمل بکنے لگے گا۔
وہی ہوا کہ غالب نے نہ کسی کو استاد بنایا اور نہ راہ راست پر آئے۔
چنانچہ غالب کے کسی بے تکلف دوست نے یہ مطلع پڑھکر ازراہ تمسخر ان کی بہت تعریفیں کیں ؎

پہلے تو روغن گل بھینس کے انڈے سے نکال
بعد اس کے جزو گل بھینس کے انڈے سے نکال

غالب نہایت آزردہ ہوئے اور کہا نہ معلوم کس مسخرے نے یہ مطلع میری طرف منسوب کر دیا ہے اس پر ان کے مہربان نے فرمایا کہ —— بھئی برا کیوں مانتے ہو۔ تمھارے شعر تو ایسے ہی ہوتے ہیں "

(۳۹۔ چراغ سخن۔ مطبوعہ نولکشور پریس لکھنؤ دسمبر ۱۹۲۱ء)

شوکت میرٹھی اور بیان میرٹھی میں بعد المشرقین تھا۔ یہ اپنے زعم خود ستائی میں کسی کی ہجو سے بھی دریغ نہیں کرتے تھے اور وہ (بیاں میرٹھی) غالب کے پرستاروں میں تھے۔ غالب کے تتبع اور فنکارانہ عظمتوں کو وہ اپنے فکر و فن کی جان سمجھتے تھے۔ غالب کے رنگ میں کہتے تھے اور خوب کہتے تھے۔ ان کے بعض اشعار کا ایک ایک لفظ پکار پکار کر کہتا ہے کہ اگر غالب زندہ ہوتے تو اپنے اس معنوی شاگرد کو سینے سے لگا لیتے۔ چند شعر ملاحظہ ہوں۔

ان کا منجملۂ ارباب وفا ہو جانا
میرے نزدیک ہے بندے کا خدا ہو جانا

سر شوریدہ ہائے دشت پیما شام ہجراں تھا
کبھی گھر تھا بیاباں میں کبھی گھر میں بیاباں تھا

گئے تھے روندنے دل کو لئے بیٹھے ہیں تلوؤں کو
فرد رگ رگ میں نشتر ہے نہاں نس نس میں پیکاں تھا

گردش آسماں فلاخن ہے
آدمی سنگ ہیں زمانے کے

لیکن مولانا شوکت منفی سرشت کے انسان تھے زمانہ کے ساتھ چلنے کو اپنی توہین سمجھتے تھے۔ ہمیشہ عام روش سے ہٹ کر چلے جو ان کے نزدیک ان کی انفرادیت

کی روح تھی۔ اسی لئے غالب کی جو شرح انھوں نے لکھی اس کا ابتدائی تصور تو بیان میرٹھی کے ذہن و فکر کی پرواز کہا جاسکتا ہے اس کے علاوہ جو کچھ بھی اس شرح میں ہے وہ از اوّل تا آخر خود شوکتؔ ہی کی جودت طبع کا شاہکار ہے۔

شوکتؔ میرٹھی "طوطی ہند" (ہفت روزہ) کے علاوہ میرٹھ ہی سے ایک ادبی ماہنامہ "پروانہ" بھی نکالتے تھے ان کی "شرح حل کلیات اردو مرزا غالب دہلوی" سب سے پہلے "پروانہ" میں بالاقساط چھپی تھی۔ میرے پاس "پروانہ" کے کئی شمارے تھے افسوس کہ سب ضائع ہوگئے۔ صرف ایک بوسیدہ صفحہ تلاش سے ملا ہے۔ جس پر "پروانہ" جلد نمبر ا تحریر ہے غالباً آخری صفحہ ہے جس کی چند سطروں میں یہ اعلان ہے۔

"ماجو۔ اس لئے حل کلیات غالب (جو آج تک لغز اور چیستان سے کم نہیں سمجھا گیا اور کسی نے آج تک اس کے حل کا ارادہ نہیں کیا) بطور کتاب کے مع جدید طرز کی تحقیق لغت" کے شائع ہوتا رہے گا۔ مبصر ناظرین خود نگاہ انصاف سے ملاحظہ فرمائیں گے۔"

شوکت کی اس شرح (حل کلیات اردو مرزا غالب دہلوی) میں تخمیناً ۷۰۰ اشعار کی شرح کی گئی ہے۔ سرورق پر "شارح" کا نام اس التزام کے ساتھ دیا گیا ہے۔

"شہنشاہ اقلیم سخن ــ مجدد السنہ شرقیہ ـــ ابو ادریس مولانا حافظ احمد حسین صاحب شوکت مالک و مدیر اخبار "شحنۂ ہند و طوطی ہند و پروانہ"

شرح کی ضخامت ۱۴۶ صفحات پر مشتمل ہے۔ اختتام پر چودھری گھنشیام سنگھ خارؔ رئیس چندسینا کا ایک فارسی قطعۂ تاریخ ہے جس کا آخری شعر ہے۔

سال تاریخ خارؔ نکتہ شناس
گفت ۔ حل دقائق الغالب
۱۳۱۷ھ

شوکتؔ ایک خالص کاروباری قسم کے آدمی تھے جس کا ہلکا سا عکس آپ کو اس "اعلان عام" میں نظر آئیگا ۔ جو اسی شرح کے آخری صفحہ پر شائع کیا گیا ہے۔

"جن حضرات کو اُردو، فارسی، عربی شاعری کی تکمیل کا شوق ہو۔ اور اصناف سخن پر قادر ہونا چاہتے ہیں وہ حضرات مجدّد السنۂ مشرقیہ مولانا شوکتؔ کی جانب رجوع لائیں۔"

— جس پایہ کا شاعر بننا چاہیں گے کامیاب ہونگے اور جس درجہ کا کلام ہوگا اسی کی اصلاح ہوگی انشاء اللہ تعالیٰ۔

— یہ اعلان اس لئے دیا جاتا ہے کہ شعراء ہند تکمیل فن سے غافل ہیں ہر شخص اپنے حال میں مست ہے اور اپنے کو کامل سمجھتا ہے۔

— ہاں — ایسے بھی حضرات یقیناً موجود ہیں جن کو تشنگیٔ طلب ہے پس وہ آئیں اور "چشم تجدید" سے سیراب ہوں۔"

(شحنۂ ہند۔ میرٹھ)

ماہنامہ "پروانہ" کے جس بوسیدہ صفحہ کا ذکر کیا گیا ہے اس میں مولانا شوکتؔ کی ایک غزل بہ عنوان ذیل شائع ہوئی ہے۔

"از مجدّد الوقت شوکتؔ بجواب غزل حضرت غالبؔ دہلوی"

اس میں پندرہ اشعار ہیں اور تین کالمی لکھی گئی ہے۔ مصرعہ ثانی اور مصرعہ اولیٰ سب گڈمڈ ہو گئے ہیں۔ ہر سطر میں سیدھے سیدھے تین مصرعے لکھے ہیں۔ درمیان میں تالی — بیشتر اشعار بے روح اور صرف الفاظ کا مجموعہ ہیں۔ چند اشعار بطور نمونہ پیش کئے جا رہے ہیں۔

جلوہ افگن ہے مرقع حسنِ عالمگیر کا
آئینہ حیرت سے منہ تکتا ہے ہر تصویر کا

پردہ اے مانی کھلا پیشانی تحریر کا
تابِ رخ سے جل اٹھا خود پیرہن تصویر کا

بند ہے محشر میں ہر سو سلسلہ تقریر کا
شور گوش صور تک پہنچا مری زنجیر کا

لذّتِ دستِ نزاکت کے ہوئے دونوں شہید
چل رہا ہے میرے دم کے ساتھ دم شمشیر کا
وسعتِ وحشت سے شوکتؔ تنگ ہے یہ کسقدر
دامِ صحرا بن گیا حلقہ مری زنجیر کا

اس وقت جب طرز بیدل کی "شارحانہ اہمیت" پر زوال آچکا تھا اور ذی علم بزرگ اسے صرف مسخراپن سمجھتے تھے۔ اس زمانہ میں بھی یہ ادب عالیہ تنقیص کے حدود سے متجاوز ہی سمجھا جاتا تھا کیونکہ یہ انداز فکر عامیانہ تھا۔ ہوشؔ بلگرامی نے اپنے اسی متذکرہ مضمون میں جا بجا انھیں عامیانہ اور بازاری اصلاحات کا تذکرہ کیا ہے۔ چند نمونے ملاحظہ ہوں۔

لیتا ہوں مکتبِ غمِ دل میں سبق ہنوز
لیکن یہی کہ رفت گیا اور بود تھا

شوکتؔ نے اس کی شرح کرتے ہوئے لکھا ہے۔

"دل غم عشق کا ایک مکتب ہے۔ مگر مجھے اب تک پورا غم عشق الٰہی حاصل نہیں ہوا ابھی تو "ہیرا پھیری" کر رہا ہوں اور حقیقت یہی بات ہے۔ کیونکہ ہر شخص کا دل محبت الٰہی کی جانب راغب ہونے کی ہدایت کرتا ہے مگر نفس "اڑان گھائی" بتا دیتا ہے۔ (اجی۔ ابھی تو دودھ کے دانت بھی نہیں جھڑے۔ بڑھاپے میں دیکھ لیجئے گا) "بس غالبؔ اسی کا رونا روتا ہے"۔

(صفحہ ۷۴۔ عروس ادبؔ)

کیا بدگماں ہے مجھ سے کہ آئینہ میں میرے
طوطی کا عکس سمجھے ہے زنگار دیکھکر

شوکتؔ نے اس کی شرح ان الفاظ میں کی ہے۔

"یعنی۔ میں تو اس کے غم میں کسی قابل نہیں رہا اور وہ بھی بدگمان ہے۔ غالبؔ نے میرے جلانے کو اپنے پاس کوئی "مُسٹنڈی"

رکھ چھوڑی ہے:" (صفحہ ۶۵۔ عروس ادب)

ہے کس قدر ہلاکِ فریب وفائے گل
بلبل کے کاروبار پہ ہیں خندہ ہائے گل

شوکت نے اس مطلع کی شرح کاری کرتے ہوئے لکھا ہے:۔

"پھول خندہ زن ہیں کہ یہ "ڈھڈھو" میرے فریب کا "غپّا" کھا گئی۔ بھلا گل نے کہیں بلبل سے وفا کی ہے"

(صفحہ ۶۵۔ عروس ادب)

ان چند مثالوں سے ظاہر ہے کہ مولانا شوکت کی شرح ادبی اور تنقیدی زاویۂ نگاہ کی ترجمان نہیں تھی۔ جہاں تک تحریف و تصرف کا تعلق ہے غالب کے شرح کاروں میں ایسی بہت سی مثالیں ملتی ہیں کہ جن اشعار کے وہ معنی نہ سمجھ سکے ان میں اپنے ذہن و شعور کے سہارے تحریف و تصرف کر کے نئے معنی پنہا دیئے۔ شوکت کے یہاں یہ کمزوری عام ہے اور بعض جگہ تو ان کے تصرفات اتنے مہمل اور بے معنی ہو گئے ہیں کہ اصل شعر کی ہیئت ہی تبدیل ہو گئی ہے۔ ذیل میں تحریفات کی وہ مثالیں پیش کی جا رہی ہیں جنھیں ہوش بلگرامی نے اپنے مجموعہ مضامین (عروس ادب) میں نقل کیا ہے۔

معنی وحشت خرامی ہائے لیلیٰ کون ہے
خانۂ مجنونِ صحرا گرد بے دروازہ تھا

شوکت نے وحشت خرامی کو "وحشت خرابی" میں بدل دیا ہے۔ تحریر فرماتے ہیں۔

"حالی نے اس غزل کو بے معنی لکھ دیا ۔۔۔ ان کو شرم نہ آئی کہ اپنے استاد کو مہمل قرار دے دیا۔ ہمارے شعرا میں نازک کلام سمجھنے کی لیاقت نہیں"

مولانا حالی کے انتقال (۱۹۱۴ء) کے بعد رسالہ "نظارہ" میرٹھ میں تحریر فرماتے ہیں:۔

"ہم نے حضرت حالی کو اسی غزل کی شرح دکھائی۔ حیرت میں

رہ گئے۔ اور عذر و معذرت کرنے لگے"۔ (صفحہ ۴۸۔ عروس ادب)

نہ دے نامہ کو اتنا طول غالبؔ مختصر لکھ دے
کہ حسرت سنج ہوں عرض ستم ہائے جدائی کا

شوکتؔ نے مصرعہ اولیٰ میں "نامہ" کے بجائے "نالے" اور مصرعہ ثانی میں "حیرت سنج" بنادیا ہے۔

بجلی اک کوند گئی آنکھوں کے آگے تو کیا؟
بات کرتے کہ میں لب تشنۂ تقریر بھی تھا

شوکتؔ نے اس شعر میں صرف ایک نقطہ کم کر کے "کرتے" کو "کرنے" میں تبدیل کردیا ہے۔ جس سے پورا شعر مہمل ہوگیا ہے۔

مقصد ہے ناز و غمزہ۔ ولے۔ گفتگو میں کام
چلتا نہیں ہے دشنہ و خنجر کہے بغیر

مصرعہ اولیٰ میں "کام" کو بدل کر "نام" تحریر فرمایا ہے۔

ہے ناز مفلسانِ زر از دست رفتہ پر
ہوں گل فروشِ شوخیٔ داغ کہن ہنوز

مصرعہ ثانی میں "ہوں" کی جگہ پر "جوں" کردیا گیا ہے۔

ترے خیال سے روح "اہتزاز" کرتی ہے
بہ جلوہ ریزیٔ باد و بہ پرفشانی شمع

مصرعہ اولیٰ کے "اہتزاز" کو "احتراز" میں تحریف کر کے شعر کا مفہوم خبط کردیا گیا ہے۔

تماشا "کہ" اے محو آئینہ داری
تجھے کس تمنا سے ہم دیکھتے ہیں

اس شعر کے مصرعہ اولیٰ کو اس طرح پر تبدیل کیا گیا ہے۔

"تماشا کر" اے محوِ آئینہ داری

یعنی "کہ" کی جگہ پر "کر" کا تصرف کیا گیا ہے۔

"رو" میں ہے رخشِ عمر کہاں دیکھیے تھمے
عشق و مزدوریٔ "عشرت گہ" خسرو کیا خوب!

ان دونوں مصرعوں میں تحریف کی گئی ہے۔ "رو" کو "دو" اور "عشرت گہ" کو "عشرت کدہ" میں تبدیل کر دیا گیا ہے۔

بس کہ روکا میں نے اور سینہ میں ابھریں پے بہ پے
میری آہیں بخیۂ چاکِ گریباں ہو گئیں

شوکت کی تحریف کے بعد شعر اس قالب میں آگیا۔

بس کہ روکا میں نے اور سینہ میں ابھریں پے بہ پے
میری "آنکھیں" بخیۂ چاکِ گریباں ہو گئیں

یعنی بہ خیال مولینا شوکت "آہوں" اور "آنکھوں" میں جو ہلکا سا معنوی فرق تھا وہ اس اصلاح کے بعد بالکل دور ہو گیا۔

دیتے ہیں جنت حیاتِ دہر کے بدلے
نشہ بہ اندازۂ خمار نہیں ہے

"حیاتِ دہر" کو "عبادتِ دہر" میں بدل کر مصرعہ ہی ناموزوں کر دیا گیا۔

نہ پوچھ سینۂ عاشق سے آبِ تیغِ نگاہ
کہ زخمِ روزنِ در سے ہوا نکلتی ہے

پہلے مصرعہ میں "پوچھ" کو "پونچھ" اور دوسرے مصرعہ میں "سے" کو "ہے" میں بدلا گیا ہے۔

غنچہ تا شگفتنہا برگِ عافیت معلوم
باوجودِ دلجمعی خوابِ گل پریشاں ہے

شوکت میرٹھی نے مصرعہ اولیٰ میں "تا شگفتنہا" کا ایک نقطہ اڑا کر اسے "نا شگفتنہا" بنا دیا اور اس کی شرح یوں بیان فرمائی ہے:۔

"یعنی نہ کھلنے کا نام ہی غنچہ ہے۔ پس سامان آسائش کجا؟"

غالب کے اس نازک شعر کی شرح کا رانہ تاریخ اپنے دامن میں ایک ادبی

اور تاریخی واقع کو لئے ہوئے ہے۔ یوں تو خود غالب نے اس شعر کے معنی "عود ہندی" میں بیان کئے ہیں لیکن نظم طبا طبائی نے نہایت ہی دلچسپ واقعہ تحریر فرمایا ہے۔

"میں جب دیوان غالب کی شرح لکھ رہا تھا تو یہ شعر دیکھ کر مجھے فکر ہوئی کہ یہ کوئی کہنے کا طرز نہیں ہے اس میں ضرور تحریف ہوئی ہے خیال میں یہ بات آگئی کہ مرزا غالب "تا" کا استعمال اس طرح بھی کرتے ہیں ع

دیدہ تا دل اسد آئینہ یک پرتوِ شوق

وہی "تا" یہاں بھی ہے۔ یعنی۔ "غنچہ تا شگفتنہا"۔

میری شرح چھپ کر نکل چکی ہے۔ میں مرزا داغ سے بیٹھا ہوا باتیں کر رہا ہوں ایک عنایت فرما یادش بخیر نواب سائل دہلوی دوسرے کمرہ سے اٹھ کر یہیں آ بیٹھے۔ وہ شوکت میرٹھی کی شرح میں شاید یہ فقرہ دیکھ چکے تھے۔ غنچہ کیا ہے" ناشگفتنہا ہے"۔

داغ مرحوم کے سامنے حضرت سائل نے اس شعر کو یوں ہی پڑھا۔ "غنچہ ناشگفتنہا......" مرزا داغ نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پکڑ لیا پھر سر اٹھا کر میری طرف دیکھنے لگے کہ۔ دیکھو اس نے (بھی) تو شرح لکھی ہے یہ کیا کہتا ہے؟ میں نے شعر کو صحیح کر کے پڑھ دیا اس پر جناب سائل نے مجھ سے پوچھا ہی تھا۔ کہ "ناشگفتنہا" کے کیا معنی؟۔ کہ مرزا داغ مرحوم بول اٹھے کہ۔ "تا شگفتنہا" پڑھو۔

(صفحہ ۳۔ اودھ پنچ لکھنؤ۔ شمارہ ۳۱۔ جلد ۱۰
بابت ۱۹ اگست ۱۹۲۵ء)

اصلاح۔ تحریف۔ تصرف۔ اور وہ بھی غالب کے کلام میں؟ یقیناً صحت مند تنقید کے تقاضوں کو پورا نہیں کرتی ۔ غلطیاں غالب نے بھی کی ہیں

اور میرؔ نے بھی۔ مصحفیؔ نے بھی سوداؔ نے بھی۔ آتشؔ کے یہاں بھی اس کی مثالیں ملیں گی اور ناسخؔ کے یہاں بھی۔ نہ انیسؔ کا دامن اغلاط سے پاک ہے نہ دبیرؔ کا ——— لیکن جدید تنقید اصولی حیثیت سے اس زاویۂ نگاہ سے اتفاق نہیں کرتی کہ تنقید نگاری میں اصلاح کاری کے استادانہ فن کو بھی سمو دیا جائے۔ پھر شرح نگاری میں اصلاح کاری کے فنی کمالات کا مظاہرہ کرنا ایک طرح سے علمی اور ادبی خیانت کا درجہ رکھتا ہے — اور شوکتؔ میرٹھی کی شرح اس معیار پر پوری نہیں اترتی بلکہ اس کے ایک ایک لفظ سے غالبؔ کی عظمت فن پر "ہجو ملیح" کی چوٹ پڑتی ہے۔

"ایک نئی دریافت"

جب تک دہانِ زخم نہ پیدا کرے کوئی
مشکل ہے تجھ سے راہِ سخن وا کرے کوئی

(غالبؔ)

ہر جستجو عبث جو تری جستجو نہ ہو
دل سنگ و خشت ہے جو تری آرزو نہ ہو
وہ آہ رائیگاں ہے نہ لگ جائے جس سے آگ
ان آنسوؤں پہ خاک کہ جن میں لہو نہ ہو
ممکن نہیں ہے حُسنِ حقیقت کا دیکھنا
آئینۂ مجاز اگر روبرو نہ ہو؟
بے کیف بادہ ہیچ ہے۔ بے رنگ گل فضول
وہ حسن کیا ہے جس میں حقیقت کی بُو نہ ہو
جی بھر کے خوب حسرت و ارماں کو رو چکا
اب آرزو یہ ہے کہ کوئی آرزو نہ ہو
غالبؔ نمازِ عشق کی مقبولیت محال
جب تک کہ اپنے خون جگر سے وضو نہ ہو

اس "نو دریافت غزل" کا تذکرہ ڈاکٹر حکم چند نیرؔ (صدر شعبۂ اردو بنارس ہندو یونیورسٹی) نے سہ ماہی "صحیفہ" لاہور کے غالب نمبر (حصّہ اوّل) بابت ماہ مارچ ۱۹۶۹ء میں اس تمہید کے ساتھ کیا ہے۔

"چند برس ادھر کی بات ہے کہ غالب اکاڈمی بنارس میں ایک ادبی اجتماع کا انتظام کیا گیا تھا .... ڈاکٹر برج موہن صاحب (صدر جلسہ) نے اپنی تقریر میں کلام غالب کے محاسن بیان کرتے ہوئے ایک بڑے پتے کی بات کہی تھی وہ یہ کہ ــــ مرزا غالب کو شعر گوئی پر بڑی قدرت حاصل تھی اور وہ بڑی سے بڑی بات کو ایک شعر میں

لہ ڈاکٹر حکم چند نیرؔ کا یہ مضمون (مرزا غالب کی ایک نئی غزل) اس سے قبل ماہنامہ فروغ اردو لکھنؤ کے "غالب نمبر" بابتہ ماہ نومبر و دسمبر ۱۹۶۸ء جلد ۱۵ شمارہ ۷ و ۸ صفحات ۸۹-۹۳ پر شائع ہو چکا ہے۔ (نادم سیتاپوری)

تمام وکمال خوبی سے بیان کر دیتے تھے موصوف نے اس امر کی وضاحت کرتے ہوئے مرزا صاحب کا یہ شعر پیش کیا تھا :۔

ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند
گستاخیٔ فرشتہ ہماری جناب میں

اور کہا کہ ـــ اس شعر کو وسعت دیجئے تو علامہ اقبالؔ کی مشہور نظم "شکوہ" بن جاتی ہے۔ علامہ اقبالؔ کو جو بات کہنے کے لئے ایک طویل نظم کہنا پڑی مرزا غالبؔ نے اسے دو مصرعوں میں کس خوبی سے بیان کر دیا ہے۔

موصوف (برج موہن صدر جلسہ) کی تقریر کے بعد ایک صاحب نے پرسوز لَے میں ایک غزل چھیڑی۔ آلات موسیقی کا انتظام کیا گیا تھا سنتے ہی صفیؔ مرحوم (لکھنوی) کا وہ شعر بے اختیار زبان پر آ گیا جو مرحوم نے شاید کسی ایسے ہی موقع کے لئے کہا تھا۔

غزل اس نے چھیڑی مجھے ساز دینا
ذرا عمر رفتہ کو آواز دینا

غزل کی شگفتگی۔ مطرب کی مہارت۔ خوش گلوئی اور آلات موسیقی کے زیر و بم سے گویا محفل سماع کا سماں بندھ گیا تھا۔ سامعین اس سے لطف اندوز ہو رہے تھے کہ مقطع نے یکایک چونکا دیا ـــ کیونکہ غزل کو غالب سے منسوب کیا گیا تھا۔

جہاں تک مجھے یاد تھا یہ غزل مرزا غالب کے کسی مطبوعہ دیوان میں شامل نہ تھی۔ اسی زمین اور ردیف و قافیے میں غالب کے یہاں ایک غزل ملتی ہے ـــ لیکن مغنّی نے جو چھ شعر یہاں سنائے تھے ان میں سے کوئی شعر بھی دیوان میں موجود نہیں ہے۔

اس امر نے آتش شوق کو بھڑکا دیا۔ محفل برخاست ہوئی تو میں نے مغنّی موصوف سے کچھ استفسارات کئے جن کے جواب میں انھوں نے

بتایا کہ میرا نام "محمد ایوب خاں" معروف بہ "ببن دیوانہ" ہے۔ محلہ شورگران اجمیر شریف کا رہنے والا ہوں۔ میرے مورث اعلیٰ چاند خاں اور برخوردار خان کا شمار ہندوستان کے مشہور مغنیوں اور موسیقاروں میں ہوتا تھا۔ ان میں سے اوّل الذکر شاعر بھی تھے اور "چاند پیا" تخلص کرتے تھے۔ ان کی لکھی ہوئی ٹھمریاں ہندو پاک کے مغنی آج بڑے ذوق و شوق سے گاتے ہیں۔ غزل کے بارے میں انھوں نے بتایا کہ یہ غزل مجھے اپنے خاندان کی ایک قدیم بیاض سے ملی تھی اس ضمن میں راقم نے کئی سوالات کیے مثلاً یہ کہ بیاض کا مرتب کون تھا؟ ان کا مرزا غالب سے کوئی تعلق تھا یا نہیں؟ اگر تھا تو اس تعلق کی نوعیت کیا تھی؟ اگر کوئی تعلق نہیں تھا تو مرتب بیاض کو یہ غزل کیسے اور کہاں سے دستیاب ہوئی؟ وہ بیاض یا اسکے منتشر اوراق اب محفوظ ہیں یا نہیں؟ اگر محفوظ ہیں تو کہاں اور کس کے پاس ہیں۔؟ اور اگر محفوظ نہیں تو کہاں گئے۔؟

ان سوالات کے جواب میں انھوں نے کہا کہ میرے خاندان کے کچھ افراد تقسیم ملک کے بعد پاکستان چلے گئے اس لئے میں سر دست ان سوالات کا کوئی اطمینان بخش جواب نہیں دے سکتا۔ ممکن ہے کہ میرے کچھ بزرگ ان امور پر کوئی روشنی ڈال سکیں۔

کچھ دنوں کے انتظار کے بعد میں نے موصوف کو دو تین خط لکھے لیکن کوئی جواب نہ ملا.....،،

(صفحات ۶۱-۶۲ سہ ماہی صحیفہ لاہور غالب نمبر حصہ اوّل)

اسی ردیف قافیے اور زمین میں ڈاکٹر حکم چند نیّر نے نسخہ حمیدیہ اور مخطوطہ شیرانی کے حوالے سے سات اشعار اس تمہید کے ساتھ نقل کیے ہیں:۔

"دیوان غالب کے نسخہ بھوپال اور مخطوطہ شیرانی میں اس نو دریافت غزل کی زمین اور ردیف و قوافی میں سات شعروں کی مندرجہ ذیل موجود ہے۔

بے دردِ سر بسجدۂ الفت فرو نہ ہو
جوں شمع غوطہ داغ میں کھا کر وضو نہ ہو

دل دے کفِ تغافل ابروئے یار میں
آئینہ ایسے طاق میں گم کر کہ تو نہ ہو

زلفِ خیال نازک و اظہار بیقرار
یارب بیان شانہ کشِ گفتگو نہ ہو

تمثالِ یار جلوۂ نیرنگ اعتبار
ہستی عدم ہے آئینہ گر روبرو نہ ہو

مژگاں خلیدۂ رگِ ابرِ بہار ہے
نشتر بہ مغز پنبۂ مینا فرو نہ ہو

عرض نشاطِ دید ہے مژگانِ انتظار
یارب کہ خار پیرہن آرزو نہ ہو

واں پر فشان دام نظر ہوں جہاں اسدؔ
صبح بہار بھی قفس رنگ و بو نہ ہو

(صفحہ ۶۴-۶۵ صحیفہ غالب نمبر حصّہ اوّل)

قرائن اور قیاسات کی روشنی میں ڈاکٹر حکم چند نیرؔ نے اس "نو دریافت غزل" کا عمیق تجزیہ بھی کیا ہے اور ان امکانات کو سامنے رکھکر اس نقطۂ نگاہ کی ترجمانی بھی کی ہے جو اسے کلام غالب کا درجہ دے سکتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود خود ڈاکٹر حکم چند نیرؔ جس نتیجے پر پہنچے ہیں اس سے ظاہر ہے کہ وہ اسے غالبؔ کے افکار عالیہ سے منسوب نہیں کرتے بلکہ "تحقیق جدید" کی

اساس وبنیاد پر وہ خود اسے کلام غالبؔ کا درجہ دینے پر تیار نہیں ہیں۔

ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں ——

"مرزا غالب کے متقدمین اور معاصرین میں ایسے کئی شاعر ہوئے ہیں جن کا تخلص غالبؔ تھا۔ ان میں سے کئی شاعر اچھے بھی تھے لیکن —

ایں سعادت بزور بازو نیست

کے سبب انھیں زیادہ شہرت حاصل نہ ہو سکی۔ ممکن ہے کہ یہ غزل کسی اور "غالبؔ" کی ہو۔ اور مطربوں نے اسے مرزا غالبؔ سے منسوب کر دیا ہو —

مزید براں غزل جس بیاض سے حاصل ہوئی ہے اس کا وجود (رہی) مجہول ہے۔ مرتب بیاض کا مرزا غالب سے بظاہر کوئی تعلق معلوم نہیں —— مرزا غالب کے خطوط یا دوسری تحریروں میں ایسے کسی شخص کا ذکر نہیں ملتا —— ان حالات میں تحقیق و تصدیق کے بغیر اس غزل کو مرزا غالب سے منسوب کرنا احتیاط کے خلاف ہوگا۔"

(صفحہ ۶۷۔ صحیفہ غالب نمبر حصہ اوّل)

دیوانِ غالبؔ

(چند تبصرے)

ہیں اور بھی دنیا میں سخن ور بہت اچھے
کہتے ہیں کہ غالبؔ کا ہے اندازِ بیاں اَور

(غالبؔ)

اُردو شعر و ادب کی تاریخ میں یہ امتیاز شاید غالب کے سوا کسی کو بھی حاصل نہیں ہے کہ ان کے اُردو دیوان کے پانچ چھ ایڈیشن ان کی زندگی ہی میں شائع ہو گئے اور ان کے بعد تو مہنگے سستے خوبصورت اور بدصورت۔ غلط صحیح خدا جانے کتنے ایڈیشن شائع ہوئے اور اب تک چھپ رہے ہیں۔

اپنے کلام کی نشر و اشاعت سے غالبؔ کو جو فطری لگاؤ تھا اس کا بھی تقاضا یہی تھا کہ اس کی طباعت اور اشاعت پر کوئی پابندی عائد نہ کی جاتی ــــ اس کے علاوہ ان کے اردو دیوان کا پانچواں ایڈیشن جب ۱۸۶۳ء میں شائع ہوا اس وقت تک کتابوں کے حقوق طباعت و اشاعت پر کوئی قانونی پابندی عائد نہیں تھی اس قسم کی قانونی پابندی سب سے پہلے ۱۸۶۷ء میں ایکٹ ۱۸ (بابتہ ۱۸۶۷ء) کے ذریعہ عائد کی گئی۔ اور وہ بھی اس طرح پر کہ مصنفین کو ناشرین سے حقوق طباعت کے متعلق معاہدہ کرنا ہوتا تھا اور پھر ناشر اس معاہدے کے مطابق اس کتاب کو ایکٹ ۱۸-۱۸۶۷ء کے تحت رجسٹری کراتا تھا چنانچہ ۱۸۶۷ء کے بعد شائع ہونے والی کتابوں میں بکثرت اس کی مثالیں ملتی ہیں۔

تذکرۂ "آبِ حیات" کا جو ایڈیشن مطبع مفید عام لاہور نے ۱۸۸۷ء میں شائع کیا ہے اس کے آخری صفحہ پر "اعلان" ہے اور اس کے نیچے خود محمد حسین آزاد کے دستخط ہیں۔

"اس کتاب کا حق تصنیف ایک فو چھاپنے کے لئے مصنف صاحب سے خریدا گیا ہے پس کوئی صاحب اس کو چھاپ نہیں سکتا اور جب تک میری چھاپی ہوئی کتابیں بک جائیگی تب تک فاضل مصنف کسی کو اس کے چھاپنے کی اجازت نہ دیں گے اور نہ خود چھاپیں گے۔ جس صاحب کو اس گوہر بے بہا کی ضرورت ہو وہ بذریعہ منی آرڈر نقد قیمت عہ (ایک روپیہ چار آنہ) اور ۲ر محصول ڈاک بھیج کر منگوالیں۔

المشتہر:- گلاب چند مہتمم مطبع مفید عام لاہور و گورنمنٹ پبلشر و بک سیلر بکڈپو پنجاب لاہور

اس کے نیچے اودی روشنائی سے لکھا ہوا ہے۔ "محمد حسین آزاد عفی عنہ"

ایکٹ نمبر اٹھارہ کے نفاذ سے پہلے غالب کے علاوہ اور جن شعرا کے دیوان شائع ہو چکے تھے وہ بھی عام طور سے اس قانون کے دائرہ عمل سے باہر ہی رہے! میر۔ سودا۔ جرأت۔ انشاء۔ خواجہ درد۔ آتش۔ ناسخ۔ ذوق اور مومن وغیرہ۔ ان سب کے دواوین شائع ہو چکے تھے اور برابر چھپتے رہے۔! لیکن سب سے زیادہ ایڈیشن غالب کے دیوان اردو کے شائع ہوئے جو ان کے کلام کی مقبولیت کا سب سے بڑا ثبوت ہیں۔ سرسری اندازے کے مطابق ان ایڈیشنوں کی تعداد اب تک سَو سوا سَو (۱۲۵) سے کم نہیں ہے اور اس میں ساڑھے تین آنے سے لیکر سوا سو روپے قیمت تک کے دیوان غالب شامل ہیں!

دیوان غالب کے سب سے مہنگے ایڈیشنوں میں "مرقع چغتائی" کے بعد سب سے زیادہ مہنگا ایڈیشن "ہندوستان بک ٹرسٹ بمبئی" کی طرف سے مشہور ترقی پسند ادیب علی سردار جعفری نے شائع کیا ہے جس کی قیمت بہ اعتبار "قسم" تیس روپیہ سے لیکر سوا سو روپیہ تک معیّن کی گئی ہے۔ اس ایڈیشن کی کوئی معنوی حیثیت تو ہے نہیں البتہ اس کی ظاہری آرائش و زیبائش پر چھتیس ہزار روپیہ ضرور برباد کر دیا گیا ہے دیوان غالب کے اس ایڈیشن کی اشاعت کا مقصد عوامی تو تھا ہی نہیں؛ صرف اس کی دیدہ زیبی اور حسن طباعت کی کاروباری نمائش مقصود تھی چنانچہ وہ سرکاری اور غیر سرکاری "ارباب ہمم" کے عطیات سے حاصل کر لی گئی۔ اس ایڈیشن کی نامقبولیت کا اندازہ صرف اس بات سے لگا جا سکتا ہے کہ اس کی پبلسٹی اور پروپیگنڈے کے لئے خود جناب سردار جعفری کو اپنے مخصوص اسلوب نگارش کا سہارا لینا پڑا اور انجمن ترقی اردو (ہند) کے ترجمان ہفت روزہ "ہماری زبان" علی گڑھ نے اس قسم کے خالص کاروباری مضامین کو نمایاں اہمیت کے ساتھ اپنے غیر کاروباری صفحات میں جگہ دی! "ہماری زبان" کے صفحات پر اس قسم کے خالص کاروباری مضامین کو دیکھکر میرے کئی احباب نے مجھے لکھا۔ اور انھیں کے تاثرات کی ترجمانی کرنے کے لئے میں نے "ہماری زبان" میں ایک مضمون بھیجا۔ جو بہت ہی "فکر و تصدیق" کے

بعد ۱۸ اپریل ۱۹۶۰ء کے "ہماری زبان" میں (بصورت مضمون نہیں) "مراسلات" کے تحت جگہ پاسکا اور وہ بھی اس طرح پر ـــ کہ میرے مضمون کے کئی ضروری حصے میری اجازت کے بغیر حذف کر دیئے گئے۔ اپنے اس مضمون (اردو کی ایک مہنگی کتاب اور اس کا ردِعمل) میں میں نے عرض کیا تھا۔

"یکم مارچ ۱۹۶۰ء کے ہماری زبان میں مشہور ترقی پسند ادیب سردار جعفری صاحب کا مضمون اردو کی سب سے مہنگی کتاب" نظر سے گذرا جو اس "اردو کشی" کے سخت دور میں یقیناً ایک معلومات افزا تاریخی دستاویز کا درجہ رکھتا ہے جس کے لئے ہمیں جعفری صاحب کا ممنون ہونا چاہیئے! جعفری صاحب نے "دیوان غالب" کے ایک اور صرف ایک اڈیشن پر چھتیس[۳۶] ہزار روپیہ خرچ کر کے اتنا بڑا کام انجام دیا ہے جس کی مثال شاید ۱۹۴۷ء کے بعد اب تک کہیں نہ ملے گی۔ یقیناً ان کی خلوص مندی ہر قسم کے توہمات سے پاک و صاف ہے لیکن مجھے معاف فرمایا جائے کہ یہ انتہائی گراں اردو دوستی اس دور کی تاریخی "منھ بھرائی" تو کہی جا سکتی ہے کوئی کارآمد خدمت نہیں ہے جہاں تک غالب پسندی اور غالب پرستی کے جذبۂ عقیدت کا تعلق ہے اس پر کسی کو اعتراض نہیں ہو سکتا لیکن ہندوستان کے موجودہ اقتصادی بحران نے ہماری "قوت خرید" کو قریب قریب ختم کر دیا ہے اس کو مدنظر رکھا جائے تو جعفری صاحب کی یہ شرح "مہنگا سودا" ہے۔ انھوں نے "دیوان غالب" کی مقبولیت کا ذکر کرتے ہوئے فلم انڈسٹری کے کچھ باذوق ارباب ہمم کا تذکرہ کیا ہے۔ جنھوں نے اس دیدہ زیب اڈیشن کی پیشکش کو اسی روایتی کرّوفر سے قبول کیا جس طرح جاگیردارانہ نظام میں ایسے شاندار ادبی کارناموں کی حوصلہ افزائی کی جاتی تھی۔ لیکن ان دو ایک مثالوں سے کسی طرح یہ ثابت نہیں ہوتا کہ اردو خوان طبقہ کی قوت خرید میں کسی قسم کا اضافہ ہو گیا؟ اس سلسلہ میں حکومت ہند کے اس انعام پر بھی کوئی فخر نہیں کیا جا سکتا جو اردو (شعر و ادب) کو نہیں بلکہ ان رنگین و دیدہ زیب

نقش و نگار کو "بخشا" گیا ہے جن پر صرف "چھتیس ہزار" کی معمولی رقم خرچ کیگئی ہے۔ غور طلب بات یہ ہے کہ یہ رقم جو "دیوان غالب" کے اردو ہندی ایڈیشن پر صرف کیگئی۔ اتنی ہی ہے جتنی سالانہ رقم ہندوستان کے سب سے بڑے اردو ادارے (انجمن ترقی اردو ہند) کو حکومت دیتی ہے اور اسی رقم کے سہارے انجمن کا ایک ہفتہ وار اخبار ایک سہ ماہی رسالہ اور غالباً بارہ چودہ کتابیں ہر سال شائع کی جاتی ہیں اس کے علاوہ انجمن کا مرکزی دفتر اسی ایک سہارے پر قائم ہے۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہندوستان بک ٹرسٹ (بمبئی) کوئی عوامی ادارہ نہیں ہے اور اس کو حق حاصل ہے کہ وہ کسی کتاب کی طباعت پر لاکھوں روپیہ صرف کر دے! مگر آج کے بدلے ہوئے "نظام معیشت" میں ہر فرد کی وہ تمام سرگرمیاں زیر بحث لائی جا سکتی ہیں جن کا براہ راست یا بالواسطہ اثر قومی۔ تہذیبی۔ سماجی یا ملکی مفاد پر پڑتا ہو۔ جعفری صاحب اشتراکی "نظریۂ حیات" کے علمبردار ہیں ان سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ ایسے فرسودہ نظام کی صرف اس لئے تائید کرینگے کہ اس سے ان کے ایک دانستہ یا نادانستہ اقدام پر حرف آتا ہے! "دیوان غالب" کے چغتائی ایڈیشن کی اشاعت کے وقت بھی یہ مسئلہ موضوع بحث بنا تھا کہ اتنی مہنگی کتابوں کی اشاعت سے اُردو کو نقصان پہنچ رہا ہے یا نفع؟ لیکن غیر منقسم ہندوستان میں انفرادی ملکیت کا نظریہ مقبول ہونے کی وجہ سے اس مسئلہ کو قومی و تہذیبی مسئلہ نہیں بنایا جا سکتا تھا۔ مگر آج کے نظام میں ہماری ہر انفرادی جدوجہد پورے سماج اور قوم کو متاثر کر رہی ہے۔ جب محبوب (فلم پروڈیوسر) نے "آن" فلم بنائی تو ساری فلم انڈسٹری میں تہلکہ مچ گیا کہ اتنی مہنگی اور قیمتی فلم بنا کر انڈسٹری کے مستقبل کو نقصان پہنچایا گیا ہے چنانچہ "آن" کے بعد کئی سال تک معیاری اردو فلموں کی (جنھیں حکومت ہند کی سرکاری رپورٹوں میں غلط طور پر "ہندی فلم" لکھا جاتا ہے) تعداد برابر کم ہوتی چلی گئی۔

موجودہ حالات میں اردو کی معیاری کتابوں کی نشرو اشاعت پر ایک اچھا

خاصا جمود طاری ہو چکا ہے پھر بھی گھٹیا قسم کا جاسوسی اور جنسیاتی لٹریچر کافی ترقی کر رہا ہے مگر اس کے باوجود اردو کی شاید ہی کوئی کتاب ایک ہزار سے زیادہ چھپتی ہو۔ اور ناشرین کا بیان تو یہی ہے کہ یہ ایکہزار جلدیں بھی برسوں گودام میں پڑی رہتی ہیں۔

اردو کی کسی بڑی سے بڑی معیاری کتاب پر اس وقت پانچ ہزار سے زیادہ خرچ نہیں کیا جاتا پھر چھتیس ہزار روپیہ اگر صرف ایک کتاب کی "دیدہ زیبی" پر خرچ کر دیا جائے تو یہ اردو زبان و ادب پر کوئی احسان نہیں بلکہ اس کی ترقی میں رکاوٹ ڈالنے کا مترادف ہے جو برسہا برس اس "نیم مردہ" زبان کو پنپنے نہ دے گی۔"

(ہفت روزہ ہماری زبان علی گڑھ۔ ۱۵ مئی ۱۹۶۰ء)

اس مضمون میں جس کی اہمیت گھٹانے کے لئے ادارہ "ہماری زبان" نے اسے مراسلت میں جگہ دی تھی ایک اصولی بات کہی گئی تھی جس کا تعلق نہ تو ذاتیات سے تھا نہ جعفری صاحب کے خلوص نیّت سے! لیکن "ایک پارٹی" نے اسے خواہ مخواہ ذاتی سوال بنا کر میرے خلاف ایک مہم شروع کر دی۔ "ہماری زبان" کے اوراق کی آغوش ان کے لئے کھلی ہوئی تھی۔ میرے خلاف زیادہ اور میرے حق میں بہت ہی کم مراسلوں کو جگہ دی گئی۔۔! جعفری صاحب کے ایک "نیازمند" جناب خلش کاشمیری تو ابتذال اور چھچھورپن تک اتر آئے! لیکن عمومی تاثرات کچھ اس قسم کے تھے

"ہماری زبان" بابتہ ۱۵ اپریل میں جناب نادم سیتاپوری کا مراسلہ "اردو کی سب سے مہنگی کتاب کا ردعمل" نظر سے گذرا۔ میں بہت حد تک موصوف کے ارشادات سے متعلق ہوں۔

مجھے یہ تو معلوم نہیں کہ سردار جعفری کے مرتبہ دیوان غالب کے تیس روپیہ اور سوا سو روپیہ قیمت والے دو الگ الگ ایڈیشن چھپے ہیں یا ایک، جو ایڈیشن میری نظر سے گذرا ہے اس کی قیمت علاوہ فرہنگ کے تیس روپیہ ہے اور اس کے صرف پہلے دو صفحات منقش ہیں ممکن ہے سوا سو روپیہ قیمت والے ایڈیشن کے

تمام صفحات منقش ہوں۔ میں اس سے قبل دیوان غالب کے تین مختلف ایڈیشن "مرقع چغتائی"، نقش چغتائی اور دیوان غالب مطبوعہ تاج کمپنی بھی دیکھ چکا ہوں ان کے پیش نظر میں زیر بحث ایڈیشن کو کوئی فوقیت دینے کے لئے تیار نہیں۔ سوائے اس کے کہ یہ ایڈیشن ٹائپ میں چھپا ہے ۔ اور اس کی خصوصیت صرف یہ ہے کہ ساتھ ہندی کا اضافہ ہے ۔ مگر اردو ہندی ہر دو میں ہر صفحہ پر کئی غلطیاں اس "گراں بہا کتاب" میں بری طرح کھٹکتی ہیں۔ معلوم نہیں طباعت کی کس خوبی پر اس کتاب کو انعام کا مستحق سمجھا گیا۔ ؟"

"ہماری زبان" بابتہ یکم مارچ میں سردار جعفری کا " اردو کی سب سے مہنگی کتاب" کے عنوان سے جو مضمون شائع ہوا اس میں جعفری صاحب نے چند حضرات کی جانب سے کتاب کی قدر افزائی کا ذکر فرمایا ہے یہ قدر افزائی کسی وزیر نواب یا فلمی شخصیت سے ہی ممکن تھی گویا ایک پسندیدہ شعر پر موتیوں سے شاعر کا منہ بھرنے کی روایت قائم رہنی چاہیئے۔ لیکن "احمد آباد" کے مزدوروں کو اپنے لیڈر کا مرتبہ دیوان غالب خریدنے کے لئے چندہ جمع کرنے کے سوا واقعی کوئی چارہ نہیں تھا۔ جذبہ ہر دو جانب کوئی زیادہ مختلف نہیں دیوان مطالعہ کی غرض سے نہ وہاں خریدا گیا ہے اور نہ یہاں۔ !

نرخ بالا کن کہ ارزانی ہنوز

کی ہانک لگانے اور مزدوروں کے چندے پر فروخت کرنے کے لئے چھتیس ہزار روپیہ فی ایڈیشن لاگت کا "دیوان غالب" چھاپنے والوں کو اس کی فروخت کے سلسلے میں یہ "سنسنی خیز" خبر بھی پہنچا دیجئے کہ ایک بڑے اور ادب دوست سرکاری افسر نے آپ کے شائع کردہ "دیوان غالب" کی کچھ جلدیں منگوا کر اپنے ماتحت افسران کے حوالے کر دیں کہ وہ انھیں فروخت کریں "حکم حاکم" کے تحت تیس روپیہ قیمت کی یہ کتاب بعض ناخواندہ اور غریب دیہاتیوں کے سر زبردستی منڈھ کر ان سے مطلوبہ رقم حاصل کی گئی۔ یہ غریب کسان بادل ناخواستہ رقم ادا کر کے بیشمار صلواتیں سناتے ہوئے کتاب لیکر باہر نکلتے تو اونے پونے یعنی برائے نام قیمت پر کسی پڑھے لکھے آدمی کو دیتے دیکھے گئے ۔ ! کیا فرماتے ہیں فدایان غالب! در حامیان عوام ؟ ۔ آخر یہ کتاب

صرف وزیروں اور "دلیپ کماروں" ہی کے خریدے بغیر فروخت نہیں ہوگی۔"

(ہفت روزہ ہماری زبان علی گڈھ، ۸ رمئی ۱۹۶۰ء)

"ہماری زبان" میں نادم سیتاپوری۔ سورج تنویر اور دور آفریدی کے مراسلات کے علاوہ سیّد محمد تقی صاحب کا مضمون "سردار جعفری کے نام" بھی دیکھا جو اس مسئلہ پر ایک حد تک روشنی ڈالتا ہے۔ ذاتی تجربہ کی بنا پر میں یہ خبر آپ تک پہنچا دینا چاہتا ہوں کہ دیوان غالب مرتبہ علی سردار جعفری قیمت تیس روپے کو پڑھنے کیلئے لائبریری میں مجھے چھ کارڈ بطور ضمانت جمع کرنا پڑے کیونکہ اتنی مہنگی کتاب صرف ایک لائبریری کارڈ پر جو چھ روپیہ میں بنتا ہے نہیں مل سکی! اس کتاب کی حیثیت لائبریری میں RFFRENCE BOOK کی ہے۔

بہتر تو یہ ہوتا کہ چھتیس ہزار کی بڑی رقم اگر غیر ملکی ادیبوں اور شاعروں کے تراجم پر خرچ کی جاتی تو یہ شکوہ جو خود علی سردار جعفری کو ہے کہ اردو زبان میں غیر ملکی ادیبوں کے لئے کچھ نہیں" ہوا۔ اس کا تھوڑا بہت ازالہ تو ہو ہی جاتا اور یہ کہ اقبال۔ غالب۔ فراق اور کرشن چند اور مجاز کے بعد بھی اردو ادب کو دوسرے بڑے ادیبوں اور شاعروں کی ضرورت ہے یہ اردو کے آخری بڑے شاعر اور ادیب تو نہیں ہیں ان سے بڑے اور اچھے شاعروں اور ادیبوں کو اُردو اَدب کی کوکھ سے جنم لینا ہے اور لیں گے۔"

(ہفت روزہ ہماری زبان علی گڈھ۔ یکم جون ۱۹۶۰ء)

ایک قریب العہد مخطوط

دیوان غالب (اردو) کے نادر مخطوطات جو اب تک دستیاب ہوئے ہیں مطبوعہ ایڈیشن مخطوطات کی صف میں آگئے چنانچہ آج اس کے پہلے ایڈیشن (مطبوعہ ۱۸۴۱ء) کو وہ اہمیت حاصل ہے جو کسی اہم مخطوطے کو دی جا سکتی ہے۔

مجھے اردو دیوان غالبؔ کا ایک ایسا ہی "قریب العہد" مخطوط ملا ہے جو اس اعتبار سے اہمیت رکھتا ہے کہ اس کی ترتیب و تدوین ابتدائی مطبوعہ نسخوں سے مختلف ہے غالبؔ کا دیباچہ فارسی اور نواب ضیاء الدین احمد خاں کی عبارت "خاتمہ" اگرچہ وہی ہے جسے مولانا عرشی نے "نسخہ عرشی" کے صفحات ۱۲۰-۱۲۱ اور ۲۵۵ لغایتہ ۲۵۸ پر نقل کیا ہے لیکن ترتیب و تدوین میں نمایاں اختلاف یہ ہے کہ اس میں قطعات، قصائد اور مثنویات کو ابتداء میں جگہ دی گئی ہے اور غزلیات کو بعد میں ــ !

یہ مخطوطہ وفات غالب (۱۵ر فروری ۱۸۶۹ء) کے پانچ سال کے اندر ہی ۱۴ر جنوری ۱۸۷۴ء (مطابق ۲۴ر ذی قعدہ ۱۲۹۰ھ) کو ضبط تحریر میں آیا ہے۔ اور اس کے کاتب کوئی غیر معروف بزرگ سید برکت علی آرزو ہیں۔ جنھوں نے سنہ کتابت کا ایک قطعہ تاریخ بھی لکھا ہے۔

جو دیوان غالب میں سب لکھ چکا
تو پھر فکر تاریخ لاحق ہوا
نہ تھا آرزو دخل اس فن میں پر
"مجھے ہاتف غیب نے یہ کہا"

۱۲۹۰ھ

لو اعداد "زا" چھوڑ کر لکھ بھی دے   رقم خوب دیوان مرزا کیا

اس کے بعد خاتمہ کتاب کی عبارت ہے۔

"تمام شد دیوان میرزا نوشہ غالب بکرمہٖ و فضلہ بقلم ناقص رقم بندہ درگاہ رب ذوالجلے عاصی برکت علی آرزو خلف میر اکبر علی سید حسنی ساکن پنگوان ضلع گوڑگاؤں وارد حال "جے پور" تاریخ چوبیسویں ذیقعد ۱۲۹۰؁ہ ہجری روز چہار شنبہ مطابق چودھویں جنوری ۱۸۷۴؁ء۔ تمت بالخیر"

اس نسخہ کی ناپ ساڑھے دس × سوا سات انچ ہے اور صفحات کی تعداد ۱۴۶ ہے! لیکن تقریباً چالیس درمیانی صفحات غائب ہیں۔ کاغذ دبیز ہے اور شانِ خط کافی روشن اور جلی ہے۔ مسطر پندرہ سطری ہے۔ سرورق سادہ جدولوں سے مزین ہے اور اس پر لکھا ہوا ہے۔

فَمَنْ یَتَوَکَّلْ عَلَی اللّٰہِ فَھُوَ حَسْبُہٗ

دیوانِ غالب اُردو

بقلم عاصی سید برکت علی

صفحہ ۲-۳ دیباچہ فارسی مرزا غالب (جو نسخہ عرشی صفحہ ۱۲۰-۱۲۱ پر درج ہے)

صفحہ ۴۔ قطعہ ؎ اے شہنشاہ فلک منظر و بے مثل و نظیر
اے جہاندار کرم شیوہ و بے شبہہ و عدیل

کے صرف ۱۰ اشعر ہیں۔ صفحات ۶ لغایتہ ۸ غائب ہیں۔

صفحہ ۹ ۔ پر اس قطعہ کے ۔ (مندرجہ صفحہ ۱۲۵ - ۱۲۶ نسخہ عرشی)

اے شہنشاہ آسمان اورنگ
اے جہاندار آفتاب آثار

صرف ۱۷۔ شعر ہیں

اس کے بعد صفحہ ۱۰ پر دو اور قطعات وہی ہیں جو صفحہ ۱۲۸-۱۲۹ نسخہ عرشی میں موجود ہیں اور صفحات ۱۱ - ۱۲ غائب ہیں۔

صفحہ ۱۳ لغایتہ پر ایک مثنوی (مندرجہ ۱۳۰-۱۳۱ نسخہ عرشی) ہے اور اس کے بعد صفحات ۱۵۔ لغایتہ ۲۶ پر قصائد ہیں صفحہ ۲۷ سے لیکر صفحہ ۱۳۹ تک غزلیات اور صفحہ ۱۳۹

لغایتہ ۲۴۲ تک سولہ رباعیات! اور پھر نواب ضیاء الدین احمد خاں کا خاتمہ کتاب!
بلحاظ ترتیب اسے "نسخہ عرشی" کے (حصہ نوائے سروش) کے مطابق سمجھنا چاہئے فرق صرف اتنا ہے کہ اس مخطوطے میں کچھ قطعات وغیرہ کم ہیں اور نسخہ عرشی اس اعتبار سے مکمل ہے۔

یہ مخطوطہ طبع اوّل سے اس لئے مختلف ہے کہ اس میں دیباچے کے بعد ہی "غزلیات" کے بجائے قطعات۔ مثنوی اور قصائد ہیں پہلے ایڈیشن میں پہلے غزلیں پھر دوسری چیزیں تھیں یہی ترتیب دوسرے ایڈیشن کی بھی ہے۔ تیسرے ایڈیشن کی ترتیب اگرچہ ابتدائی دو ایڈیشنوں سے مختلف ہے لیکن اس مخطوطے سے بھی مطابقت نہیں رکھتی۔ اسی طرح طبع چہارم چونکہ تیسرے ایڈیشن کی ترتیب کے مطابق چھپا ہے اس لئے اس مخطوطے سے مختلف ہے۔

اس مخطوطے کی ترتیب تمام مطبوعہ نسخوں سے مختلف ہے البتہ "نسخہ رام پور جدید" (۱۲۷۱ھ مطابق ۱۸۵۵ء) کے مطابق ہے۔ جس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ شاید نسخہ رام پور (جدید) کی کوئی اور نقل کہیں موجود تھی جس کی بنیاد پر یہ دیوان نقل کیا گیا ہے حالانکہ اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا کہ نسخہ رام پور (جدید) کتب خانہ رام پور میں داخل ہونے کے بعد کبھی وہاں سے برآمد کر کے جے پور یا دہلی لایا گیا ہو اور چونکہ اس مخطوطے کا اختتام جے پور میں ہوا ہے اس لئے یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ اس کی نقل رام پور میں بیٹھکر کی گئی!

میرا قیاس یہ ہے کہ نسخہ رام پور (جدید) اور اس مخطوطے کے بیچ میں ایک درمیانی کڑی اور ہونا چاہئے جس پر اس مخطوطے کی بنیاد رکھی گئی ہے اور شاید ایسا کوئی نسخہ اس وقت "جے پور" میں موجود ہو یا سید برکت علی کے کسی عزیز کے پاس ہو جسے سامنے رکھ کر اس کی نقل کی گئی۔

ابھی تک اس مخطوطے کا تقابلی کام مکمل نہیں ہو سکا ہے اس لئے یہ کہنا دشوار ہے کہ اس مخطوطے سے "غالبیات" میں کس قسم کا اضافہ ہو سکتا ہے؟ پھر بھی یہ ایک حقیقت ہے کہ یہ ایک "قریب العہد" مخطوطہ ہے اور بلحاظ ترتیب و تدوین نسخہ رام پور (جدید) کا نقش ثانی ہے!

دیوان غالب مرتبہ حسرت موہانی

دیوان غالب اردو مع شرح دیوان غالب اب کمیاب سا ہو چلا ہے اس کا جو مطبوعہ ایڈیشن جناب مولوی سید نجم الحسن خیرآبادی کے کتب خانے میں موجود ہے وہ انوار المطابع وکٹوریہ اسٹریٹ لکھنؤ کا چھپا ہوا ہے سرورق پر کسی نے قلم سے مندرجہ ذیل عبارتوں کا اضافہ کیا ہے۔

"بیگم حسرت موہانی نے کان پور سے شائع کیا"

طبع پنجم ۱۹۲۲ء ایکہزار جلد

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ دیوان جب چھپ کر پریس سے آیا تو مولانا حسرت موہانی گرفتار کر لئے گئے۔ اور اس کی اشاعت بیگم حسرت موہانی کے ہاتھوں ۱۹۲۲ء میں ہوئی جہاں تک میں سمجھتا ہوں "دیوان معہ شرح" کا طرز تدوین مولانا حسرت موہانی کی جدت طبع کا رہین منت ہے اس سے پہلے کلام غالب کی جو شرحیں شائع ہوئیں ان کا نام "شرح دیوان غالب" ہی رکھا گیا دیوان کا اضافہ سب سے پہلے مولانا حسرت کی شرح میں نظر آتا ہے اور اس کے بعد انھیں کی تقلید میں دوسروں نے بھی اسی قسم کے اضافے کئے!

(۱) مولانا حسرت موہانی کے قبضے میں غالب کے اردو فارسی کلام کا ایک قلمی انتخاب بھی تھا جس کا نام "گل رعنا" ہے۔

مولانا عرشی رام پوری تحریر فرماتے ہیں۔

"قیام کلکتہ میں مولوی سراج الدین احمد سے میرزا صاحب کی دوستی ہوگی اور انھوں نے فرمائش کر کے اردو اور فارسی غزلوں کا ایک انتخاب مرتب کرایا جو گل رعنا کے نام سے موسوم ہوا۔ اس کے حصہ فارسی میں تو صرف منتخب غزلیں درج کیگئی تھیں لیکن ریختہ میں سے دو چار مکمل غزلیں لیکر باقی میں سے اچھے اچھے شعر چن لئے تھے۔ اس کا ایک

ناقص نسخہ مولانا حسرت موہانی مرحوم کو ملا تھا جس سے کچھ غیر مشہور شعر انھوں نے اپنی شرح کے آخر میں چھاپ بھی دیئے تھے لیکن سوٗ اتفاق سے وہ بھی اہل ذوق کی دسترس سے باہر ہو گیا تھا۔ خوش قسمتی کہ اب سے تقریباً دو سال قبل محبی مالک رام صاحب کو ان کے ایک دوست نے اس کا مکمّل نسخہ تحفے میں دے دیا جس سے معلوم ہوا کہ اردو منتخب اشعار کی تعداد ۴۵۴ ہے اور ان میں "نسخہ شیرانی" کی اکثر بے مزہ غزلوں کا کوئی ایک شعر بھی موجود نہیں ہے۔

"گلِ رعنا" کے اس نسخے میں سال انتخاب ناقص رہ گیا ہے تاہم یہ یقینی ہے کہ وہ قیام کلکتہ کا کارنامہ ہے جو ۴ر شعبان ۱۲۴۳ھ (۱۹ر فروری ۱۸۲۸ء) سے شروع ہو کر ربیع الاوّل ۱۲۴۵ھ (ستمبر ۱۸۲۹ء) میں ختم ہوا تھا۔" (صفحہ ۲۰ و ۲۱۔ نسخہ عرشی)

مولانا حسرت موہانی نے اپنی شرح کے خاتمے پر جو چند سطریں تحریر فرمائی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ مولوی "سراج الدین" کا پورا نام سراج الدین علی خاں تھا موٗجد تخلص کرتے تھے اور قصبۂ موہان (ضلع اناوٗ) کے رہنے والے تھے کلکتہ میں وہ بسلسلہ ملازمت مقیم تھے اور وہاں کے "قاضی القضاۃ" کے عہدے پر فائز رہ چکے تھے۔ مولانا حسرت موہانی نے لکھا ہے۔

"قاضی القضاۃ کلکتہ مولوی سراج الدین علی خاں موٗجد موہانی کی فرمائش سے مرزا نے اپنے اردو و فارسی کا خود انتخاب کر کے اس کا نام "گل رعنا" رکھا تھا۔ راقم کے پاس اس کا ایک نسخہ موجود ہے چنانچہ یہ "اشعار ضمیمہ" اسی سے نقل کئے گئے ہیں۔ حسرت

(صفحہ ۱۷۶۔ شرح دیوان غالب حسرت)

عبارت محولہ بالا کے سلسلے میں "ضمیمہ" کے زیر عنوان مندرجہ ذیل اشعار شامل شرح کئے گئے ہیں اور اس سلسلے میں یہ نوٹ بھی لکھا گیا ہے۔

"اس ضمیمہ میں وہ غزلیں اور اشعار ہیں جو راقم حروف کو مختلف ذرائع

سے حاصل ہوئے ہیں اور جو مطبوعہ دیوان غالب میں موجود نہیں ہیں۔
(صفحہ ۱۷۵۔ شرح دیوان غالب حسرت)

مولانا حسرت موہانی کے ان دونوں بیانات میں ایک ہلکا سا تضاد ہے۔ پہلے نوٹ (۱۷۵ص) میں ان اشعار کا مختلف ذرائع سے حاصل ہونا ظاہر کیا ہے اور خاتمہ کی عبارت (صفحہ ۱۷۶) میں ان کا ماخذ "گل رعنا" کو قرار دیا ہے ۔! بہرحال ضمیمہ شرح دیوان غالب (حسرت موہانی) کے صفحات ۱۷۵، ۱۷۶ سے نقل کیا جارہا ہے

ضمیمہ

سات شعر کی یہ غزل وہی ہے جو نسخہ عرشی صفحہ ۳۱۲ میں اس حاشئے کے ساتھ "شرح حسرت" ہی کے حوالے سے نقل کی گئی ہے حاشیے میں تحریر ہے۔

"یہ غزل مرزا صاحب نے اپنے دوسرے سفر رام پور میں ۲۸ دسمبر ۱۸۶۵ء کو یہاں سے رخصت ہونے سے پہلے کہی تھی۔ اس زمانے میں نواب کلب علی خاں بہادر رام پور کے نواب تھے۔ اس لئے مولانا نظامی کا اپنی شرح ۲۵۳ میں نواب سے یوسف علی مراد لینا درست نہیں۔"
(صفحہ ۳۹۵۔ نسخہ عرشی)

اس غزل کا مطلع ہے۔

لطفِ نظارۂ قاتل دمِ بسمل آئے
جان جائے تو بلا سے یہ کہیں دل آئے

اور مقطع ۔۔۔!

اب ہے دلیؔ کی طرف کوچ ہمارا غالب
آج ہم حضرتِ نواب سے بھی مِل آئے

نسخہ عرشی میں اس غزل کے ۹ شعر اردوئے معلیٰ کے حوالے سے دیئے گئے ہیں ان میں سے صرف چار شعر "حسرت" کے یہاں ملتے ہیں۔

میں ہوں مشتاق جفا مجھ پہ جفا اور سہی
تم ہو بیداد سے خوش۔ اس سے سوا اور سہی

تم ہو بت پھر تمھیں پندارِ خدائی کیوں ہے
تم خداوند ہی کہلاؤ۔ خدا اور سہی

خلد[1] میں کہیے تو دوزخ بھی ملالیں یارب
سیر کے واسطے تھوڑی سی فضا اور سہی

ہم[2] سے غالبؔ یہ علائی نے غزل لکھوائی
ایک بیدادگرِ رنج فزا اور سہی

جاتا ہوں جدھر اٹھتی ہے سب کی ادھر انگشت
یکدست جہاں مجھسے پھرا ہے مگر انگشت

کس قدر خاک ہوا ہے دلِ مجنوں یارب
نقشِ ہر ذرہ سویدائے بیاباں نکلا

بردہن شرم ہے باوصفِ شوخی اہتمام اس کا
نگیں میں جوں شرارِ سنگ ناپیدہ ہے نام اس کا
مسی آلودہ ہے مہرِ نوازش نامہ ظاہر ہے
کہ داغِ آرزوئے بوسہ دیتا ہے پیام اس کا
بامیدِ نگاہِ خاص ہوں محمل کشِ حسرت
مبادا ہوں عناں گیرِ تغافل لطفِ عام اس کا

شب کہ ذوقِ گفتگو سے تیرے دل بیتاب تھا
شوخیٔ وحشت سے افسانہ فسونِ خواب تھا
واں ہجومِ نغمہ ہائے سازِ عشرت تھا اسدؔ
ناخنِ غم یاں سرِ تارِ نفس مضراب تھا

---

[1] نسخۂ عرشی میں یہ مصرعہ اس طرح پر درج ہے — "کیوں نہ فردوس میں دوزخ کو ملالیں یارب"
[2] مقطع میں "ہم سے" کے بجائے نسخۂ عرشی صفحہ ۳۱۱ پر "مجھ سے" تحریر ہے۔

درد کو آج اس کے ماتم میں سیہ پوشی ہوئی
وہ دلِ سوزاں کہ کل تک شمعِ ماتم خانہ تھا
شکوۂ یاراں غبارِ دل میں پنہاں کر دیا
غالب ایسے گنج کو شایاں یہی ویرانہ تھا

پھر وہ سوئے چمن آتا ہے خدا خیر کرے
رنگ اڑتا ہے گلستاں کے ہواداروں کا

.... ہوئی افراطِ انتظار
چشم کشودہ حلقۂ بیرونِ در ہے آج

میرؔ کے شعر کا احوال کہوں کیا غالبؔ
جس کا دیوان کم از گلشنِ کشمیر نہیں

میکشی کو نہ سمجھ بے حاصل
بادہ غالبؔ عرقِ بید نہیں

ہے نزاکت بسکہ فصلِ گل میں معمارِ چمن
قالبِ گل میں ڈھلی ہے خشتِ دیوارِ چمن

ظاہر ہیں میری شکل سے افسوس کے نشاں
خارِ الم سے پشت بدنداں گزیدہ ہوں
ہوں گرمیٔ نشاطِ تصوّر سے نغمہ سنج
میں عندلیبِ گلشنِ نا آفریدہ ہوں

ابر روتا ہے کہ بزمِ طرب آمادہ کرو
برق ہنستی ہے کہ فرصت کوئی دم ہے ہم کو

ہندوستان سایۂ گلہائے تخت تھا
جاہ و جلال عہدِ وصال بتاں نہ پوچھ

ہر داغ تازہ یک دل داغ انتظار ہے
عرض فضائے سینۂ دردِ امتحاں نہ پوچھ
کہتا تھا کل وہ محرم راز اپنے سے کہ آہ
دردِ جدائیٔ اسد اللہ خاں نہ پوچھ

ہجوم ریزش خوں کے سبب رنگ اڑ نہیں سکتا
حنائے پنجہ صیّاد مرغ رشتہ برپا ہے

غالب زبسکہ سوکھ گئے چشم میں سرشک
آنسو کی بوند گوہر نایاب ہو گئی!

بہائے یاں تک اشکوں میں غبار کلفت خاطر
کہ چشم تر میں ہر اک پارۂ دل پائے در گل ہے

کمال حسن اگر موقوف انداز تغافل ہو
تکلف برطرف بجھ سے تری تصویر بہتر ہے

حیراں ہوں شوخیٔ رگ یاقوت دیکھ کر
یاں ہے کہ صحبت خس و آتش برابر ہے

ایول ایڈیشن

مولانا نظامی بدایونی کی ترتیب و تحشیہ کے ساتھ اب تک جتنے ایڈیشن شائع ہوئے ہیں ان کی تفصیل درج ذیل ہے۔

پہلا ایڈیشن	۱۹۱۵ء	دوسرا ایڈیشن	۱۹۱۸ء
تیسرا ایڈیشن	۱۹۲۲ء	چوتھا ایڈیشن	۱۹۲۳ء

پانچواں ایڈیشن ۱۹۲۷ء

یہ تمام ایڈیشن وقتاً فوقتاً میرے زیر مطالعہ رہ چکے ہیں اور ان کے متعلق ضروری یادداشتیں میرے پاس محفوظ ہیں لیکن اس وقت میرے سامنے صرف تیسرا ایڈیشن ہے۔ پیش نظر ایڈیشن ۱۹۲۲ء میں نظامی بدایونی کے دیباچہ غالب کے خود نوشت حالات اور فرہنگ کے اضافے کے ساتھ "دیوان غالب اردو" کے نام سے نظامی پریس بدایوں سے شائع ہوا تھا۔ ابتداء میں غالب کی تصویر اور نظامی مرحوم کا ایک مختصر سا دیباچہ ہے جس میں انھوں نے "اردو دیوان غالب" کے عنوان سے لکھا ہے۔

"نظامی پریس بدایوں نے دیوان غالب کو سب سے پہلی مرتبہ جناب سیّد راس مسعود صاحب بی اے آکسن کی تحریک و اصرار سے ۱۹۱۵ء میں خاص اہتمام کے ساتھ چھاپا تھا۔ یہ پہلا نسخہ بالکل معرا شائع ہوا تھا اسکے بعد ۱۹۱۸ء میں سیّد صاحب موصوف کی ترقی ادب اردو کی اسکیم کے تحت اس کو دوسری مرتبہ شرح کے ساتھ شائع کرنے کی نوبت آئی۔ ۱۹۲۰ء اور ۱۹۲۲ء میں چھوٹی تقطیع پر وہی شرح نسخہ دو مرتبہ پھر شائع ہوا ۱۹۲۱ء میں سیّد صاحب کی مذکورہ بالا اسکیم کے سلسلے میں "نظامی پریس" سے اعلیٰ حضرت قدر قدرت ہز اگزالٹیڈ ہائی نس سر میر عثمان علی خاں بہادر بالقابہ تاجدار دکن خلد اللہ ملکہٗ کے گرانقدر عطیہ سے "مراثی انیس"

کی پہلی جلد نہایت آب وتاب سے اشاعت پذیر ہوئی جو سلسلہ آصفیہ کی پہلی کڑی تھی۔ دوسرا نمبر خواجہ میر درد کا تھا جن کا دیوان حال ہی میں مراثی انیس کی تقطیع اور اسی شان کے ساتھ شائع کیا گیا ہے۔ اسی یکسانیت کو ملحوظ رکھ کر تیسرے نمبر پر "دیوان غالب" کا یہ ایڈیشن شائع ہوا ہے یہ نسخہ بالکل معرا ہے صرف اہل مطالعہ اور طالبان علم کی آسانی کے خیال سے آخر میں ایک فرہنگ دیدی گئی ہے جس میں مشکل الفاظ کے معنی اور خاص "غالبی محاورات" کا حل کیا گیا ہے ....!"

اس دیباچے کی عنوان پر "سلسلہ آصفیہ ۳" درج ہے مگر سرورق پر "سلسلہ آصفیہ نمبر ۱" چھپا ہے یہ ایڈیشن محب محترم جناب خان بہادر سید مسعود حسن مسعود (ریٹائرڈ) ڈپٹی کلکٹر لکھیم پور کھیری کے کتب خانے میں محفوظ ہے۔

مولانا نظامی بدایونی کے کتب خانے میں اردو دیوان غالب کا ایک مخطوطہ بھی محفوظ تھا جو اب نیشنل میوزیم کراچی پہنچ چکا ہے۔! اس مخطوطے کا تذکرہ مولانا عرشی نے نسخہ عرشی میں کئی جگہ کیا ہے۔

"میرزا صاحب ۴۔ شعبان ۱۲۴۳ھ (۱۹ فروری ۱۸۲۸ء) کو کلکتے پہنچے اور ۶ جمادی الثانیہ ۱۲۴۵ھ (۲۸ نومبر ۱۸۲۹ء) کو دہلی واپس آئے تھے اس حساب سے دیباچے کو مذکورہ بالا تاریخوں سے پہلے اور کار انتخاب کو اس سے بھی قبل انجام کو پہنچ جانا چاہیئے۔ لیکن مولانا نظامی بدایونی مرحوم کو دیوان غالب کا ایک ایسا مخطوطہ ملا تھا جس میں دیباچے کی تاریخ ۲۴ ذی قعدہ ۱۲۴۸ھ درج تھی۔ (صفحہ ۲۴ نسخہ عرشی)

معلوم ایسا ہوتا ہے کہ پیش نظر نظامی ایڈیشن کی ترتیب و اشاعت کے وقت متذکرہ بالا مخطوطہ نظامی مرحوم کو دستیاب نہیں ہوا تھا کیونکہ اس ایڈیشن میں انھوں نے اس مخطوطے کا ذکر کہیں اشارتاً و کنایتاً بھی نہیں کیا ہے۔

اسی ایڈیشن کے صفحات ۱۳۴ لغایتہ ۱۴۰ پر "غیر معروف" اشعار اس عنوان کے تحت درج کیے گئے ہیں۔

"وہ اشعار اور قطعات جو دیوان مروّجہ میں نہیں ہیں۔"

یہ اشعار مولانا نظامی کو کہاں سے دستیاب ہوئے؟ اس کی کوئی تفصیل ان اوراق میں نہیں ملتی اور نہ ان کے اصل مآخذ کی نشاندہی کی گئی ہے لیکن اسی کے ساتھ ساتھ ان اشعار کو "غیر مطبوعہ" بھی نہیں کہا گیا بلکہ صرف "غیر مروّجہ" ظاہر کیا گیا ہے

یہ تمام اشعار ذیل میں اسی ایڈیشن سے نقل کئے جا رہے ہیں صرف قصیدہ اور چند قطعات وغیرہ کو طوالت کے خیال سے قلم انداز کر دیا گیا ہے کیونکہ یہ اب مروّجہ دیوانوں میں شامل ہو چکے ہیں اور نسخۂ عرشی وغیرہ میں تمام و کمال موجود ہیں۔!

(۱)

۳۶۔ شعر کا یہ وہی قصیدہ ہے جسے نسخۂ عرشی میں صفحہ ۲۸۰ پر رسالہ کمال دہلی بابتہ جنوری ۱۹۱۰ء سے نقل کرتے ہوئے حاشیے پر لکھا ہے۔

یہ قصیدہ مرزا سعید الدین احمد خاں بہادر طالب دہلوی جاگیردار ریاست لوہارو کے ذریعہ سے رسالہ کمال دہلی کی اشاعت جنوری ۱۹۱۰ء میں شائع ہوا اور اسے نقل کر کے مولانا نظامی بدایونی نے اپنے مرتبہ دیوان غالب کے آخر میں "غیر مطبوعہ" کلام کے تحت درج کیا۔ ساتھ ہی یہ بھی لکھا کہ یہ قصیدہ نواب کلب علی خاں بہادر والئ رام پور کے غسل صحت کی مبارک تقریب میں لکھا گیا تھا لیکن واقعہ یہ ہے کہ مرزا صاحب نے اسے ۲۵ دسمبر ۱۸۶۴ء اور ۸ جنوری ۱۸۶۵ء کی کسی درمیانی تاریخ میں نواب یوسف علیخاں بہادر کے غسل صحت کی مبارک تقریب پر پیش کیا تھا۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "مکاتیب غالب" ۱۴۴۔ طبع اوّل"۔ (صفحہ ۳۷۹-۳۸۰ نسخۂ عرشی)

اس قصیدہ کا مطلع ہے۔

مرحبا۔ سال فرخی آئین
عید شوال و ماہ فروردیں

کل اشعار طوالت کے خیال سے نقل نہیں کئے گئے۔ "دیوان غالب"

نظامی ایڈیشن ۱۹۲۳ء میرے پیش نظر ہے اس میں کوئی ایسا نوٹ موجود نہیں ہے جس سے یہ معلوم ہو کہ یہ قطعہ نواب کلب علی خاں والیٔ رام پور کے غسل صحت کے سلسلے میں لکھا گیا تھا ممکن ہے بعد کے ایڈیشنوں میں اس قسم کا کوئی نوٹ اضافہ کیا گیا ہو۔

(۲)

ایک اہل درد نے سنسان جو دیکھا قفس
یوں کہا۔ آتی نہیں کیوں اب صدائے عندلیب
بال و پر دو چار دکھلا کر کہا صیاد نے
یہ نشانی رہ گئی ہے اب بجائے عندلیب

مولانا عرشی نے اس قطعہ کو "نسخۂ عرشی" صفحہ ۲۶۱۔۲۶۲ میں نقل کرتے ہوئے لکھا ہے۔

"نواب صاحب لوہارو کے کتاب خانے میں "دبستان مذاہب" کا ایک مخطوطہ ہے اس کے آخری صفحے پر میرزا صاحب کے نام سے یہ قطعہ لکھا ہوا ملتا ہے اور پہلی بار اس دیوان (نسخۂ عرشی) میں شائع ہو رہا ہے۔"
(صفحہ ۲۸۲ نسخۂ عرشی)

(۳)

یہ وہی قطعہ ہے جو ماہنامہ مخزن لاہور اپریل ۱۹۰۷ء میں "طائر دل" کے عنوان سے چھپا تھا اور پھر "مخزن" ہی سے ہفت روزہ "فتنہ وعطر فتنہ" گورکھپور (یکم مئی) ۱۹۰۷ء میں نقل ہوا تھا اس کا تذکرہ کچھ زیادہ تفصیل کے ساتھ انھیں اوراق میں کیا جا چکا ہے۔

(۴)

اس قطعہ کو بھی "نسخۂ عرشی"، صفحہ ۲۶۲۔۲۶۳ پر "سراپا سخن" کے حوالے سے نقل کیا گیا ہے اور مولانا عرشی نے حاشیے میں لکھا ہے۔

"یہ قطعہ تاریخ میر محسن علی محسن لکھنوی متوفی قبل ۱۲۸۸ھ (۱۸۷۱ء) کے تذکرہ "سراپا سخن" کے انطباع کا ہے اور اس کتاب کے صفحہ ۲۹۳

پر اس عنوان کے ساتھ چھپا ہے۔

"قطعہ تاریخ مرزا اسداللہ خاں صاحب غالب دہلوی"

(صفحہ ۲۷۲ - نسخۂ عرشی)

(۵)

"سخن تکیہ" والی وہی مشہور غزل ہے جس کا مطلع ہے۔

شب وصال میں مونس گیا ہے بن تکیہ
ہوا ہے موجب آرام جان و تن تکیہ

اور مقطع ——!

ہم اور تم فلک پیر جس کو کہتے ہیں
فقیر غالبِ مسکیں کا ہے کہن تکیہ

اس غزل میں ۱۴۔ شعر ہیں جنھیں مولانا عرشی نے نسخۂ عرشی کے صفحہ ۳۰۳ پر اور جناب مالک رام نے "دیوان غالب" صفحہ ۲۸۷ و ۲۸۸ پر "الہلال" کلکتہ ۲۳ جولائی ۱۹۱۴ء کے حوالے سے نقل کیا ہے۔

یہ غزل چونکہ کافی مشہور غزل ہے اور اب دیوان غالب کے تقریباً سب ایڈیشنوں میں شامل ہو چکی ہے اس لئے اس کے کل اشعار نقل نہیں کئے گئے ہیں۔

چودہ شعر کی یہ غزل سب سے پہلے "الہلال" نہیں بلکہ مولانا محمد علی جوہر مرحوم کے روزنامہ ہمدرد دہلی ۴ جون ۱۹۱۳ء میں سرورق پر شائع ہوئی تھی اور اسی کے ساتھ "کلام غالب" کے عنوان سے یہ نوٹ بھی چھپا تھا۔ "الہلال" نے غالباً "ہمدرد" ہی سے (بلا حوالے کے) نقل کیا ہوگا۔

"نواب سعید احمد خاں صاحب عرف نواب احمد سعید خاں صاحب کی بدولت آج ہم "مرزا غالب" کی ایک غزل ہمدرد" کے پہلے صفحہ پر شائع کر رہے ہیں جو اب تک کہیں شائع نہیں ہوئی تھی۔ غالب مغفور نواب احمد سعید خاں صاحب کے پھوپھا تھے اور اگر ان کی زندگی کے بچے کھچے

موتی کہیں مل سکتے ہیں۔ نواب صاحب موصوف ہی کے کتبخانے سے حاصل ہو سکتے ہیں۔ ہم سے نواب صاحب نے وعدہ فرمایا ہے کہ وہ غالب کی زندگی کے متعلق بہت سی معلومات وقتاً فوقتاً "ہمدرد" کے لئے عطا فرمایا کریں گے اور ہمیں امید ہے کہ ہمارے ناظرین کو کچھ زیادہ عرصہ تک ستمکش انتظار نہ رہنا پڑے گا۔

یہ غزل جو آج ہم شائع کر رہے ہیں ایک واقعہ سے متعلق ہے جس کا درج کرنا ناظرین کی دلچسپی کا باعث ہوگا۔

نواب یوسف علی خاں صاحب عزیز لکھنوی، دہلی حکیم محمود خاں صاحب کا علاج کرنے کی غرض سے تشریف لائے ہوئے تھے اور مرزا صاحب (غالب) کی خدمت میں بھی حاضر ہوئے۔ دوران گفتگو میں کئی دفعہ ان کی زبان سے لفظ "سخن تکیہ" ادا ہوا۔ غالب مغفور نے دریافت کیا کہ حضرت یہ آپ نے کیا فرمایا؟ انھوں نے کہا کہ لکھنؤ میں "تکیہ کلام" کے بجائے "سخن تکیہ" بولا جاتا ہے۔ "شاہ سخن" کے سخن آشنا کانوں کو یہ ترکیب کچھ ایسی بھلی معلوم ہوئی کہ اسی ردیف و قافیہ میں ایک غزل لکھ ڈالی یہ وہی غزل ہے جو آج "ہمدرد" اپنے ناظرین کی خدمت میں پیش کرتا ہے۔"

(صفحہ ۵۔ کالم ۵۔ روزنامہ ہمدرد دہلی۔ ۱۴ر جون ۱۹۱۳ء)

(۶)

جس دن سے کہ ہم خستہ گرفتار بلا ہیں
کپڑوں میں جوئیں بخیوں کے ٹانکوں سے سوا ہیں

(۷)

"۹۔ شعر کی یہ وہی مشہور غزل ہے جسے نسخہ عرشی میں صفحہ ۳۱۱ پر دیوان غالب (نسخہ مالک رام) میں صفحہ ۲۸۸ و ۲۸۹ پر اردوئے معلیٰ کے حوالے سے نقل کیا گیا ہے مطلع ہے ؂

میں ہوں مشتاق جفا۔ مجھ پہ جفا اور سہی
تم ہو بیداد سے خوش۔ اس سے سوا اور سہی

اور مقطع ــــــ!

مجھ سے غالب یہ علائی نے غزل لکھوائی
ایک بیداد گر رنج فزا اور سہی

(۸)

نسخہ عرشی صفحہ ۲۶۰ (قطعات) میں لئے "اردوئے معلی" کے حوالے سے نقل کیا گیا ہے اور دیوان غالب (مالک رام) صفحہ ۳۱۶ و ۳۱۷ پر اسے "خط منظوم بنام علائی" کے تحت جگہ دی گئی ہے لیکن حوالہ اس میں بھی "اردوئے معلی" (ص ۳۰۳) کا ہے اور اسی کے ساتھ خطوط غالب (۱) ص ۳۲۰ کا بھی"

کل شعر بخوف طوالت نقل نہیں کئے گئے۔ پہلا شعر یہ ہے۔

بسکہ فعال ما یرید ہے آج ہر سلحشور انگلستان کا

(۹)

بہ رہن شرم ہے با وصف شوخی اہتمام اس کا
نگیں میں جوں شرار سنگ ناپیدا ہے نام اس کا
مِسی آلودہ ہے مہر نوازش نامہ ظاہر ہے
کہ داغ آرزوئے بوسہ دیتا ہے پیام اس کا
بہ امید نگاہ خاص ہوں محمل کش حسرت
مبادا ہو عناں گیر تغافل لطف عام اس کا

(۱۰)

شب کو ذوق گفتگو سے تیرے دل بیتاب تھا
شوخیٔ وحشت سے افسانہ۔ فسونِ خواب تھا
واں ہجوم نغمہ ہائے ساز عشرت تھا اسد
ناخنِ غم یاں سرِ تارِ نفس مضراب تھا

(۱۱)

دود کو آج اس کے ماتم میں سیہ پوشی ہوئی
وہ دل سوزاں کہ کل تک شمع ماتم خانہ تھا

شکوہ یارانِ غبار دل میں پنہاں کر دیا
غالبؔ ایسے گنج کو شایاں یہی ویرانہ تھا

(۱۲)

پھر وہ سوئے چمن آتا ہے خدا خیر کرے
رنگ اڑتا ہے گلستاں کے ہواداروں کا

(۱۳)

معزولیٔ تپش ہوئی۔ افراطِ انتظار
چشم کشودہ حلقۂ بیرونِ در ہے آج

(۱۴)

میرؔ کے شعر کا احوال کہوں کیا غالبؔ
جس کا دیوان کم از گلشنِ کشمیر نہیں

(۱۵)

مے کشی کو نہ سمجھ بے حاصل
بادہ غالبؔ عرقِ بید نہیں

(۱۶)

ہے نزاکت بس کہ فصلِ گل میں معمارِ چمن
قالبِ گل میں ڈھلی ہے خشتِ دیوارِ چمن

(۱۷)

ظاہر میں میری شکل سے افسوس کے نشاں
خارِ الم سے پشت بہ دندہ گزیدہ ہوں
ہوں گرمیٔ نشاطِ تصوّر سے نغمہ سنج
میں عندلیبِ گلشنِ ناآفریدہ ہوں

(۱۸)

ابر روتا ہے کہ بزمِ طرب آمادہ کرو
برق ہنستی ہے کہ فرصت کوئی دم ہے ہمکو

(۱۹)

ہندوستان سایۂ گل پائے تخت تھا
جاہ و جلالِ عہدِ وصالِ بتاں نہ پوچھ

ہر داغ تازہ یک دل داغ انتظار ہے
عرض فضائے سینہ درد امتحاں نہ پوچھ
کہتا تھا کل وہ محرم راز اپنے سے کہ ہاں
درد جدائی "اسد اللہ خاں" نہ پوچھ

(۲۰)

دیدہ خونبار ہے مدت سے ولے آج ندیم
دل کے ٹکڑے بھی کئی خون کے شامل آئے
اب ہے دلی کی طرف کوچ ہمارا غالبؔ
آج ہم حضرتِ نوابؔ سے بھی مل آئے

(۲۱)

ہجوم ریزش خوں کے سبب رنگ اڑ نہیں سکتا
حنائے پنجہ صیاد۔ مرغ رشتہ برپا ہے

(۲۲)

غالب زبسکہ سوکھ گئے چشم میں سرشک
آنسو کی بوند گوہر نایاب ہو گئی

(۲۳)

بہا ہے یاں تک اشکوں میں غبار کلفت خاطر
کہ چشم تر میں ہر اک پارۂ دل پائے در گل ہے

(۲۴)

کمال حسن۔ اگر موقوف۔ انداز تغافل ہو
تکلف برطرف، تجھ سے تری تصویر بہتر ہے

(۲۵)

حیراں ہوں شوخئ رگ یاقوت دیکھ کر
یاں ہے کہ صحبت خس و آتش برابر ہے

(۲۶)

چند تصویر بتاں چند حسینوں کے خطوط
بعد مرنے کے مرے گھر سے یہ ساماں نکلا

دیوان غالب تاج ایڈیشن

دیوان غالب کا یہ (عکسی رنگین) ایڈیشن ۱۹۳۸ء میں تاج کمپنی لمیٹڈ ریلوے روڈ لاہور نے خاص اہتمام سے شائع کیا تھا۔ جس کا انتساب بھی غالب ہی کے نام کیا گیا ہے یہ دیوان "آفسٹ بلاک" کے ذریعہ ۳۱۲ صفحات پر چھاپا گیا ہے اور غالباً نسخہ جرمنی و طاہر ایڈیشن کے بعد اس کا نمبر تیسرا ہے جو اس اہتمام سے شائع کیا گیا ہے۔ ابتداء میں "تعارف" کے زیر عنوان جو عبارت شائع کی گئی ہے اس پر یکم جولائی ۱۹۳۸ء کی تاریخ پڑی ہے۔ اور اس تعارف میں اس ایڈیشن کی طباعتی خصوصیات کا خاص طور پر ذکر کیا گیا ہے۔

اس ایڈیشن کے صفحات ۲۹۷ لغایتہ ۳۱۲ پر "نظامی ایڈیشن" سے وہ تمام کلام من و عن نقل کر دیا گیا ہے جسے تاج ایڈیشن کی اشاعت سے سولہ سال قبل "غیر مروجہ" قرار دیا گیا تھا۔ تاج ایڈیشن میں "نظامی" کا عنوان بھی بجنسہٖ نقل کیا گیا ہے صرف لفظ "دیوان" کے بجائے "دواوین" بدل دیا گیا ہے۔!

یہ تمام اشعار چونکہ "نظامی ایڈیشن" کے سلسلے میں نقل کئے جا چکے ہیں۔ اس لئے اب ان کے مزید نقل کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

طاہر ایڈیشن

دیوان غالب کے وہ ایڈیشن جو کسی قلمی نسخے کی بنیاد پر ترتیب دیئے گئے "طاہر ایڈیشن" بھی انھیں میں سے ایک ہے دیوان غالب کا یہ خوبصورت ایڈیشن شمس العلمائ محمد حسین آزاد کے پوتے آغا طاہر مرحوم نے اپنے ایک خاندانی نسخہ سے ترتیب دے کر ۱۹۳۶ء میں ۱۰۷ صفحات کی ضخامت پر شائع کیا تھا۔ پورا دیوان بلاک میں چھپا ہے اور بلحاظ کتابت و طباعت نہایت ہی دیدہ زیب ہے دیوان کے شروع میں "مرزا نوشہ" کے عنوان سے خود آغا طاہر کا لکھا ہوا ایک "آغازیہ" بھی شامل ہے جس میں غالب کے مختصر حالات کے علاوہ اس ایڈیشن کی اس خصوصیت کا بھی ذکر کیا گیا ہے جو اس کی اشاعت کی محرک ہوئی۔ آغا صاحب تحریر فرماتے ہیں:

"مدت سے آرزو تھی کہ غالب کا اردو دیوان شائع کروں مگر ایسا کہ سند ہو اور سب قسم کے عیوب سے پاک ہو خوش قسمتی دیکھیے کہ اپنے ہی گھر میں ایک مستند قلمی نسخہ نکل آیا یعنی میرے پرنانا جناب حسین مرزا صاحب اعلی اللہ مقامہ نواب ناظر قلعہ معلیٰ ذی علم۔ صاحب سخن۔ مرزا کے دوست بلکہ عاشق زار تھے وہ انتخاب (دیوان غالب) میں بھی شامل تھے۔ انھوں نے منتخب کلام کا ایک صحیح نسخہ اپنے قلم سے لکھ کر مرزا کو دیا مرزا نے پڑھ کر دستخط اور مہر سے مزین کر کے بطور یادگار واپس کر دیا۔ جواب بھی میری ننھیال میں مرزا کے محبت بھرے تعلق کو زندہ کرتا ہے۔ میں نے یہ دیوان اسی نسخہ سے درست کیا ہے کیونکہ مروجہ دیوانوں میں بار بار چھپتے چھپتے بہت کچھ تبدیلیاں ہوگئی ہیں اکثر اشعار چھوٹ گئے ہیں مگر یہ بہت مکمل اور مستند نسخہ ہے۔"

اپنے دعوے کے ثبوت میں آغا صاحب مرحوم نے اصل نسخہ کے خاتمہ کتاب کی اس عبارت کا عکسی فوٹو بھی دے دیا ہے جس پر غالب کی مہر تصدیق اور دستخط ثبت ہیں

"این کتاب مستطاب بتاریخ ششم جمادی الثانی ۱۲۷۷ہجری مطابق بستم دسمبر ۱۸۶۰ء روز پنجشنبہ در دہلی شاہ جہاں آباد از دست سید ذوالفقار الدین حیدر الموسوی المعروف حسین مرزا عفی عنہ ابن نواب مبارز الدولہ ممتاز الملک میرزا حسام الدین حیدر خاں بہادر حسام جنگ مرحوم مغفور باتمام رسید۔

ہر کہ خواند دعا طمع دارم | زانکہ من بندہ گنہگارم

یجون الخط فی القرطاس دہرا | وکاتبہ رمیم فی التراب

تم تم تم

تکلمتہ حضرت غالب | نگارندہ را آفریں و نگرندگان را نوید

مہر غالب: بندہ علی ابن ابی طالب۔ اسداللہ خاں غالب ۱۲

اسی طاہر ایڈیشن میں ۲۸ اشعار کا ایک قصیدہ۔

کرتا ہے چرخ روز بصد گونہ احترام
فرمانروائے کشور پنجاب کو سلام

اور ۷ شعر کی ایک غزل جس کا مطلع۔

آپ نے "مستی الضر" کہا ہے تو سہی
یہ بھی اے حضرت ایوبؑ گلا ہے تو سہی

جسے دیکھ کر محب محترم جناب مالک رام کو شبہ گذرا ۔۔۔ چنانچہ لکھا انھوں نے !

"دیوان کا طاہر ایڈیشن" بظاہر اس قلمی نسخے سے شائع ہوا ہے۔ جو ناظر حسین میرزا کے پاس تھا اور جس کا ذکر منشی مہیش پرشاد مرحوم نے اپنے ایک مضمون میں کیا ہے (زمانہ کان پور جنوری ۱۹۳۰ء) ناظر حسین مرزا اور محمد حسین آزاد کے خاندانوں میں نسبتی تعلق ہے یعنی حسین مرزا کی نواسی مولانا آزاد مرحوم کے صاحبزادے محمد ابراہیم کے عقد نکاح میں تھیں۔ آغا محمد طاہر انھیں کے بیٹے تھے اس طرح یہ نسخہ اس خاندان میں پہنچا۔ میں نے جب "طاہر ایڈیشن" دیکھا تو سب سے پہلی بات جو میری نظر میں کھٹکی

وہ اس کا رسم الخط ہے یہ بالکل وہی ہے جو آج کل کے عام مطبوعہ نسخوں میں ملتا ہے اس کے علاوہ متن میں بھی کوئی نمایاں فرق نہیں۔ اس سے مجھے کچھ شبہ ہوا چنانچہ ملنے پر میں نے آغا محمد طاہر مرحوم سے پوچھا کہ یہ کیا بات ہے؟ انھوں نے فرمایا۔ ہاں میں نے آجکل کے پڑھنے والوں کی سہولت کے لئے رسم الخط بدل دیا تھا میں نے ان سے درخواست کی کہ اگر ہو سکے تو اصلی قلمی نسخہ دکھائیے! اس پر انھوں نے بتایا کہ مخطوطہ تو خاندان کے دوسرے افراد کے پاس کراچی میں ہے۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ کہ اب کے کراچی جاؤں گا تو آپ کے لئے اس کا عکس تیار کرا کے لے آؤں گا۔ خدا کی شان! اس کا انھیں موقع نہ ملا اور کراچی کی جگہ آخرت کا سفر پیش آگیا۔ "اذکروا امواتکم بالخیر" کی موجودگی میں جی نہیں چاہتا کہ شبہ کروں لیکن یونہی گمان گذرتا ہے کہ یہ قصیدہ اور غزل شاید اصل مخطوطہ میں نہیں۔ اور یہ دونوں کسی دوسری جگہ سے لیکر مطبوعہ طاہر ایڈیشن میں شامل کئے گئے ہیں۔ خدا کرے میرا گمان غلط ہو۔ کیا ہی اچھا ہو ــ اگر کوئی "ذمہ دار" صاحب اصلی مخطوطے کو دیکھکر اس سے متعلق ایک مفصل ایک تعارفی مضمون شائع کردیں یہ بہت بڑی علمی خدمت ہوگی۔"

(صفحہ ۱۴۹ و ۱۵۰۔ سہ ماہی فکر و نظر علی گڈھ جنوری ۱۹۶۱ء)

جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں جناب مالک رام کو اس قصیدہ اور غزل کے متعلق یہی اشتباہ ہے کہ یہ دونوں چیزیں اصل نسخے میں نہیں ہیں اور کسی دوسری جگہ سے لیکر (بلا حوالہ) انھیں اس قلمی نسخہ کا جزو قرار دے دیا گیا ہے۔ اگرچہ جناب مالک رام نے صریحی الفاظ میں انھیں الحاقی نہیں کہا مگر ان الفاظ سے جس غیر اطمینانی کیفیت کا اظہار ہوتا ہے وہ بہر حال ظاہر ہے! آغا طاہر مرحوم کو جن حضرات نے دیکھا ہے وہ جانتے ہیں کہ مرحوم ایک آزاد منش اور لاابالی قسم کے انسان تھے۔ ان کے شب و روز کا بڑا حصہ جامع مسجد کے اردگرد طواف میں گذرتا یا پھر یار باشی

ہیں ۔! لیکن علمی اور ادبی ذوق کی جو تختیگی انھیں ورثے میں ملی تھی ان کی ایک ایسی خصوصیت تھی جس سے ان کی بہت سی بشری کمزوریوں پر پردہ پڑ جاتا ہے۔
جناب مالک رام کو اگر اس سلسلے میں کوئی شبہ ہوا تو وہ بھی بیجا نہیں لیکن جہاں تک اس قصیدہ اور غزل کا تعلق ہے میں پوری ذمہ داری کے ساتھ یہ کہہ سکتا ہوں کہ یہ دونوں چیزیں اس مخطوطے میں شامل ہیں جس کو بنیاد بنا کر آغا صاحب مرحوم نے طاہر ایڈیشن ترتیب دیا ہے۔ یہ قلمی نسخہ آغا صاحب مرحوم نے مجھے اس خصوصیت کے اظہار کے ساتھ دکھایا تھا کہ اس میں یہ دو چیزیں بالکل نئی اور نادر ہیں جو دوسرے مروجہ دیوانوں میں نہیں پائی جاتیں۔ یہ واقعہ طاہر ایڈیشن کی اشاعت سے بعد کا ہے۔ مگر اس وقت تک یہ نیا ایڈیشن میری نظر سے گذرا نہیں تھا چنانچہ میں نے آغا صاحب مرحوم سے درخواست کی کہ وہ نوادر پر ایک مضمون لکھ کر کسی موقر رسالے میں شائع کر دیں ۔! میرے اس معروضہ پر آغا صاحب نے مجھے "طاہر ایڈیشن" کا ایک نسخہ عنایت فرمایا۔ جو اسی زمانہ میں چھپا تھا! اور یہ پہلا دن تھا جب مجھے طاہر ایڈیشن کی اشاعت کے بارے میں علم ہوا ۔!

اب رہا جناب مالک رام کا یہ فرمانا کہ ۔

"اس کا رسم الخط ..... بالکل وہی ہے جو آج کل کے عام مطبوعہ نسخوں میں ملتا ہے اس کے علاوہ متن میں بھی کوئی نمایاں فرق نہیں۔ اس سے مجھے کچھ شبہ ہوا"

ظاہر ہے کہ جناب مالک رام نے یہ بات طاہر ایڈیشن دیکھ کر ہی کہی ہے اور غالباً ان سے یہ بات بھی پوشیدہ نہ ہوگی کہ آغا صاحب نے اس قلمی نسخے کو سامنے رکھ کر خود اسے ترتیب دیا! رسم الخط کی بات تو میری سمجھ میں نہیں آتی! میرے نزدیک قدیم نسخوں کی ترتیب و تدوین کے وقت اگر پرانے رسم الخط کو ترک کر کے "اونھیں" کے بجائے "انھیں"۔ اور "پہونچا" کے بجائے "پہنچا" لکھ دیا جائے تو اس سے نفس مضمون میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔

جناب مالک رام کو اس قصیدہ اور غزل کے بارے میں جو شک و شبہ پیدا ہوا اس

کی بنیاد اگر صرف یہی ہے کہ یہ دونوں چیزیں اصل نسخے میں شامل نہیں ہیں تو ان کا یہ اشتباہ صحیح نہیں ہے۔ اس کے علاوہ اگر کوئی وجوہ اور بھی ہیں تو وہ اس وقت ختم ہو گئے جب ان دونوں چیزوں کو بلا کسی اختلافی نوٹ کے دیوان غالب (نسخہ مالک رام) کے صفحات ۲۹۱-۲۹۲ و ۳۰۲ تا ۳۰۴ میں جگہ دیدی گئی خصوصاً مولانا عرشی کی ان توضیحات کے بعد:

"مرزا غالب مرحوم کا ایک غیر مطبوعہ قصیدہ" کے عنوان سے مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم نے اخبار "الہلال" میں ایک مضمون لکھا تھا جسے رسالہ زمانہ کانپور جولائی ۱۹۱۴ء میں نقل کیا گیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ قصیدہ لارڈ کیننگ کے دربار آگرہ منعقدہ ۱۳ جنوری ۱۸۶۰ء کے موقع پر مرزا صاحب نے لکھا تھا لیکن میری دانست میں یہ تاریخ درست نہیں ہے اوّل اس بنا پر کہ اس میں میکلوڈ صاحب کو "فرمانروائے پنجاب" بتایا ہے اور وہ ۱۰ جنوری ۱۸۶۵ء کو مسٹر منٹگمری کے مستعفی ہونے کے بعد فنانشل کمشنری پنجاب کے عہدے سے ترقی پا کر لفٹنٹ گورنر پنجاب ہوئے تھے (تاریخ پنجاب از منشی دیبی پرشاد (ص ۱۹۷ مطبع نولکشور لکھنؤ ۱۸۷۲ء) دوسرا سبب یہ ہے کہ اس کے ۱۹ ویں شعر (۲۸۳:۱) میں پل کے کھلنے کا ذکر ہے اور اس کا واقعہ یہ ہے کہ ۱۸۵۷ء میں ایسٹ انڈیا ریلوے کلکتہ سے رانی گنج تک جو ایک سو بیس میل کا فاصلہ ہے جاری تھی تعمیر کا کام برابر دلی تک جاری رہا پہلے آگرے سے جمنا کے غربی کنارے کے ساتھ داغ بیل ڈالی گئی۔ غدر کے بعد اسکی جگہ ٹونڈلہ جنکشن سے علی گڑھ ہوتی ہوئی جمنا کے مشرقی کنارے چولا تک کا حصہ ۱۸۶۴ء میں کھولا گیا اس وقت جمنا کا پل بن رہا تھا ۱۸۶۶ء کے آخر میں یہ پل بنکر تیار ہوا اور یکم جنوری ۱۸۶۷ء کو پہلی بار اس پر سے ریل گذری (واقعات دارالحکومت دہلی ۱: ۳۴۷ و ۲: ۲۲۳) تیسرے اس وجہ سے کہ ۱۳ ویں شعر میں میرزا صاحب نے اپنی عمر ستر برس کی بتائی ہے چونکہ ان کا سال پیدائش ۱۲۱۲ھ (۱۷۹۷ء) ہے اور ان میں ستر کا اضافہ کیا جائے تو ۱۲۸۲ھ (۱۸۶۷ء) ہوتے ہیں اس صورت حال کے پیش نظر یہ قصیدہ جنوری ۱۸۶۷ء کے پہلے کا نہیں ہو سکتا اور چونکہ اسکے ۴۸ ویں شعر میں ۱۳ جنوری کا ذکر ہے لہٰذا اس تاریخ کے بعد کا ہونا چاہئے۔ (صفحہ ۳۸۰ نسخہ عرشی)

دیوان غالب مرتبہ مالک رام

اردو دیوان غالب کا یہ ایڈیشن اپنی صوری و معنوی خوبیوں کے اعتبار سے ایک ایسا نقش اول ہے جس نے دیوان غالب کی ترتیب و تدوین کے نئے چراغ روشن کئے ہیں اور یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ جناب مالک رام نے وقت کے تقاضوں کی اہمیت کا پورا پورا اندازہ کر کے پہلی بار غالب کے متداول دیوان اور اس تمام منتشر کلام کی شیرازہ بندی کرنے کی کوشش کی ہے جو ادھر ادھر بکھرا ہوا تھا۔!

یہ دیوان (جسے عام اصطلاح میں کلیات بھی کہا جا سکتا ہے) ۳۵۹ صفحات پر محیط ہے ابتدائی ۳۶ صفحات پر خود جناب مالک رام کا لکھا ہوا ایک محققانہ اور مبسوط مقدمہ ہے اور اس کے بعد غالب کا لکھا ہوا وہی فارسی کا دیباچہ! جو ابتدائی اشاعتوں میں شامل ہے۔ غالب کی تصویر بھی ہے اور عکس تحریر بھی۔ اس کے بعد وہ غزلیات جو متداول دیوانوں میں شامل ہیں۔ اور پھر قصائد۔ مثنوی۔ قطعات، متفرقات اور رباعیات۔ اس کے بعد ایک "تتمہ" ہے جس میں وہ کلام شامل ہے جو متداول دیوان کی اشاعت کے بعد فراہم ہوا ہے۔ اور سب سے آخر میں "نسخہ حمیدیہ" کا انتخاب دیا گیا ہے!

یہ دیوان آزاد کتاب گھر دہلی نے ۱۹۵۷ء میں بڑے اہتمام سے شائع کیا ہے بلحاظ کتابت، طباعت اور سب سے زیادہ اس کی تصحیح خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ کوئی خاص دعویٰ تو نہیں کیا جا سکتا لیکن میرا خیال کہ اس میں کتابت کی غلطیاں تلاش کرنے کے لئے اچھا خاصا وقت صرف کرنے کے باوجود بھی شاید چند ہی غلطیاں مشکل سے نظر آئیں گی۔

فٹ نوٹ اور حاشئے بکثرت ہیں بہت سے ضروری اور کچھ غیر ضروری بھی! البتہ جدید دریافت شدہ کلام کے حوالوں کو جس خاص التزام کے ساتھ پیش کیا گیا ہے وہ بڑی کارآمد چیز ہے۔ اس دیوان کی ترتیب۔ تدوین اور تزئین کے لئے جو محنت شاقہ گوارہ کی گئی ہے اسے دیکھتے ہوئے دو چیزوں کی کمی بری طرح محسوس ہوتی ہے۔

فہرست۔ کنایات۔ اور فرہنگ! اگر کچھ صفحات ان کے لئے بھی دیدئے جاتے تو پڑھنے والوں کا بہت سا وقت بچایا جاسکتا تھا۔

میرے پیش نظر اس دیوان کا جو نسخہ ہے وہ مولانا عرشی رام پوری کی ملکیت ہے اور اس پر جناب مالک رام کے دست مبارک کی لکھی ہوئی یہ عبارت موجود ہے!

"برادر معظم و مکرم جناب امتیاز علی خاں عرشی مدظلہ کی خدمت میں"

۱۹۵۷/۵/۲۱ء ہدیہ: مالک رام

اس خاص نسخہ میں مولانا عرشی نے اپنی "جدید تحقیق" کے مطابق کچھ اشعار "قلمزد" فرمادیئے ہیں اور ایک آدھ جگہ نوٹ بھی تحریر فرمائے ہیں جو بجنسہٖ درج ذیل ہیں۔ اور بہرحال "الحاقی کلام" سے تعلق رکھتے ہیں۔!

قلمزد اشعار

(۱)

خدا کے واسطے پردہ نہ کعبے کا اٹھا واعظ
کہیں ایسا نہو۔ یاں بھی وہی کافر صنم نکلے (ص ۲۹۴)

(۲)

کیا ان دنوں بسر ہو ہماری فراغ میں
کچھ تفرقہ رہا نہ دل و درد و داغ میں
چاہا بہ چشم شوق جو موسیٰ نے طور پر
یاں دیکھتے ہیں روز وہی ہر چراغ میں
یہ تمکنت و وقار علائیؔ یہ وحشتیں
شورش ہے کچھ ضرور تمھارے دماغ میں

(نوٹ) یہ شعر علائی کے ہیں:" عرشی (ص ۳۱۸)

(۳)

ابر روتا ہے کہ بزم طرب آمادہ کرو
برق ہنستی ہے کہ فرصت کوئی دم ہے ہم کو (ص ۳۲۲)

(۴)

دل آپ کا کہ دل میں ہے جو کچھ سو آپ کا
دل لیجئے مگر مرے ارماں نکال کے (ص ۳۲۲)

(۵)

چند تصویر بتاں - چند حسینوں کے خطوط
بعد مرنے کے مرے گھر سے یہ ساماں نکلا (ص ۳۲۲)

(۶)

ہم کیا کہیں کسی سے - کیا ہے طریق اپنا
مذہب نہیں ہے کوئی . ملت نہیں ہے کوئی (ص ۳۲۴)

(۷)

گلشن دہر بھی ہے کوئی سرائے ماتم
شبنم اس باغ میں جب آئے تو گریاں آئے (ص ۳۲۴)

(۸)

پھر مرتبہ بڑھایا مرا . نفی غیر نے
آیا ہر اک مکان نظر - لامکاں مجھے (ص ۳۲۴)

(نوٹ) اشعار ۶-۷-۸ کے متعلق مولانا عرشی نے لکھا ہے ۔
یہ شعر علائی کے ہیں " عرشی " (ص ۳۲۴)

نسخۂ عرشی

تحقیقی نقطۂ نظر سے کلام غالب کا جتنا گہرا مطالعہ مولانا امتیاز علی خاں عرشی رام پوری نے کیا ہے اس دور میں یہ امتیاز شاید کم ہی لوگوں کے حصّے میں آیا ہوگا۔ اور ان کا یہ انہمک مطالعہ کوئی دس پانچ سال کی کاوش نظر نہیں ہے بلکہ یوں سمجھنا چاہیئے کہ انھوں نے اپنی زندگی کے بیشتر، قیمتی لمحات اسی علمی جد و جہد میں صرف کئے ہیں جو آج دیوان غالب (نسخۂ عرشی) کے روپ میں ہمارے سامنے موجود ہے۔ جناب محمد ذاکر (ریسرچ اسکالر شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی) نے نسخۂ عرشی کو "دیوان غالبؔ کا پہلا اور آخری مطبوعہ نسخہ" قرار دیتے ہوئے بالکل صحیح لکھا ہے۔

"غالب کے اردو کلام کے لاتعداد ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ قابل ذکر ایڈیشنوں میں سب سے آخر۔ لیکن سر فہرست جناب امتیاز علی عرشی کا وہ نسخہ ہے جو انجمن ترقی اردو ہند نے ۱۹۵۸ء میں شائع کیا ہے غالبیات کے سلسلے میں یہ نسخہ بنیادی حیثیت رکھتا ہے اس میں غالب کا مطبوعہ اور غیر مطبوعہ اردو کلام اور مختلف نسخوں کے اختلافات نہایت جانفشانی سے جمع کئے گئے ہیں۔"

(صفحہ ۱۰۲۔ اردوئے معلیٰ دہلی غالب نمبر شمارہ اوّل ۱۹۶۰ء)

ٹائپ کے پانچ سَو دو (۵۰۲) صفحات پر یہ دیوان غالب کے اردو کلام کی ایک ایسی جامع و مکمل انسائیکلوپیڈیا ہے جو غالب کے مطالعہ کاروں کو بہت سی نایاب و کمیاب کتابوں سے ایک حد تک بے نیاز کر دیتا ہے "نسخۂ حمیدیہ" سے لیکر متداول دیوان کے وہ تمام ایڈیشن نسخۂ عرشی میں زیر بحث لائے گئے ہیں جو غالب کی زندگی میں ترتیب دیئے گئے! مطبوعہ کلام بھی اور غیر مطبوعہ اب تک جو کچھ سامنے آچکا ہے سبھی آگیا ہے اس میں اور اسی کے ساتھ ساتھ غالب

کی تحریرات اور دوسری شہادتوں سے جہاں تک ممکن تھا ایک ایک شعر کی تاریخی اہمیت پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔

اپنے ایک سو بیس صفحات کے دیباچے میں مولانا عرشی نے غالب کی شعری زندگی کو جس تحقیقی رنگ میں پیش کیا ہے جزوی اختلاف کے باوجود اس کی عظیم افادیت و اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا اور یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ اگر اس تاریخی دیوان کے ساتھ ایسا گرانقدر عالمانہ "آغازیہ" شامل نہ ہوتا تو شاید مولانا کی برسہا برس کی سعی و کوشش کچھ زیادہ اجاگر نہ ہوسکتی۔ اسی طرح "نسخۂ عرشی" کے شاندار "حواشی" بھی غالبیات کے سلسلے کی ایسی کڑی ہیں۔ جو اس سے پہلے اس انداز میں شاید ہی کہیں اور نظر آئیں۔

جناب مالک رام کے الفاظ میں یہ دیوان مندرجہ ذیل ابواب میں منقسم ہے۔

(۱) گنجینۂ معانی۔ (ص ۱ - ۱۱۸) اس حصے میں وہ ابتدائی کلام ہے جو نسخہ بھوپال اور نسخہ شیرانی میں تھا لیکن میرزا نے متداول تیار کرتے وقت اسے نظری کر دیا۔

(۲) نوائے سروش (ص ۱۱۹ - ۲۵۸) اس حصے میں متداول دیوان کا کلام ہے۔ اس کا متن رام پور کے اس مخطوطے پر مبنی ہے جو خود میرزا نے ۱۸۵۷ء میں نواب ناظم فردوس مکان کی خدمت میں گذارنا تھا (یعنی نسخہ رام پور جدید)

(۳) یادگار نالہ ـــ (ص ۲۵۹ - ۳۱۴) اس میں وہ تمام کلام ہے جو اگرچہ دیوان کے کسی مطبوعہ نسخے میں نہیں ملتا۔ لیکن یا تو خود میرزا نے اسے الگ سے شائع کیا۔ مثلاً "قادر نامہ" یا اس کا کچھ حصہ خود ان کے خطوط میں ہے یا کسی دوسرے کی تصنیف میں ان سے منسوب ہے یا میرزا کے غیر مطبوعہ کلام کے نام سے جرائد میں شائع ہوا ہے۔ میں نے سرسری طور پر شمار کیا تو یہاں ماخذ میں مجھے ۲۷۔ قلمی اور مطبوعہ کتابوں اور پانچ موقت الیشوع رسائل کے نام ملے!

(صفحہ ۱۳۸۔ سہ ماہی فکر و نظر علی گڈھ۔ جنوری ۱۹۶۰ء)

"نسخہ عرشی" میں دوا دین کے علاوہ ایک "شرح" بھی ہے جس میں غالب کی تحریرات سے خود ان کے کلام کی شرح پیش کی گئی ہے اور "نسخہ عرشی" کا یہ باب بھی اپنے ماسبق ابواب کی طرح اتنا ہی مکمل اور جامع ہے اور مولانا عرشی کی اس شرح کو غالب کی شرحوں میں یقیناً اولیت کا شرف حاصل ہے۔

غالبیات پر کام کرنے والوں نے "نسخۂ عرشی" کے بعض اجزاء سے اختلاف رائے بھی کیا ہے جو تھوڑے بہت فرق کے ساتھ قابل توجہ ضرور ہیں لیکن اس کے باوجود اس سے کوئی بھی انکار نہیں کرسکا کہ مولانا عرشی کی یہ گرانقدر کاوش غالب کے "فکر و فن" پر حرف آخر کا درجہ نہیں رکھتی ـــــ! اور جہاں تک تدوین علمی کا تعلق ہے مولانا عرشی کی ذات بہرحال قابلِ صد احترام ہے۔

یہ ضخیم دیوان ٹائپ میں چھاپا گیا ہے اور اسی اعتبار سے بیس روپیہ اس کی قیمت بھی رکھی گئی ہے۔ جہاں تک میں سمجھتا ہوں اس دیوان کا سب سے زیادہ تاریک پہلو یہی ہے! ذوق نگاہ کی بات تو الگ رہی! اس دیوان کو سامنے رکھ کر سنجیدگی کے ساتھ یہ تسلیم کرلینا چاہیئے کہ "اردو ٹائپ" اردو رسم الخط کے اشاعتی مقصد کو کامیاب بنانے میں کسی طرح کامیاب ثابت نہیں ہوا ہے۔! جس سائز پر یہ اٹھارہ سطری دیوان شائع کیا گیا ہے اگر اسی سائز پر اسے "لیتھو پریس" میں طبع کرایا جاتا تو اس کی ضخامت کسی طرح چار سو صفحات سے زیادہ نہیں ہوسکتی تھی۔ اور قیمت تو اس کساد بازاری کے دور میں دس یا بارہ روپیہ بھی زیادہ تھی چہ جائیکہ بیس روپیہ ـــ!

"نسخۂ مہر"

پاکستانی مطبوعات میں "عکسی دیوان غالب" (سلسلہ مطبوعات نمبر ۲۷) شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور محض اسی اعتبار سے سلسلہ غالبیات میں ایک قابل ذکر اضافہ نہیں ہے کہ اسے پاکستان کے ایک مستند ادارے نے غالب صدی کے لئے ۱۹۶۷ء میں پیش کیا ہے بلکہ اس کی اہمیت وافادیت محب محترم حضرت مولانا غلام رسول مہرؔ کی نسبت سے عبارت ہونے کے بعد کچھ اور بڑھ جاتی ہے — اور اس دیوان کی یہی ایک خصوصیت ایسی ہے جو غالبیات پر کام کرنے والوں کو نئی راہوں سے ہم آہنگ کرنے میں ممد و معاون ثابت ہو سکتی ہے۔ چار سو صفحات سے زائد ضخامت کے اس اردو دیوان میں متداول دیوان کے علاوہ نسخہ حمیدیہ کا اِنتخاب۔ قصائد۔ مثنویات۔ قطعات اور متفرق اشعار کے علاوہ اس "الحاقی کلام" کو بھی جگہ دیدی گئی ہے جو بلاشبہ غالبؔ کی فکر سخن سے تعلق نہیں رکھتا — اور ایک ادنیٰ ادیبہ نگاہ سے اسے کلامِ غالب کے پہلو بہ پہلو جگہ نہ پانا چاہئیے تھا۔ اس سے قبل یہی بات "نسخۂ عرشی" کے سلسلے میں بھی سامنے آچکی ہے لیکن مولانا مہرؔ کی طرح مولانا عرشی نے بھی مشکوک و مشتبہ کلام کو علیحدہ کرنے میں کافی احتیاط سے کام لیا ہے اور "بھوپال والی غزل" کے بارے میں ایک نوٹ بھی لکھا ہے۔

"مالک رام صاحب نے رسالہ ہمایوں لاہور بابت اپریل ۱۹۳۹ء سے حاصل کی مجھے اَب تک غالب سے اس کا انتساب محل نظر معلوم ہوتا ہے۔ صرف اس لئے شامل مجموعہ کر رہا ہوں کہ ایک حلقہ اسے غالب کی غزل قرار دے رہا ہے"۔ (فٹ نوٹ نمبر ۲۔ صفحہ ۳۳۲۔ نسخہ مہرؔ)

نو شعر کی یہ غزل جس کا مطلع و مقطع درج ذیل ہے۔

بھولے سے کاش وہ ادھر آئیں تو شام ہو
کیا لطف ہو جو ابلقِ دوراں بھی رام ہو

پیرانہ سال غالبؔ میکش کرے گا کیا
بھوپال میں مزید جو دو دن قیام ہو

بھوپال والی یہ غزل بلاشبہ غالب کی فکرِ سخن سے تعلق نہیں رکھتی۔ اس پر کافی تفصیلات پچھلے اوراق میں پیش کی جا چکی ہیں۔ اگر بقول مولانا مہرؔ اب بھی ایک حلقہ اسے غالب کی غزل قرار دے رہا ہے"۔ تو مجبوری ؟
اسی طرح "مکمل شرح کلام غالبؔ" (مصنفہ مولانا عبدالباری آسی مرحوم) کے متعلق بھی مولانا مہرؔ نے وضاحت فرمادی ہے۔

"مکمل شرح کلام غالب آسی ۲۴۳-۲۴۴- لیکن اہل نظر "مجموعہ آسی" میں شائع شدہ پورے غیر مطبوعہ کلام کا انتساب صحیح نہیں سمجھتے"۔ (فٹ نوٹ نمبر ا صفحہ ۳۳۳- نسخہ مہرؔ)

اس وضاحت کے ساتھ مولانا مہرؔ نے مولانا آسیؔ مرحوم کے کچھ ایسے کلام کی نشاندہی بھی کی ہے جو پیش نظر اوراق میں شامل نہیں ہے۔"نسخہ مہرؔ" سے یہ تمام کلام جو مولانا آسی مرحوم کی ندرت فکر کا نتیجہ ہے نقل کیا جارہا ہے

بتائیں کیا تمھارے عارض و کاکل کو کیا سمجھے
اُسے ہم سانپ سمجھے اور اسے من سانپ کا سمجھے
یہ کیا تشبیہہ بیہودہ ہے کیوں موذی سے نسبت دیں؟
ہُما عارض کو اور کاکل کو ہم ظلِ ہُما سمجھے
غلط ہی ہوگئی تشبیہہ۔ یہ تو ایک طائر ہے
اسے برگ سمن اور اسکو سنبل کی جٹا سمجھے
نباتات زمیں سے ان کو کیا نسبت معاذاللہ!
اسے برق اور اسے ہم کالی ساون کی گھٹا سمجھے
گھٹا اور برق سے کیونکر گھٹا کر انکو نسبت دیں
اسے ظلمات، اسے ہم چشمۂ آب بقا سمجھے

جو کہئے ! یہ فقط مقصود تھا خضر و سکندر سے
ید بیضا اسے ! اور اسکو موسیٰ کا عصا سمجھے
جو اس تشبیہ سے بھی داغ ان دونوں کو آتا ہو
اسے وقت نمازِ صبح اور اس کو عشا سمجھے
جو یہ نسبت پسند خاطر والا نہ ہو تو پھر
اسے قندیل کعبہ۔ اس کو کعبے کی ردا سمجھے
اسدؔ ان ساری تشبیہوں کو رد کرکے یہ کہتا ہے
سویدا اس کو سمجھے اس کو ہم نور خدا سمجھے !

نالے دل کھول کے دو چار کروں یا نکروں
یہ بھی اے چرخ ستمگار کروں یا نہ کروں
مجھ کو یہ وہم۔ کہ انکار نہ ہو جائے کہیں
ان کو یہ فکر۔ کہ اقرار کروں یا نہ کروں
لطف جب ہو کہ کروں غیر کو بھی میں بدنام
کہئے کیا حکم ہے سرکار۔ کروں یا نہ کروں

کٹے تو شب کہیں۔ کاٹے تو سانپ کہلائے
کوئی بتاؤ کہ وہ زلف خم بہ خم کیا ہے
لکھا کرے کوئی احکام طالعِ مولود
کسے خبر کہ وہاں جنبشِ قلم کیا ہے
نہ حشر و نشر کا قائل۔ نہ کیش و ملت کا
خدا کے واسطے۔ ایسے کہ پھر قسم کیا ہے
وہ داد و دید گراں مایہ شرط ہے ہمدم
وگرنہ مہر سلیمان و جام جم کیا ہے

یونہی افزائش وحشت کے جو ساماں ہونگے
دل کے سب زخم بھی ہمشکل گریباں ہونگے

نسخۂ عرشی کی طرح "نسخہ مہر" میں بھی غزلوں کے سن اور تاریخ کے تعین کا خاص اہتمام کیا گیا ہے اور کہیں کہیں ایسے اشعار کا اضافہ بھی کیا گیا ہے جو مروجہ دیوان میں موجود نہیں ہیں لیکن بعض غزلوں کے بارے میں تعین تاریخ کے لئے جس قیاس آرائی سے کام لیا گیا ہے وہ محل نظر ضرور ہے مثلاً

گئی وہ بات کہ ہو گفتگو تو کیونکر ہو
کہے سے کچھ نہ ہوا۔ پھر کہو! تو کیونکر ہو

اس کے متعلق قیاس کیا گیا ہے۔

"یہ بھی قلعے کے زمانے کی غزل ہے اور مقطع سے ظاہر ہے کہ بادشاہ کی غزل پر کہی گئی تھی جو "دیوان ظفر" جلد چہارم صفحہ ۱۰۹ پر ہے اس کا پہلا مطلع ہے۔

نصیب وصل تمھارا کہو تو کیونکر ہو
فراق یار میں تسکین ہو تو کیونکر ہو

یہ "دہلی اردو اخبار" کی ۶ مارچ ۱۸۵۳ء (۲۵ جمادی الاولی ۱۲۶۹ھ) کی اشاعت میں چھپی تھی لہٰذا اسے فروری ۱۸۵۳ء کی سمجھنا چاہیئے۔" (فٹ نوٹ صفحہ ۱۷۵۔ نسخہ مہر)

اسی طرح اس غزل کے متعلق ـ جس کا مطلع ہے۔

دل ہی تو ہے نہ سنگ وخشت درد سے بھر نہ آئے کیوں
روئیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں ستائے کیوں

اس غزل کو فروری ۱۸۵۳ء کی فکر قرار دیتے ہوئے استدلال کیا گیا ہے۔

"یہ غزل فروری ۱۸۵۳ء میں حسب فرمائش بہادر شاہ کہی گئی تھی اور شہزادہ نور الدین متخلص بہ شاہی نے اس کی تخمیس کی۔ ۱۲ فروری ۱۸۵۳ء

(جمادی الاولیٰ ۱۲۶۹ھ) کے "دہلی اردو اخبار" میں شائع ہوئی! کہا جاتا ہے کہ بادشاہ نے یہ غزل اس مقصد سے لکھوائی تھی کہ اس پر مصرعے بہ آسانی نہ لگ سکیں (مگر) مرزا نورالدین نے بہ کمال عجلت مخمس تیار کر دیا۔" (فٹ نوٹ صفحہ ۱۶۰۔ نسخہ مہر)

مزے جہان کے اپنی نظر میں خاک نہیں
سوائے خون جگر۔ سو جگر میں خاک نہیں

اس غزل کے بارے میں ارشاد ہے۔

"اس زمین میں ایک غزل نواب الٰہی بخش خاں معروف کی بھی ہے (مطبوعہ دیوان صفحہ ۱۰۱، ۱۰۲) جو یقیناً ۱۸۲۶ء سے پیشتر کہی گئی ہوگی اور ممکن ہے کسی مشاعرے کی طرح پر کہی گئی ہو۔! لہٰذا میرے نزدیک یہ غزل بھی ۱۸۲۶ء سے پیشتر کی سمجھی جا سکتی ہے بلکہ اگر معروف کے دیوان کی ترتیب ۱۸۲۰ء کی مانی جائے جیسا کہ عرشی صاحب کا خیال ہے تو یہ ۱۸۲۰ء سے پیشتر کی ہونی چاہیئے۔"
(فٹ نوٹ صفحہ ۱۵۸۔ نسخہ مہر)

ہو سکتا ہے کہ مولانا مہر کا قیاس درست ہی ہو لیکن تحقیقی زاویۂ نگاہ سے کسی اخبار میں کسی غزل کی اشاعت سے اس غزل کی تاریخ تخلیق کا تعین ممکن نہیں ہے۔! "دہلی اردو اخبار" میں جو غزلیں شائع ہوئیں ہیں ان کے بارے میں قطعی طور پر یہ کہنا کہ اسی زمانے میں ہفتے عشرے یا مہینہ دو مہینے کے اندر کہی گئیں! صحیح نہیں ہے! ہو سکتا ہے کہ یہ غزلیں ۱۸۵۲ء کے آخری زمانے کی ہوں یا کچھ اس سے بھی قبل کہی گئی ہوں؟ نواب الٰہی بخش خاں معروف کی جن زمینوں میں غالب کی غزلوں کی نشاندہی کی گئی ہے ان کے بارے میں بھی یہ قابل قبول نہیں ہے کہ وہ دیوان معروف کے سن ترتیب ۱۸۲۰ سے قبل کی یا قریب العہد ہو سکتی ہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ معروف نے غالب کی زمینوں میں غزلیں کہی ہوں۔ ہو سکتا ہے

کہ معروف کی کوئی زمین غالب کو برسوں کے بعد پسند آئی ہو اور انھوں نے اس طرح میں غزل کہہ دی ہو۔! "نسخہ عرشی" اس وقت میرے سامنے نہیں ہے اس لئے یہ کہنا دشوار ہے کہ مولانا عرشی نے جن غزلوں کی تاریخ کا تعین دیوان معروف کی ترتیب ۱۸۲۰ء سے کیا ہے اس کا ثبوت "نسخہ حمیدیہ" سے بھی فراہم کیا گیا ہے یا نہیں؟ جو کہ بلاشبہ ۱۸۲۱ء کے آخر میں پایۂ تکمیل کو پہنچا۔

اب رہا مولانا مہر کا یہ فرمانا کہ یہ غزل بادشاہ کی فرمائش پر کہی گئی یقیناً اس فرمائش کے ثبوت کی محتاج ہے جس کا ذکر "نسخۂ مہر" میں نہیں ملتا۔!

مولانا آسی مرحوم کی "تراوش فکر" کے علاوہ مولانا مہر نے دو "ایسے الحاقی اشعار" کی بھی نشاندہی کی ہے جو بقول ان کے غالب کے نہیں ہیں۔!

غالب! کچھ اپنی سعی سے کہنا نہیں مجھے
خرمن جلے۔ اگر نہ ملخ کھائے کشت کو

اس شعر کے متعلق مولانا تحریر فرماتے ہیں۔

"اس غزل کا ایک شعر اور بھی پیش کیا جاتا ہے لیکن نہ تو اس کی کوئی سند موجود ہے اور نہ شعر ایسا ہے کہ اسے غالب سے منسوب کرتے ہوئے تامل نہ ہو" (فٹ نوٹ ۱۶۳۔ نسخۂ مہر)

ایک دوسرے شعر کے متعلق تحریر فرماتے ہیں۔

"یہ غزل شاہی مشاعرے کی تھی اور طرحی تھی۔ ۱۹ر جون ۱۸۵۴ء (۱۱ر رمضان ۱۲۶۹ھ) کے "دہلی اردو اخبار" میں شائع ہوئی تھی۔ اس غزل کا ایک شعر یہ بھی بتایا جاتا ہے۔

ذرا کر زور سینے سے کہ تیر پُر ستم نکلے
جو یہ نکلے تو دل نکلے۔ جو دل نکلے تو دم نکلے

یہ کسی مستند نسخے میں نہیں ملا۔ نیز اسے مطلع ثانی کے طور پر نہیں بلکہ نویں نمبر پر رکھا گیا ہے اور یہ صورت قابل قبول نہیں"
(فٹ نوٹ صفحہ ۱۷۷ نسخۂ مہر)

نئی دریافت کی روشنی میں "نسخۂ مہر" کے بعض مآخذ بھی ترمیم طلب ہیں۔

(۱) صفحہ ۳۳۰ "نسخۂ مہر" میں "سخن تکیہ والی غزل" کی نسبت مولانا مہر نے تحریر فرمایا ہے ۔۔۔ "یہ اشعار "پہلے پہل" ۲۲ر جولائی ۱۹۱۴ء کے "الہلال" کلکتہ میں چھپے تھے اور مولانا آزاد (ابوالکلام) نے خود مجھے بتایا تھا کہ یہ نواب سعید الدین احمد خاں طالب کی بیاض سے نقل کئے گئے تھے"۔ (فٹ نوٹ نمبر ۱ صفحہ ۳۳۰۔ نسخۂ مہر)

یہ غزل مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کی دریافت نہیں ہے بلکہ "الہلال" کلکتہ سے قبل روزنامہ "ہمدرد" دہلی ۱۴ر جون ۱۹۱۳ء میں سب سے پہلے شائع ہو چکی ہے اس کے متعلق ایک مفصل نوٹ بھی شائع ہوا تھا جس کی تفصیلات پچھلے اوراق میں (بسلسلۂ بدایوں ایڈیشن) پیش کی جا چکی ہیں۔

(۲) ــــــ اس جور و جفا پر بھی بدظن نہیں ہم تجھ سے
کیا طرفہ تمنا ہے امید کرم تجھ سے

اس غزل کے متعلق مولانا مہر نے لکھا ہے۔

"یاد نہیں رہا کہ یہ کہاں سے لئے ہیں۔ لیکن میری ایک کتاب میں لکھے ہوئے موجود ہیں"۔ (فٹ نوٹ نمبر ۲۔ صفحہ ۳۳۷۔ نسخۂ مہر)

پانچ اشعار کی یہ غزل بلا شبہ مولانا عبد الباری آسی مرحوم کی جدت فکر کا نتیجہ ہے۔ اور "نسخۂ عرشی" میں بھی نقل کی گئی ہے۔

(۳) صفحہ ۳۶۲۔ "نسخۂ مہر" میں ایک سلام "متفرقات غالب" (پروفیسر مسعود حسن ادیب) سے نقل کیا گیا ہے۔ "متفرقات غالب" اس وقت میرے سامنے نہیں ہے لیکن جہاں تک یاد پڑتا ہے یہ سلام سب سے پہلے ماہنامہ "مبصر" لکھنؤ بابتہ ماہ مئی ۱۹۲۹ء جلد ۱ شمارہ ۵ میں حکیم سید علی آشفتہ لکھنوی مرحوم کے اس نوٹ کے ساتھ بعنوان (اسد اللہ خاں غالب دہلوی کی ایک غیر مطبوعہ نظم) شائع ہوا تھا۔

"یہ نظم غالب مرحوم نے بعنوان "مرثیہ" ۔۔۔ ۱۲۷۰ھ میں میرے جد بزرگوار

بحرالعلوم سلطان العلماء علامہ سید محمد صاحب رضوان مآب کی خدمت میں بھیجی تھی جو میری ایک خاندانی بیاض میں موجود ہے جس میں اور بہت سے خطوط وغیرہ اور مسائل علمیہ بھی ہیں جو دیگر بلاد و امصار سے جناب سلطان العلماء کی خدمت میں آئے ہیں۔ اور جن کے جوابات جناب رضوان مآب نے دیئے ہیں۔ چنانچہ بعض اور خطوط غالب مرحوم کے بھی ہیں اور بعض خطوط شاہان دہلی کے بھی۔ جن کو آئندہ کسی مناسب موقع پر ناظرینِ "مبصر" کی خدمت میں پیش کروں گا۔ بالفعل یہ نظم ہدیۂ نظر ہے[1]۔ غالب کے اس غیر مطبوعہ کلام کے سلسلے میں جو کبھی کبھی ایک آدھ غزل کی صورت میں نظر آجاتا ہے یہ نظم ایک غیر معمولی اضافہ ہے۔"

(خادم - حکیم آشفتہ)

ماہنامہ "مبصر" حکیم سید علی آشفتہ مرحوم کی ادارت میں کئی سال تک لکھنؤ سے نکلتا رہا۔ یہ ماہنامہ غالباً کسی ادبی انجمن (شاید معراج ادب) کا آرگن تھا جو کئی سال تک جاری رہا۔ اس صدی کی تیسری دھائی کے آغاز میں حکیم آشفتہ مرحوم ریاست حیدرآباد دکن نقل سکونت کرکے چلے گئے تھے اور وہیں ۱۹۴۷ء سے قبل ان کا انتقال ہو گیا۔ حکیم آشفتہ کی وفات کے بعد جب میرا جانا حیدرآباد دکن ہوا تو میں نے برادرم سید ہمایوں حیدر (داماد حکیم آشفتہ مرحوم) سے کئی بار خواہش کی کہ وہ یہ بیاض دکھائیں مگر معاملہ کچھ "گومگو" میں ٹلتا چلا گیا اور میں سیتاپور واپس چلا آیا ـــ افسوس کہ اس بیاض کی زیارت نہ کر سکا۔

حکیم آشفتہ کے نوٹ میں شاہان دہلی کے جن خطوط کا ذکر ہے! اگر میرا

---

[1] صفحہ ۳۶۳ "نسخہ مہر" کا یہ شعر۔!

یہ اجتہاد عجب ہے کہ ایک دشمنِ دین　　علیؑ سے آکے لڑے اور خطا کہیں اس کو

یہ شعر ماہنامہ "مبصر" میں نقل نہیں کیا گیا ہے۔ اس شعر کے متعلق حکیم آشفتہ نے ایک فٹ نوٹ میں لکھا ہے (نوٹ) "یہ اجتہاد........) یہ شعر چونکہ ان (غالب) کے مذہبی جذبات سے مخصوص ہے یعنی عقائد فرقۂ اثنا عشریہ کے متعلق۔ اسلئے اس کو بالفعل مصلحتاً نظر انداز کرتا ہوں اگر کسی وقت ایسی ہی ضرورت ہوگی تو ہدیۂ ناظرین کروں گا۔" آشفتہ (صفحہ ۹-۱۰ ماہنامہ مبصر لکھنؤ جلد ۱ شمارہ ۵ مئی ۱۹۲۹ء)

حافظہ غلطی نہیں کررہا ہے تو یہ خطوط کوئی تیس سال ہوئے ماہنامہ "حقائق" لکھنؤ میں شائع ہو چکے ہیں۔

صفحات ۳۶۵ - ۳۶۸ "نسخہ مہر" میں تین درجن کے قریب متفرق اشعار شامل ہیں۔ مگر ان اشعار کے مآخذ نہیں دیئے گئے ہیں۔ ان میں متعدد اشعار ایسے ہیں جنھیں غالب سے دور کا بھی علاقہ نہیں ہے۔ اگر مولانا مہر ان اشعار کا مآخذ حواشی میں درج کر دیتے تو اصل اشعار سے "الحاقی کلام" کو علیحدہ کرنے میں آسانی ہوتی۔ بادی النظر میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ تمام متفرق اشعار غالب ہی کا کلام ہیں۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ اس میں متعدد اشعار "الحاقی" ہیں جن کے متعلق گذشتہ اوراق میں تفصیلات پیش کی جا چکی ہیں۔

"نسخہ مہر" میں مولانا مہر کا ایک مختصر سا مقدمہ بھی شامل ہے جس میں مولانا کا مخصوص اسلوب تحقیق نمایاں ہے اور بلاشبہ اس مختصر سے مقدمہ میں مولانا مہر نے اپنی سیر حاصل تخلیق "غالب" (شائع کردہ شیخ مبارک علی تاجر کتب لاہور) کے بہت سے خد و خال کو نمایاں کیا ہے اور "غالبیات" کے کئی ایسے مسائل کو سلجھانے کی کوشش کی ہے جو آج موضوع بحث بنے ہوئے ہیں۔ غالب کے استاد "عبدالصمد ایرانی" کا مسئلہ بھی انھیں مسائل سے تعلق رکھتا ہے جن کی شاگردی سے غالب نے انکار کیا ہے — ! جناب مالک رام اور مولانا عرشی نے اسے "افسانہ" قرار دیتے ہوئے "مبالغہ اور مصلحت" سے تعبیر کیا ہے — لیکن مولانا مہر ان دونوں کی رائے سے متفق نہیں ہیں اور "عبدالصمد" کی شخصیت کو افسانوی کردار نہیں سمجھتے بلکہ ایک "نیا نظریہ" پیش کرتے ہیں۔

"نسخہ مہر" کے مقدمہ میں لکھا ہے۔

"خواجہ حالی نے یقیناً وہی لکھا۔ جو کچھ سنا۔ ممکن ہے میرزا غالب نے "عالم سرخوشی" میں ایک سے زیادہ مرتبہ اس قسم کی بات کہہ دی ہو (یعنی "مجھکو مبدأ فیاض کے سوا کسی سے تلمذ نہیں ہے اور "عبدالصمد" محض ایک فرضی نام ہے") لیکن — اس میں جس "استادی" کی نفی کی گئی ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ اس کا تعلق "تعلیم و تعلم" سے نہیں بلکہ صرف "شاعری" سے ہے۔ یعنی میرزا

نے اس عہد کے عام دستور کے خلاف "شاعری" میں کسی کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ نہ کیا۔ اور "عبدالصمد" کو بھی مستثنیٰ نہیں کیا جاسکتا۔"

(صفحہ ۹۔ نسخۂ مہر)

"غالب" کی تصنیف و تالیف کے وقت ظاہر ہے کہ مولانا مہر ایسا نہیں سمجھتے تھے بلکہ "شعر و شاعری" میں تلمذ کا کوئی تصوّر بھی ان کے ذہن میں نہیں تھا۔ فرماتے ہیں۔

"بہرحال "ملا عبدالصمد" کی تعلیم و آموزش فارسی زبان" میں غالب کے کمال رسوخ کا سب سے بڑا ظاہری ذریعہ تھی تعلیم کی مدت اگرچہ بہت ہی کم تھی یعنی صرف دو برس۔ لیکن غالب کی غیر معمولی فطری استعداد نے اس مختصر سی صحبت میں اتنا فیض حاصل کرلیا کہ دوسروں کے مدت العمر کے اکتسابات بھی اس کا مقابلہ نہیں کرسکتے۔ صحیح تعلیم اور صحیح استعداد کے اجتماع کی یہ ایک نہایت عمدہ مثال ہے۔"

(صفحہ ۲۹۔ غالب چوتھا ایڈیشن)

اور جہاں تک میں سمجھتا ہوں میرزا غالب نے جب "ملا عبدالصمد" کے وجود کو "فرضی کردار" قرار دیا تھا اس وقت ان کے شعور پر بھی "شعر و شاعری" نہیں تھی۔ مولانا مہر نے اپنی تالیف "غالب" ہی میں رسالہ "ہندوستانی" (الہ آباد) جنوری ۱۹۳۴ء کے حوالے سے میرزا غالب کا جو خط نقل کیا ہے وہ اسی حقیقت کا آئینہ دار ہے۔

"میں نے ایام دبستان نشینی میں "شرح مائۃ عامل" تک پڑھا۔ بعد اسکے لہو و لعب اور آگے بڑھ کر فسق و فجور عیش و عشرت میں منہمک ہوگیا اور شعر و سخن کا ذوق فطری و طبعی تھا۔ ناگاہ! ایک شخص کہ ساسان پنجم کی نسل سے معہذا منطق و فلسفہ میں "مولوی فضل حق مرحوم" کا نظیر۔ اور مومن۔ موحد و صوفی صافی تھا۔ میرے شہر (آگرہ) میں وارد ہوا۔" اور لطائف فارسی بحث (خالص فارسی بے آمیزش عربی) اور غوامض فارسی آمیختہ بہ عربی اس سے میرے حالی ہوئے" سونا کسوٹی پر چڑھ گیا۔ ذہن معوج نہ تھا۔ زبان دری سے پیوند

ازلی اور"استاد" بے مبالغہ جاماسپ عہد و بزرجمہر عصر تھا حقیقت اس زبان کی دلنشین و خاطر نشان ہوگئی "۔

نہ میرزا غالب کے الفاظ سے اور نہ مولانا مہر کے ارشاد سے کہیں یہ ترشح ہوتا ہے کہ اس سیاق و سباق کو "شعر و شاعری" سے کوئی علاقہ تھا۔ خود غالب کے ذہن پر بھی یہ تاویل نہیں تھی ورنہ ان کی دور اندیشی اسے ضرور اپنا لیتی۔

جہاں تک ملا عبدالصمد کی شاگردی سے انحراف کا تعلق ہے یہ بات قابل قبول نہیں ہے کہ غالب کا انھیں (ملا عبدالصمد کو) "فرضی استاد" کہدینا تعلیم و تعلم نہیں بلکہ "فن شعر" سے تعلق رکھتا ہے۔ غالب کی کسی تحریر سے اس شائبہ خیال کی تائید نہیں ہوتی اس کے برعکس خود مولانا مہر اور مرزا غالب کی مندرجہ بالا تحریریں اس کی مظہر ہیں کہ ملا عبدالصمد سے غالب کا رشتہ "درسیاتی" تھا اس کا تعلق فن شعر اور عروض سے قطعاً نہیں تھا۔ پھر جب اس پس منظر میں کوئی ایسی بات ہی نہیں تھی تو تردید کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

لیکن مولانا مہر کی تحقیق کے مطابق اگر ملا عبدالصمد کے وجود کا تجزیہ کیا جائے تو ملا عبدالصمد کا وجود ہی خطرے میں پڑ جاتا ہے۔ مولانا مہر کا ارشاد ہے۔

"اِن (غالب) کی فارسی تعلیم میں سب سے بڑا حصہ ایک نومسلم ایرانی پارسی کا ہے جسکا ابتدائی نام "ہرمزد" تھا۔ اسلامی نام عبدالصمد رکھا گیا۔ یہ فارسی اور عربی کا متجر عالم تھا۔ ۱۲۲۶ھ (۱۸۱۱ء) میں برسبیل سیاحت آگرہ پہنچا۔ دو برس غالب کے پاس مقیم رہا"

(صفحہ ۲۷۔ غالب)

مولانا مہر نے غالب کے ایک خط مورخہ ۱۸ فروری ۱۸۶۲ء کے حوالے [1]

---

[1] ۱۶ فروری ۱۸۶۲ء کے اس خط میں غالب نے نواب علاء الدین احمد خاں کو لکھا ہے۔ "اے میری جان۔ یہ وہ دلّی نہیں جس میں تم پیدا ہوئے۔ وہ دلّی نہیں جس میں تم نے علم تحصیل کیا۔ وہ دلّی نہیں جس میں تم شعبان بیگ کی حویلی میں مجھ سے پڑھنے آتے تھے۔ وہ دلّی نہیں جس میں سات برس کی عمر سے آتا جاتا ہوں۔ وہ دلّی نہیں جس میں اکیاون برس سے مقیم ہوں۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

(صفحہ ۷۷۔ غالب)

سے غالب کے مستقلاً دہلی میں سکونت اختیار کرنے کا بھی ذکر کیا ہے۔

"غالب نے ۱۸۱۱ء کے قریب جب کہ ان کی عمر چودہ پندرہ برس کی ہو گی دہلی میں سکونت اختیار کی۔" (صفحہ ۷۷۔ غالب)

ظاہر ہے دونوں باتیں بیک وقت صحیح نہیں ہو سکتیں۔ اگر ملا عبد الصمد ۱۸۱۱ء میں بر سبیل سیاحت آگرے پہنچا تھا تو دو برس غالب کے پاس آگرے میں اس کا قیام ہو ہی نہیں سکتا کیونکہ ۱۸۱۱ء کے قریب غالب مستقل طور آگرے کی سکونت ترک کر کے دلی پہنچ چکے تھے۔ غالباً اسی نتیجہ پر پہنچنے کے بعد مولانا مہر نے "نسخۂ مہر" کے مقدمہ میں ترمیم فرما دی۔

"سولہ سترہ" برس کی عمر میں غالب آگرہ کی سکونت چھوڑ کر مستقل طور پر دہلی میں مقیم ہو گئے .... ۱۲۲۶ھ (۱۸۱۱ء) میں ایک نومسلم ایرانی فاضل ملا عبد الصمد بہ طریق سیاحت ہندوستان آئے اور دو برس" آگرے اور دہلی"، میں غالب کے پاس مقیم رہے۔"

(صفحہ ۸۔ نسخۂ مہر)

مذکورہ بالا عبارتوں میں تضاد ہے۔

(۱) ۱۸۱۱ء میں عبد الصمد آگرے پہنچا دو برس غالب کے پاس مقیم رہا۔۔۔ اور یہ کہ اس وقت غالب کی عمر چودہ پندرہ برس تھی۔

(۲) ۱۸۱۱ء میں عبد الصمد وارد ہندوستان ہوئے۔ اور "دو برس آگرہ اور دہلی" میں غالب کے پاس مقیم رہے۔ اس وقت ان کی عمر سولہ سترہ برس کی تھی۔!

مولانا مہر کی مندرجہ بالا تحریرات سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ۱۸۱۱ء میں غالب کی عمر سولہ سترہ برس کی تھی حالانکہ تاریخ ولادت (۲۷ دسمبر ۱۷۹۷ء) کے حساب سے دسمبر ۱۸۱۱ء تک غالب کی عمر چودہ برس سے زیادہ نہیں تھی۔ اور "دو تین برس" کا یہ فرق ایسا نہیں ہے جو تحقیق جدید کی روشنی میں غالبیات پر کام کرنے والوں کے لئے اہمیت نہ رکھتا ہو جب کہ غالب پر تحقیقی کام کرنے والے ایک ایک دن کے فرق کو اہم سمجھتے ہیں۔

مولانا مہر نے اس مقدمہ میں غالبیات سے متعلق بعض ایسے حقائق کا تجزیہ بھی کیا ہے جنھیں غالبیات میں تاریخی اہمیت حاصل ہے؟ "انتخاب کلام غالب" کا واقعہ بھی انھیں حقائق سے تعلق رکھتا ہے جس کا تذکرہ "صاحب آب حیات" نے بھی کیا ہے اور خواجہ حالی نے بھی!۔ مولانا مہر اس واقعہ کو تسلیم نہیں کرتے تحریر فرماتے ہیں۔

"اردو دیوان کی کہانی ۔ غالب کے اردو دیوان کی ترتیب و انتخاب کے متعلق بھی ایک افسانہ "وضع" کر لیا گیا ہے۔ جسے مولانا محمد حسین آزاد مرحوم نے "آب حیات" میں شامل کر کے حقیقت کے درجے پر پہنچا دیا یعنی مولانا فضل حق خیر آبادی اور میرزا خان کوتوال نے درست ہونے کی حیثیت میں غالب کو سمجھایا کہ تمھارے اشعار عام لوگوں کی سمجھ میں نہیں آئیں گے۔ غالب نے کہا۔

اب اتنا کہہ چکا۔ تدارک کیا ہو سکتا ہے انھوں (مولانا اور مرزا خان) نے کہا۔ خیر! ہوا۔ سو ہوا؛ انتخاب کرو اور مشکل شعر نکال ڈالو۔ میرزا نے دیوان حوالے کر دیا۔ دونوں صاحبوں نے دیکھکر انتخاب کیا۔

(آب حیات ص ۵۱۷)

اس اقتباس کا بے سرو پا ہونا کسی تفصیل کا محتاج نہیں۔ غور فرمائیے کہ۔

(۱) اگر شعر کے حسن و خوبی کا تنہا یہی معیار ہوتا کہ وہ عام لوگوں کی سمجھ میں آجائے تو عرفی۔ نظیری وغیرہ کے مقابلے میں ہلالی کا مرتبہ بدرجہا بلند تر ہوتا۔

(۲) یہ کیا قول ہے کہ "اتنا کچھ کہہ چکا تدارک کیا ہو سکتا ہے" اگر مرزا غالب اشعار کی کم حیثیتی کے قائل ہو چکے تھے تو وہ فرماتے ایسے اشعار قلم انداز کر دیئے جائینگے۔ کیا اسے چھاپنا اور شائع کرنا قدرت کی طرف سے لازم ہو جاتا ہے۔

(۳) میرزا خان کوتوال کے بارے میں کچھ معلوم نہیں۔ مولانا فضل حق یقیناً

بڑے عالم تھے لیکن کیا یہ بزرگ اشعار کی اچھائی یا برائی کو میرزا غالب سے بہتر سمجھتے تھے جنھیں قدرت نے شعر گوئی ہی کیلئے پیدا کیا تھا...۔"

(صفحہ ۱۲-۱۳- نسخہ مہر)

مولانا مہر نے "آب حیات" کی تردید میں جو استدلال پیش فرمائے ہیں۔ میں بہایت ادب کے ساتھ عرض کروں گا۔

(۱) عرفی۔ نظیری اور ہلالی کی مثال اس موقع پر منطبق نہیں ہوتی۔ غالب جس اُردو غزل یا ریختہ کے میدان میں فارسی کا شعری مزاج سمونے کی کوشش کر رہے تھے وہ فارسی کی طرح کوئی مستند زبان نہیں تھی بلکہ اردو جیسی کم مایہ زبان تھی جو اس وقت تک فارسی جیسا علمی درجہ حاصل نہیں کر سکی تھی۔ اور اُردو زبان کا ارتقا اسی پر منحصر تھا کہ وہ عوام سے قریب تر ہو جائے۔

(۲) میں مولانا مہر سے درخواست کروں گا کہ اس استدلال پر دوبارہ غور فرمائیں؟ اور وہ بھی اس روشنی میں ۔کہ کیا غالب کے معاصرین میں کوئی دوسرا ایسا نام پیش کیا جا سکتا ہے جس نے اپنے کلام کی نشر و اشاعت سے اتنی دلچسپی لی تھی جتنی غالب نے لی۔ اور کیا غالب کا کوئی ایسا معاصر شاعر اور بھی گذرا ہے جس کی زندگی میں اس کے دیوان کے پانچ ایڈیشن چھپے ہوں۔؟

(۳) مولانا کا تیسرا استدلال مولانا عبدالباری آسی مرحوم کے ان الفاظ کی بازگشت معلوم ہوتا ہے جو اسی انتخاب کے سلسلے میں آسی مرحوم نے کم و بیش چالیس سال ادھر تحریر فرمائے تھے۔ لکھا تھا مولانا آسی مرحوم نے۔

"رہے مولانا فضل حق خیر آبادی۔ وہ فاضل بے عدیل تھے۔ مولوی تھے۔ منطقی تھے۔ مرزا کے دوست تھے۔ غرض سبھی کچھ تھے۔ مگر! میں نہ مانوں گا کہ مرزا کے مشیر شعر و سخن تھے۔ اور مرزا ایسے سیدھے سادے اور بھولے تھے کہ چپکے سے اپنا دیوان اٹھا کے ان کے حوالے کر دیا کہ جو تمہارا جی چاہے کرو۔ جس شعر کو چاہو کاٹ کے پھینک دو اور جس کو چاہو رکھو! اُردو میں تو مولوی فضل حق کے نام مرزا کا شاید کوئی خط ہی نہیں ہے

فارسی میں کچھ پائے جاتے ہیں۔ جن میں سے ایک میں کچھ شعر و شاعری کا بھی ذکر ہے ورنہ وہی رسمی دوستی۔ دوستانہ خطوط سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ زمانہ کی رسم کے موافق مولانا فضل حق بھی فارسی ہی کے شیدا تھے۔ ایک مولوی سے بڑی مشکل کے ساتھ یہ توقع ہوتی ہے کہ وہ اس زمانے میں اردو کا اتنا زبردست ماہر ہو کہ مرزا ایسے شخص کے کلام کا انتخاب کرے اور کرے تو مرزا بے چون و چرا اس پر ایمان بھی لے آئیں — ہرگز نہیں۔؟ ان ہذا شیے عجیب!،، (صفحہ ۹۔ ۱۱ مکمل شرح دیوان غالب۔ مولانا آسی مرحوم)

ان دونوں عبارتوں کو پہلو بہ پہلو رکھکر دیکھا جائے تو مولانا مہر اور مولانا آسی کے استدلال میں سوائے اسلوب بیان کے کچھ زیادہ فرق نہیں ہے۔ دونوں کے نزدیک مولانا فضل حق خیر آبادی صرف ایک "مولوی" تھے اور وہ بھی ایسے سپاٹ مولوی جنھیں اردو شعر سمجھنے کا سلیقہ ہی نہیں تھا۔ اسی کتاب کے پہلے باب میں میں اس مسئلہ پر تفصیل کے ساتھ لکھ چکا ہوں اس لئے اس موقع پر صرف مولانا مہر کی توجہ غالب کے ایک خط کی طرف دلاؤں گا اور بس! یہ خط بنام مولانا فضل حق خیر آبادی "پنج آہنگ" میں شامل ہے میں اس کا اردو ترجمہ "پنج آہنگ" (شائع کردہ انجمن ترقی اردو پاکستان) سے نقل کر رہا ہوں۔

"ہرچند فراموش گشتہ ہوں اور جانتا ہوں کہ دوست مجھے ہیچ سمجھتا ہے۔ لیکن اس پر بھی شکوہ سنج نہیں کہ یہ بھی کیا کم ہے کہ روئے سخن دوست کی طرف ہے فراموشی کے غم جانگداز کو بھلا دینے اور دل کو شکوہ سے باز رکھنے کے لئے یہی کافی ہے۔

از خویشتن بہ ذوق جفا با تو ساختیم
با ما دگر مساز کہ ما با تو ساختیم

ان ہی دنوں خیال ہوا کہ چند شعر توحید پر عرفی کے جواب میں کہے جائیں۔ فکر نے ایک ایسے مقام پر پہنچا دیا جس سے آگے نہ عرفی کا گذر ہو سکتا ہے نہ خود میری رسائی ہو سکتی ہے۔ مجبوراً ان اشعار کو "ایک

ایسی ہستی" کی نذر کر رہا ہوں جو مجھ جیسے سینکڑوں" اور عرفی جیسے ہزاروں
کی سخن پروری کر سکتی ہے اور ہر ایک کے مرتبہ کا تعین کر سکتی ہے"۔
صفحہ ۱۱۴-۱۱۵۔ پنج آہنگ مطبوعات انجمن ترقی اردو پاکستان)

غالب کا یہ قصیدہ عرفی کے اس قصیدے پر کہا گیا ہے جس کا مطلع ہے۔

اے متاع درد در بازارِ جاں انداختہ
گوہر ہر سود در جیب زیاں انداختہ

کہا جا سکتا ہے کہ غالب کا یہ خط ان کے فارسی کلام سے تعلق رکھتا ہے۔؟ لیکن اس کے ساتھ ہمیں یہ نہ بھلانا چاہیئے کہ جس اردو کلام کے انتخاب کا مسئلہ زیر بحث ہے وہ غالب کے "فارسی آمیز" ابتدائے فکر سخن سے تعلق رکھتا ہے اور یہ کہنا غلط ہوگا کہ "قلعہ معلیٰ" کی چہار دیواری کا تربیت یافتہ بچہ" اس عہد کی دلّی میں "سخن فہمی" سے محروم و قاصر تھا جس کے ہر ہر گلی کوچے میں شعر و سخن کی محفلیں سجی رہتی تھیں۔ اور ہمیں یہ بھی نہ بھلانا چاہیئے کہ "فضل حق" اودھ کے ایک ایسے خطے" سے تعلق رکھتے تھے جہاں کا بچہ بچہ" شعری صلاحیتوں سے بھرپور ہوتا ہے۔

"نو دریافت نسخہ امروہہ"

اُردو دیوان غالب کے جو اہم اور معتبر مخطوطے اب تک دریافت ہوئے ہیں ان میں بلاشبہ نو دریافت "نسخہ امروہہ" کو اوّلیت کا شرف حاصل ہے اور اس دریافت کا سہرا امروہہ (ضلع مراد آباد) کے ایک خوش نصیب تاجر کتب جناب توفیق احمد قادری چشتی کے سر ہے جنھوں نے اس کو بھوپال کی اسی سرزمین سے حاصل کیا جو اس سے قبل "نسخہ حمیدیہ" جیسا بیش بہا خزانہ پیش کر چکی ہے۔ جناب توفیق احمد نے اس نسخے کی دریافت کے سلسلے میں اپنے اس "سفر وسیلۃ الظفر" کا ذکر کیا ہے۔ تحریر فرماتے ہیں۔

عالی جناب نادم سیتاپوری صاحب   ۶۹-۶-۱۲

سلام مسنون - عرض یہ ہے کہ آپ کا خلوص نامہ بمعہ "جنگ" کا تراشہ مورخہ ۱۲ر جون ۱۹۶۹ء کو ملا۔ یاد آوری کا تہ دل سے شکریہ۔

صورت یہ ہے کہ میں مورخہ ۳ر اپریل ۱۹۶۹ء کو امروہہ سے دہلی گیا اور اسی تاریخ کو شہر بھوپال گیا۔ ۴ر اپریل ۱۹۶۹ء کو شہر بھوپال پہنچ گیا۔ ۵ر اپریل ۶۹ء کو شہر بھوپال سے یہ دیوان ملا۔ ۶ر اپریل (کو) دہلی آگیا۔

پہلی مرتبہ میں نے اس نسخہ امروہہ کو اخبار "الجمیعتہ" دہلی کے ذریعے ہر خاص و عام کو روشناس کرایا۔ ۱۶ر اپریل ۶۹ء کو پی۔ ٹی۔ آئی (P.T.I) کی نیوز شائع ہوئی۔ ۱۷ر اپریل ۶۹ء کو ہندوستان کے ہندی، انگریزی اردو غرضیکہ ہر زبان کے اخبارات میں اس مخطوطے کی دریافت کا انکشاف ہوا۔

آپ کے حکم کے مطابق نثار احمد صاحب کے مضامین ضرور ضرور روانہ کرتا۔ لیکن اتنے طویل مضامین ہیں (کہ) ان کی نقلیں دشوار معلوم ہوتی ہیں۔ آپ کے اگر علی گڑھ میں کوئی دوست ہوں تو ان کو لکھ دیں "ہماری زبان" حسب ذیل تاریخوں کے روانہ کردیں گے۔

۲۲ر اپریل ۱۹۶۹ء — یکم مئی ۱۹۶۹ء — ۸ر مئی ۱۹۶۹ء — یکم جون ۱۹۶۹ء

کے شمارے آپ منگالیں۔ ان شماروں میں بہت سے لوگوں کے مضامین ہیں۔
میں ان شماروں کو روانہ کردیتا مگر میرے پاس صرف ایک ایک کاپی ہے۔
سب سے پہلے اہم مضمون رسالہ "آجکل" جو نئی دہلی سے نکلتا ہے۔ آپ اس کا
شمارہ ماہ جون ۱۹۶۹ء و ماہ جولائی ۱۹۶۹ء ضرور ضرور تلاش کریں۔ ماہ جون ۶۹ء
میں عالی جناب نثار احمد فاروقی صاحب کا مضمون ہے۔ ماہ جولائی ۱۹۶۹ء میں
عالی جناب قبلہ حضرت مولینا امتیاز علی عرشی رام پوری صاحب کا تفصیلی مضمون
ہے۔ ان مضامین کی بھی بڑی اہمیت ہے۔ یہ دونوں شمارے ۲۴، ۲۵ جون تک
ضرور ضرور منظر عام پر آرہے ہیں اس کا آپ خیال کریں۔ یہی دونوں مضمون اہم۔
"ہماری زبان" (علی گڑھ) میں تو کوئی خاص بات آئی نہیں ہے۔ چونکہ رسالہ
"آجکل" گورنمنٹ آف انڈیا کا رسالہ ہے۔ اس میں تفصیلی مضمون ہے۔

میں بھی آپ کو ماہ جون ۱۹۶۹ء ماہ جولائی ۱۹۶۹ء رسالہ "آجکل" کے شمارے
فوری طور پر روانہ کروں گا۔ احتیاطی طور پر آپ "ہماری زبان" علی گڈھ سے
مذکورہ بالا تاریخوں کے ضرور ضرور فراہم کرلیں۔
آپ نے یہ نہیں بتایا کہ "تراشہ جنگ" کس تاریخ کا ہے۔ اگر ہوسکے تو پورا
ورق روانہ کریں۔ مہربانی ہوگی۔ فقط

توفیق احمد قادری چشتی مالک نیشنل بکڈپو۔
امروہہ ضلع مراد آباد (یوپی) انڈیا

پتہ:۔ عالی جناب نادم سیتاپوری صاحب
معرفت برکاتی دواخانہ۔ 298/A۔ لیاقت آباد۔ ۴۔ کراچی ۱۹ (پاکستان)

اگرچہ توفیق احمد صاحب کے خط میں جناب جلال الدین کا ذکر نہیں ہے لیکن یہ
ایک حقیقت ہے کہ اس دیوان کی دریافت کے سلسلے میں ان کا بھی حصہ ہے! اس نو دریافت
نسخہ کے سلسلے میں جناب جلال الدین نے پاکستان میں جہاں دوسرے افراد کو تفصیلات
بھیجیں۔ مجھے بھی ایک تفصیلی خط تحریر فرمایا۔ چونکہ اس نو دریافت نسخہ کی تفصیلات

کے سلسلے میں ایسے تمام خطوط اور تحریرات ایک دستاویزی اہمیت رکھتی ہیں اس لئے میں جناب جلال الدین مولانا نثار احمد فاروقی اور جناب اکبر علی خاں رامپوری کے وہ تمام خطوط پیش کر رہا ہوں جو ان حضرات نے اس سلسلے میں لکھے ہیں۔

(۱) نقل خط جناب جلال الدین صاحب بنام نادم سیتاپوری

شافی دواخانہ - ۱۲۳ سبزمنڈی الہ آباد - ۷ر جون ۱۹۶۹ء

مخدوم محترم سلام مسنون

آپ سے شرف مکاتبت کی سعادت میں نے ابھی حال ہی میں یعنی غالب کے جشن کی ہنگامہ آرائی کے زمانہ میں حاصل کی تھی لیکن صرف ایک دو خطوں نے وہ تاثر پیدا کیا، ہے جو انشا اللہ کبھی نہ ختم ہو سکے گا۔

آپ کو معلوم کر کے یہ خوشی ہوگی کہ "قدیم ترین دیوان غالب" کی "دریافت" میں نے ہی کیا ہے اور سب سے پہلے میں نے ۱۳ر اپریل کو اسے امروہہ میں دیکھا ۱۴ر کو مولانا عرشی کو اسکی تفصیلات پیش کیں اور اس کے عکس دکھائے جس پر انھوں نے اپنے بیٹے اکبر علی خاں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ "دیکھو جلال الدین تو جبرئیل بن کر آئے ہیں اور کلام غالب لائے ہیں"۔

۱۵ر (اپریل) کو میں نے "قومی آواز" اور نیشنل ہیرالڈ لکھنؤ ناردرن انڈیا پتریکا الہ آباد کو یہ خبر بھیجی جو ۱۶ر اپریل کو میرے حوالے سے شائع ہوئی۔ پھر ۱۶ر (اپریل) ہی کو U.N.T اور P.T.I نے میرا انٹرویو لیکر ساری دنیا میں مشتہر کر دیا اور ریڈیو پر بھی یہ خبر آئی تھی مگر علمی دنیا کی تنگ ظرفی کا یہ حال ہے کہ "ہماری زبان" وغیرہ میں متعدد مراسلے شائع ہو رہے ہیں مگر اس ذرۂ بے مقدار کا ذکر کرتے ہوئے "ماہرین غالب" شرماتے ہیں کہ کہیں اس دریافت کی اولیت کا شرف مجھے نہ حاصل ہو جائے۔

اور بقول غالب
تنگ ظرفوں کا رتبہ جہد سے برتر نہیں ہوتا
حباب مے بصد بالیدنی ساغر نہیں ہوتا

(مذکورہ شعر قلم زد ہے نو دریافت دیوان میں)

میں نے اپنی ناتجربہ کاری اور کم مائگی کے باوجود اس وقت یہ نتیجہ نکالا تھا کہ۔

نو دریافت (النسخہ) دیوان غالب کی ۲۳ سال کی عمر تک کا لگتا ہے جو سرسری اندازہ تھا اور لبفضل تعالیٰ آج بھی وہ پہلا اندازہ صحیح ہے۔ اکبر علی خان اور مولانا عرشی صاحبان نے مختلف شہادتوں اور اپنی کاوشِ فکر سے اس دیوان کی تکمیل کی تاریخ (۱۲ر رجب) ۱۲۳۱ھ نکالی ہے جو کہ غلط ہے۔ غالب نے آخر میں "۱۴ر رجب المرجب یوم سہ شنبہ" سنہ ہجری" درج کیا ہے۔ سنہ ہجری کے ہندسے درج نہیں کئے لیکن پھر بھی دن اور تاریخ لکھ کر غالب نے، یہ کام آسان کر دیا ہے آپ قدیم تقویم سے سال تکمیل دیوان نکال سکتے ہیں۔ میں نے ۱۷ر اپریل ۱۸۲۱ء یا (۱۴ر رجب) ۱۲۳۶ھ نکالا ہے جو درست ہے۔ اور اپنی تاریخ کو ذہن میں رکھتے ہوئے ایک مفصل مضمون سپردِ قلم کیا ہے جو "اردوئے معلیٰ" دھلی یونیورسٹی اور "نقوش" میں شائع ہوگا۔ کافی مفصل مضمون ہے اس دریافت پر ایک مختصر سا تعارفی مضمون روانہ ہے جو "قومی زبان" میں اشاعت کے لئے علیحدہ سے روانہ کرتا ہوں اور یقین کرتا ہوں کہ وہاں کے لوگ یہاں کے حضرات سے فراخ دل ہونگے اور ضرور شائع کریں گے جواب ضرور دیں اور جلد۔ فقط

مضمون کو مشفق خواجہ کے نام سے روانہ کرتا ہوں۔

کیا وہاں پر اردو میں کوئی تقویم ملتی ہے۔؟ (نیازمند۔ جلال الدین)

پتہ:۔ جناب نادم سیتاپوری صاحب۔ معرفت انجمن ترقی اردو پاکستان۔ کراچی

---

(۲) نقل خط مولانا نثار احمد فاروقی بنام نادم سیتاپوری

چاہ غوری امروہہ ضلع مرادآباد

۱۳ر جون ۱۹۶۹ء

مجبی۔ تسلیمات!

ایک دن مکتبہ جامعہ اردو بازار (دہلی) میں بڑا سا جست کا صندوق دیکھ کر میں نے دریافت کیا کہ اس میں کیا ہے؟ تو معلوم ہوا کہ نادم سیتاپوری صاحب کی ملکیت ہے وہ پاکستان جا رہے ہیں۔ میں نے پوچھا کہاں ملیں گے؟ تو اربابِ جامعہ نے لاعلمی کا اظہار کیا۔ اگلے دن شام کو اس ارادہ سے نکلا کہ آپ کو تلاش کروں گا۔ نو بجے تک

اردو بازار میں رہا۔ آپ سے ملاقات نہ ہو سکی۔ واپس آیا تو کمرہ پر آپ کا انگریزی وزیٹنگ کارڈ موجود تھا اور ہمارے پڑوسی مولانا عبداللطیف صاحب نے بتایا کہ آپ آج ہی پونے نو بجے کی ٹرین سے چلے گئے ہیں۔ ملاقات نہ ہو سکنے کا بہت افسوس ہوا۔

آج توفیق احمد صاحب نے آپ کا بھیجا ہوا خط اور "جنگ" کی کٹنگ دکھائی۔ اس سے مجھے یہ فائدہ ہوا کہ آپ کا پتہ مل گیا۔ اب آپ لکھئے کہ کہاں مقیم ہیں۔ کیا کر رہے ہیں؟ کب تک واپس آنے کا ارادہ ہے۔؟ کن حضرات سے ملاقاتیں رہتی ہیں۔ دیوان غالب کا جو مخطوط توفیق احمد کو دستیاب ہوا ہے اس کے بارے میں "ہماری زبان" میں ہر ہفتے کچھ نہ کچھ آرہا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ آپ کی نظر سے یہ اخبار نہیں گذرتا۔ انجمن ترقی اردو کے دفتر میں ۲۲ر اپریل کے بعد کے سب پرچے دیکھ لیجئے۔ جون ۱۹۶۹ء کے رسالہ "آجکل" میں اس پر تفصیل سے میں نے لکھا ہے اور جولائی ۱۹۶۹ء کے شمارے میں عرشی صاحب قبلہ کا مضمون آرہا ہے۔ اپنے مضمون کا ایک OFF. PRINT آپ کی خدمت میں بھیجوں گا نسخے کے سلسلے میں بیشتر معلومات آپ کو ان مضامین سے حاصل ہو جائیں گی۔ پھر بھی اپنی کتاب کے لئے آپ کو مزید معلومات درکار ہوں تو مجھے لکھئے انشاءاللہ فراہم کی جائیں گی۔

میں نے "آجکل" والا مضمون تو سرسری لکھا تھا اس میں بعض غلطیاں بھی رہ گئی ہیں لیکن اس پر مکمل تفصیلات کے ساتھ جو مضمون لکھا گیا ہے وہ میری زیر طبع کتاب میں آئیگا اس کی ایک جلد آپ کو بھیج دونگا۔ یہ ابھی طباعت کے مراحل سے گذر رہی ہے۔

"غالب کے کلام میں الحاقی عناصر" کون چھاپ رہا ہے! کیا اس میں ہندوستانی ایڈیشن سے کچھ باتیں زائد بھی ہوں گی۔

محترم رئیس امروہوی صاحب سے ملاقات ہو تو "اہل امروہہ" کا عموماً اور میرا خصوصاً سلام شوق پہنچا دیں۔ "جون ایلیا" سے بھی آپ کی ملاقات ہوتی ہوگی۔؟

نسخہ امروہہ کے بارے میں آپ کو جو معلومات درکار ہوں لکھئے؛ والسلام

خیر طلب: نثار احمد فاروقی

پتہ۔ بخدمت جناب نادم سیتاپوری معرفت برکاتی دواخانہ، 298/A لیاقت آباد ۱۹، کراچی ۱۹

(۳) نقل خط جناب اکبر علی خاں رامپوری بنام نادم سیتاپوری

رام پور رضا لائبریری
فون: ۳۸۵ حوالہ.....
رام پور
تاریخ - ۱۳ر جون ۱۹۶۹ء

مکرم بندہ - تسلیم

ابّا (حضرت مولانا عرشی) تقریباً سال بھر سے وجع قلب میں مبتلا ہیں۔ درمیان میں طبیعت بہت ٹھیک ہوگئی تھی مگر کثرت کار اور دماغی بار سے پھر ۲۹ر سے مرض عود کر آیا اس لئے جواب میں لکھ رہا ہوں۔

دعا فرمائیے کہ ابّا جلد رو بصحت ہوں۔

نودریافت نسخہ غالب بھوپال سے ایک تاجر کتب نے جو امروہہ کے رہنے والے ہیں خریدا ہے "سہ شنبہ ۱۴ر رجب" (۱۲۳۱ھ) کا مکتوبہ ہے اور تمام نسخہ بخط غالب ہے۔ گویا نقل کے وقت غالب کی عمر ۱۹۔ برس تھی۔ فارسی اور اُردو کے بڑے شاعروں میں یہ تنہا مثال ہے کہ مکمل دیوان بخط مصنف ملا ہو۔

ابّا کا مضمون جولائی کے "آجکل" میں آرہا ہے۔ اس سے پہلے جون (۱۹۶۹ء) کے "آجکل" میں نثار احمد فاروقی کا مضمون آرہا ہے۔ شاید انھوں نے اسے ۱۲۳۳ھ کا قرار دیا ہے مگر یہ غلط ہے اس کے دلائل میرے مضمون میں آئیں گے جو ہند و پاک دونوں جگہ شائع ہوگا۔

آپ کب تک واپس تشریف لا رہے ہیں "ہماری زبان" مشفق خواجہ صاحب کے پاس دیکھئے۔

(حاشئے پر) سنہ مخطوطے میں نہیں ہے مگر قوی قرائن سے ۱۲۳۱ھ ثابت ہوتا ہے۔

والسلام - اکبر

پتہ - بخدمت شریف جناب نادم سیتاپوری صاحب بالقابہ
معرفت: حکیم محمود احمد برکاتی 298/A - لیاقت آباد ۴ کراچی ۱۹
W.PAK

جناب جلال الدین نے اس مخطوطے کے سلسلے میں جو مضمون بھیجا تھا وہ "روزنامہ

جنگ" کراچی (سنڈے ایڈیشن) ۳۰ جون ۱۹۶۹ء میں شائع ہوا۔ اور یہ پہلا مضمون ہے جس نے سب سے پہلے اس نو دریافت مخطوطے کا تعارف پاکستان سے کرایا۔! اس کے بعد ۷ جولائی ۱۹۶۹ء کو جناب مسلم ضیائی نے اپنے مضمون "غالب کے قدیم ترین دیوان کی دریافت کے بارے میں" (مطبوعہ "جنگ کراچی" ۷ جولائی ۱۹۶۹ء) اس کی وہ تفصیلات بھی پیش کردیں جو مولانا نثار احمد فاروقی کے مندرجہ ذیل مضمون میں شامل ہیں۔

"۸ اپریل ۱۹۶۹ء کو امروہہ کے ایک تاجر کتب جناب توفیق احمد قادری چشتی (مالک نیشنل بک ڈپو) نے دیوان غالب کا ایک اہم مخطوطہ دریافت کیا ہے۔ جسے غالبیات کے سلسلے میں تاریخی حیثیت حاصل رہے گی، اور غالب کی شاعری کا تحقیقی مطالعہ کرنے والوں کی نظر میں اس دیوان کو وہی اہمیت دی جائے گی جو نسخۂ حمیدیہ، نسخۂ شیرانی، اور گل رعنا (انتخاب دیوان غالب) کا حصہ ہے۔

اس دیوان کی چند ممتاز خصوصیات یہ ہیں۔

(الف) یہ نسخہ تمام تر غالب کے قلم کا لکھا ہوا ہے۔ صرف اوراق کے حاشیے پر بعد میں کسی دوسرے قلم نے چند غزلوں کا اضافہ کیا ہے

(ب) یہ نسخہ (جسے بعد میں نسخۂ امروہہ کہا جانے لگا) اُس دور کا کلام پیش کرتا ہے، جب غالب صرف اسد تخلص کرتے تھے۔ بعض غزلوں میں انھوں نے مقطع تبدیل کیا ہے اور اسد کی جگہ غالب وزن میں بٹھانے کی کوشش کی ہے۔ لیکن یہ زمانہ مابعد کی تبدیلی معلوم ہوتی ہے۔

(ج) اس میں وہ کلام ہے جو ۲۰ - ۲۱ سال کی عمر میں غالب نے لکھا تھا۔ اور اسے دیکھ کر معلوم ہو جاتا ہے کہ نسخۂ حمیدیہ اس کا نقش ثانی ہے۔ یعنی نسخۂ امروہہ میں اشعار کی روایت حمیدیہ سے مختلف ہے۔ اور اس میں جن مصرعوں یا اشعار کو غالب نے تبدیل کیا ہے۔ وہ نسخۂ حمیدیہ میں موجود ہیں۔ مگر جن اشعار کو قلم زد کردیا ہے وہ کسی نسخہ میں نہیں ہیں۔

(د) اس طرح نسخۂ امروہہ میں تقریباً پندرہ غزلیں قطعاً غیر مطبوعہ ہیں جو نہ

---

۱ جناب توفیق احمد کے بیان کے مطابق یہ مخطوطہ انھیں ۷ اپریل ۱۹۶۹ء کو حاصل ہوا (نادم سیتاپوری)

نسخۂ حمیدیہ میں ہیں اور نہ نسخۂ شیرانی میں، نہ اس کے بعد مرتب ہونے والے اور چھپنے والے کسی ایڈیشن میں شامل ہیں۔

(ک) اس نسخے پر رقیمہ کی عبارت موجود ہے جو آئندہ نقل کی جائے گی۔ لیکن سن نہیں لکھا، شاید سہواً رہ گیا ہے، یا جس طرح ابتدائی اوراق کے متعدد مقطعوں میں لفظ "اسد" کی جگہ شنگرفی روشنائی سے لکھنے کے لئے چھوڑ دی گئی ہے، اسی طرح ممکن ہے سنہ کے اعداد بھی شنگرفی روشنائی سے لکھنے کا ارادہ ہو، اس لئے ترک کردیا گیا ہو۔

(د) بظاہر نسخۂ حمیدیہ کا مبیضہ اسی نسخے سے تیار رہوا ہے، اس پر دو باتیں شاہد ہیں۔ ایک تو جن اشعار میں ترمیم و اصلاح کی گئی ہے وہ اصلاحی شکل میں نسخۂ حمیدیہ میں موجود ہیں۔ دوسرے جن غزلوں پر خطِ تنسیخ کھینچ دیا گیا ہے وہ حمیدیہ سے غیر حاضر ہیں۔ ورق ۲۸۔ الف پر ایک جگہ وسط صفحہ پر اشعار کے نیچے لکھا ہے: "تا ایں جا نوشتہ ام"۔ اور دوسری سطر میں لکھا ہے: "ازیں جا شروع"۔ جلال الدین صاحب (آرکایوز۔ الہ آباد) جنھوں نے اس نسخے کو ملاحظہ فرما کر پریس ٹرسٹ آف انڈیا کو خبر دی تھی، غالباً اِن الفاظ سے مغالطے میں مبتلا ہوگئے اور انھوں نے یہ سمجھ لیا کہ اس مقام تک غالب کا قلم ہے بعد میں کسی دوسرے شخص نے دیوان لکھا ہے۔ حالانکہ یہ بالکل بدیہی بات ہے کہ (حاشیے کی غزلوں کو چھوڑ کر) متن کتاب میں اوّل سے آخر تک ایک ہی قلم ہے۔ میں نے مندرجۂ بالا مختصر جملوں سے یہ نتیجہ برآمد کیا ہے کہ نسخۂ امروہہ میں ترمیم و تنسیخ کرنے کے بعد غالب نے نسخۂ حمیدیہ کا متن تیار کرنا شروع کیا۔ اور جہاں "تا ایں جا نوشتہ ام" لکھا ہے وہاں تک نسخۂ حمیدیہ کو اپنے قلم سے نقل کیا، بعد میں انھیں کوئی کاتب مل گیا تو اسے یادداشت کے طور پر "ازیں جا شروع"، لکھ کر نسخۂ امروہہ حوالے کردیا۔ ورنہ یہ نسخہ دو کاتبوں کا لکھا ہوا نہیں ہے

(م) اس سے ایک بات اور ظاہر ہوگئی۔ نسخۂ حمیدیہ جس قلمی نسخے پر مبنی ہے وہ فوجدار محمد خاں (بھوپال) کے کتب خانے سے برآمد ہوا تھا اور اب مفقود ہوچکا ہے۔ اس میں یہ ابتدائی غزلیں غالب کے قلم سے نہیں تھیں، بلکہ جن اصلاحوں کے بارے میں مرتب نسخۂ حمیدیہ نے یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ غالب کے اپنے ہاتھ

کی ہوئی ہیں ان کا پایۂ اسناد بھی مشتبہ ہے۔ نسخۂ حمیدیہ کی پہلی نقل کا کچھ حصّہ غالب نے خود نقل کیا تھا۔ لہٰذا یہ نسخہ بھی کہیں موجود ہوگا اور ممکن ہے کبھی نہ کبھی سامنے آجائے۔

(ک) نسخۂ حمیدیہ کا اصل مخطوطہ تو ضائع ہو ہی چکا، اب اس کے اشعار کے سلسلے میں ہمیں مفتی انوار الحق صاحب کے بیان پر مکمل بھروسہ کرنا پڑتا ہے اور کوئی ذریعہ ان اشعار کی تصحیح کا نہیں تھا لیکن نسخۂ امروہہ کے برآمد ہونے سے غالب کے بہت سے اشعار بھی بامعنی ہوگئے ہیں اور ان کا مفہوم بھی سمجھ میں آنے لگا ہے۔ یعنی اب نسخۂ حمیدیہ کی غزلوں اور اشعار کی تصحیح نسخۂ امروہہ کی روشنی میں کی جائے گی۔

چند مثالیں لکھتا ہوں۔

اس شعر کا مطلب لاکھ سر مارنے پر بھی میری سمجھ میں نہیں آتا تھا۔

گداز سعی بنیش شست وشو سے نقشِ خود کامی[1]
سراپا شبنم آئیں اک نگاہ پاک باقی ہے

نسخۂ امروہہ میں یہ اس طرح ہے۔

گداز سعی بنیش شست وشوی نقشِ خود کامی

اب شعر صاف ہوگیا اور اہمال کا احتمال جاتا رہا۔ اسی طرح دوسرا شعر ہے:

بعجز آبادِ وہم مدعا تسلیم، شوخی ہے[2]
تغافل کو نہ کر معزولِ تمکیں آزمائی کا

نسخۂ امروہہ میں معزول کی جگہ مغرور ہے، اور اس سے شعر میں مطلب زیادہ واضح ہوجاتا ہے۔ یا ان اشعار کو دیکھئے۔ نسخۂ حمیدیہ میں یوں ہیں۔

نزاکت ہے فسونِ دعویٔ طاقت شکستن ہا[3]
شرارِ سنگ، اندازِ چراغ از جسم (خستن) ہا (جستن)

سیہ مستی چشم شوخ سے ہیں جوہر مژگاں
شرار آسا زسنگ سرمہ یکسر (بارجستن)، ہا (تازجستن)

ہوا نے ابر سے کی موسم گل میں نمدبافی
کہ تھا آئینہ خور بے نقاب (رنگ) لبستن ہا (زنگ)

[1] نسخۂ عرشی، ۱۰۷ [2] نسخۂ عرشی/ ۱۹ [3] نسخۂ عرشی/ ۲۲

عیادت ہائے طعن آلودِ یاراں زہرِ قاتل ہے[1]
رفوئے زخم (کرتی ہے) بنوکِ نیشِ عقرب ہا (کرتے ہیں)

داغِ مہرِ ضبط بے جا مستی سعی الپسند[2] (سپند)
دودِ مجمر لالہ ساں دردِ تہ پیمانہ تھا

خموشی خانہ زادِ چشم بے پروا نگاہاں ہے[3]
غبارِ سرمہ یاں گرد سواد (برگستاں) ہے (نرگستاں)

دیوانگاں ہیں حاملِ رازِ نہانِ عشق[4]
اے بے تمیز گنج (کو پروانہ) چاہیے (بویرانہ)

حسن و رعنائی میں (رو ہم) صد سرو گردن میں فرق[5] (باہم)
سرو کے قامت پہ گل یک دامن کوتاہ ہے

یہ سرسری نظر میں دیکھ کر چند اشعار بطور مثال لکھے گئے ہیں۔ اور ان کی جو شکل نسخۂ امروہہ میں ہے وہ علیحدہ قوسین میں ظاہر کردی گئی ہے۔ اس سے یہ اندازہ کرنا دشوار نہیں ہے کہ اس نسخے کی روشنی میں نسخۂ حمیدیہ کا مکمل متن نظر ثانی کا محتاج ہے اور بہت سے اشعار کے مہمل ہونے کا الزام غالب کے سر سے اٹھ جاتا ہے۔

(و) ایک اور اہمیت نسخۂ امروہہ کی یہ ہے کہ اس سے نسخۂ حمیدیہ کی اولیّت کا نظریہ ختم ہوجاتا ہے۔ اس نسخے میں جو کلام ہے وہ فارسی آمیزی اغلاق اور مشکل پسندی کے اعتبار سے نسخۂ حمیدیہ پر بھی فوقیت رکھتا ہے۔ نسخۂ امروہہ کا غائر مطالعہ ثابت کریگا کہ غالب فارسیت سے کس طرح اپنا دامن بچاتے گئے ہیں۔ متداول دیوان میں جو چند اشعار انھوں نے بطور نمونہ چھوڑ دیئے تھے وہ بھی ابتدائی دور کے کلام کی اصلاح یافتہ شکل تھے۔

---

[1] نسخۂ عرشی /۲۳ [2] نسخۂ عرشی /۲۵ اسی طرح صفحہ ۱۲ سطر ۲ میں سعی پند نہیں سعی سپند ہے۔ [3] نسخۂ عرشی /۸۱ [4] نسخۂ عرشی /۸۲ [5] نسخۂ عرشی /۹۲

یہاں کچھ مثالیں پیش کرتا ہوں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ نسخۂ حمیدیہ کی ترتیب سے پہلے غالبؔ نے کس طرح کے شعر کہے ہیں۔ اور پھر انھیں کیا اصلاح کرنے کے بعد نسخۂ حمیدیہ میں شامل کیا۔ اشعار نسخۂ امروہہ سے لئے گئے ہیں۔ اور ان کے سامنے قوسین میں وہ شکل لکھی ہے جو نسخۂ حمیدیہ یا نسخۂ شیرانی میں ملتی ہے۔

۱۔ (باستقبال تمثال زماہ اختر فشاں شوخی)
تماشا کشور آئینہ میں آئینہ بند آیا
(مہِ اختر فشاں کی، بہر استقبال آنکھوں سے)

۲۔ تغافل بدگمانی (رہا نظر) برسخت جانی (رہا)[1]
نگاہ بے حجاب ناز کو بیمِ گزند آیا
(تغافل، بدگمانی، بلکہ میری سخت جانی سے)

۳۔ (سوادِ چشم) بسمل (انتخاب نقطہ آرائی)[2]
خرام ناز بے پروائیِ قاتل پسند آیا
(روانی ہائے موجِ خونِ بسمل سے ٹپکتا ہے
کہ لطفِ بے تحاشا رفتن قاتل پسند آیا)

۴۔ اگر آسودگی ہے مدعائے رنج (کوشش ہا)
(بے تابی)

۵۔ نہیں در پردہ حسن از کوششِ مشاطگی غافل[3]
(کرے ہے حسنِ خوباں پردے میں مشاطگی اپنی)

۶۔ (شب کہ باندھا یار نے پیمان در خواب آمدن)[4]
(شب کہ باندھا خواب میں آنے کا غافل نے جناح)

۷۔ (گویا)[5] صحرا غبار دامنِ دیوانہ تھا
(تو کہے)

۸۔ جوشِ بے کیفیتی ہے۔ اضطراب (اندیش اسد)[6] (اضطراب آرا)
ورنہ بسمل کا (طپیدن) لغزشِ مستانہ تھا (تڑپنا)

---

[1] نسخۂ عرشی/۱۱ [2] نسخۂ عرشی/۱۲ [3] نسخۂ عرشی/۲۳ [4] نسخۂ عرشی/۲۵ [5و6] نسخۂ عرشی/۲۵

غالباً ان مثالوں کی روشنی میں واضح ہو جائے گا کہ نسخۂ حمیدیہ کتنی حک و اصلاح اور ترمیم و تنسیخ کے بعد مکمل ہوا ہے۔

(ز) ایک اور غلط فہمی نسخۂ امروہہ کی دریافت کے بعد دور ہو جانی چاہئے۔ یہ جو سمجھا جاتا ہے کہ غالب کا متداول دیوان مولانا فضل حق خیر آبادی اور مرزا جانی کوتوال کی فرمائش بلکہ فہمائش سے تیار ہوا۔ اسے ذرا احتیاط کے ساتھ قبول کیا جائے۔ ان حضرات کے مشورے یا غالب کے دوسرے احباب کی صلاح ممکن ہے کسی حد تک معاون ثابت ہوئی ہو، لیکن یہ بالکل عمر کی پختگی کے زمانے میں ہوا۔ اور نسخۂ امروہہ کی ترتیب یقیناً ۱۸۱۶ء اور ۱۸۱۸ء کے درمیان ہو چکی تھی۔ اس وقت غالب آگرہ سے نووارد تھے۔ اور ان حضرات سے ملاقات کئی برس کے بعد ہوئی ہے۔

نسخۂ امروہہ میں جو کاٹ چھانٹ ہے۔ اسے دیکھئے، پھر نسخۂ حمیدیہ، اور اس سے آگے بڑھ کر نسخۂ شیرانی اور گل رعنا کو دیکھئے۔ بلکہ نسخۂ امروہہ سے لیکر نظامی پریس کانپور میں طبع ہونے والے ایڈیشن تک جو غالب کی زندگی میں شائع ہونیوالا آخری ایڈیشن ہے۔ حک و اصلاح اور ترمیم و تبدیل کا عمل برابر جاری رہا ہے، ایسا محض احباب کے مشورے سے نہیں، خود اپنے بالغ تنقیدی شعور اور جمالیاتی احساس کی وجہ سے ہی ممکن ہے اور اس ارتقا کا کریڈٹ خود غالب کو ملنا چاہیئے۔

(ح) ایک نمایاں خصوصیت اس نسخے کی اور بھی ہے جس میں دوسرا کوئی قلمی یا مطبوعہ نسخۂ دیوان، اس کا شریک یا حریف نہیں ہے یعنی اس میں غالب نے کچھ غزلیں بالکل حذف کر دی ہیں اور ان پر خط تنسیخ کھینچ دیا ہے، یا غزلوں کے بعض اشعار ساقط کر دیئے ہیں۔ ایسے اشعار کی تعداد دو سو کے لگ بھگ ہوگی۔ یہ سب غیر مطبوعہ ہیں اور اس نسخے کی اشاعت کے ساتھ پہلی بار منظر عام پر آئیں گے۔

اب نسخے کی کیفیت عرض کرتا ہوں۔

یہ نسخہ بہت اچھی حالت میں ہے۔ اس میں ۵ × ۷ کے ۶۳ اوراق ہیں۔ ہر صفحے پر اوسطاً تین کالم بناتے ہیں اور ہر کالم میں تقریباً ۹ سطریں ہیں۔ ورق ۱۔ب شنگرفی روشنائی سے لکھا ہے۔

یا علیؑ المرتضیٰ علیہ وعلی اولادہ الصلاۃ والسلام

یا حسنؑ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم یا حسینؑ

ابو المعالی میرزا عبد القادر بیدل رضی اللہ عنہ

اس کے بعد پہلا شعر ہے ؎

نقش فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکر تصویر کا

غزلوں کی کل تعداد (۲۶۰) ہے۔ اس میں ایک زمین کا صرف ایک شعر اور دوسری زمین کا صرف ایک مصرع ملتا ہے۔ میں نے اسے بھی پوری غزل شمار کیا ہے۔ اگر اسے ساقط کر دیا جائے تو تعداد غزلیات (۲۵۸) ہو جائے گی۔

ردیف وار تمام اشعار کا خاکہ یہ ہے (پہلا ہندسہ تعداد غزلیات اور دوسرا تعداد اشعار ظاہر کرتا ہے)

الف ۳۱۵/۵۳، ب ۱۲/۲، ت ۱۱/۲، ث ۱۳/۲، ج ۱۴/۲، چ ۱۴/۲، ح ۵/۱، د ۲۸/۴، ر ۴۴/۷، ز ۴۴/۷، س ۱۶/۳، ش ۱۴/۲، ع ۱۱/۲ غ ۱۱/۲، ف ۱۱/۲، ک ۵/۱، گ ۹/۱، ل ۳۳/۵، م ۳۵/۵، ن ۱۷۵/۲۶ و ۵۰/۷، ہ ۹۴/۸، ی ۷۰۳/۱۱۳،

غزلیات کے خاتمے پر لکھا ہے "تمت تمام شد غزلیات بعونہ اللہ تعالیٰ فقط"۔

اس کے بعد دوسرے کالم پر "عنوان صحیفہ رباعیات" لکھ کر پہلے فارسی کی ۱۳ رباعیاں درج کی ہیں۔ جن میں سے صرف ایک رباعی مطبوعہ کلیات فارسی میں ملتی ہے۔ باقی ایک درجن غیر مطبوعہ ہیں۔ اور کلیات فارسی، سبد چین، سبد باغ دو در، کسی مجموعے میں شامل نہیں ہیں۔

رباعیات فارسی کے بعد ۱۱ رباعیاں اردو کی ہیں۔ ان میں دس تو مطبوعہ ہیں اور ایک رباعی غیر مطبوعہ ہے۔ جو نسخۂ عرشی میں نہیں ہے۔ اگر رباعی کے اشعار کی تعداد بھی شامل کر لی جائے تو غزلیات و رباعیات کے اشعار کی مجموعی تعداد ۱۷۱۳ ہو جاتی ہے

زیر بحث نسخۂ امروہہ کا خط شکستہ شفیعا آمیز بہت روشن اور پاکیزہ ہے

اور غلطیوں سے پاک ہے۔ جتنا حصّہ اس نسخے کا میں پڑھ سکا ہوں اس میں صرف دو جگہ ایسا محسوس ہوا کہ سہو کتابت سے کوئی لفظ چھوٹ گیا ہے۔ املا کی غلطی عموماً نہیں ہے۔ ایک جگہ سہواً "کثافت ہا" کو "کثافتہا" لکھا ہے۔ اس نسخے کو دیکھ کر یقین ہو جاتا ہے کہ بچپن میں غالب نے خوش نویسی کی باقاعدہ تعلیم حاصل کی تھی۔ ان کے خط کی یک رنگی اور پاکیزگی اس پر گواہ ہے۔

اس نسخے کا املا وہی ہے جو تمام عمر غالب کا معمول رہا۔ چند مثالیں لکھتا ہوں غالب الف کے بعد آنے والے حرف د کو الف سے ملا دیا کرتے تھے۔ مثلاً زیادہ، فریادی وغیرہ۔ وہ حالت اس میں موجود ہے۔ دو کو وہ مخصوص انداز میں ملا کر لکھتے ہیں ت، ب وغیرہ اس طرح بناتے ہیں کہ وہ پچھلے حرف کے مقام وصل پر تو چوڑی معلوم ہوتی ہے بعد میں خنجر کی شکل بنتی چلی جاتی ہے۔ اور اس کا شوشہ تو بہت ہی باریک ہو جاتا ہے۔ یہی حالت اس میں ملے گی۔ بعض الفاظ وہ عموماً ملا کر لکھیں گے جیسے "خدمتیں" "قفسمیں" وغیرہ۔ تنہا آنے والی یائے معروف کو سامنے کی طرف پھیلتی ہوئی لکھتے تھے۔ یا کسی حرف کے ساتھ مل کر آنے والی یائے مجہول کو خاص انداز سے موڑتے ہیں۔ جس سے مقام اتصال پر نیم بیضوی شکل بن جاتی ہے۔ غرض یہ کہ غالبؔ کے املا کی جو ممتاز خصوصیات ہیں وہ سب اس نسخے کی تحریر میں موجود ہیں۔

مگر اسے غالب کا تحریر کردہ نسخہ متعین کرنے اور ان کے املا کی جانچ کرنے سے پہلے ایک بات خاص طور سے ملحوظ رکھنا ہوگی، وہ یہ کہ ہمارے سامنے ان کی جو تحریریں ہیں اور جن سے عموماً ہماری نگاہیں مانوس ہیں، وہ ادھیڑ عمر کی یا بڑھاپے کی ہیں۔ اور یہ نسخہ بھرپور جوانی کے زمانے میں لکھا گیا ہے۔ جب غالب کی عمر ۲۰-۲۲ سال سے زائد نہ ہوئی۔ عمر کے ساتھ ساتھ انسان کے خط میں بھی خاصا فرق پیدا ہو جاتا ہے۔ جوانی کی عمر میں کتابت کے وقت ہاتھ خوب جم کر لکھتا ہے اور ہر حرف کی نوک پلک صاف اور روشن ہوتی ہے، قویٰ میں اضمحلال کے ساتھ ساتھ ہاتھ کی گرفت کمزور ہو جاتی ہے، اور حروف کی نشست میں وہ جماؤ نہیں رہتا جو عالمِ شباب میں تھا۔ اس لئے عام انسان بھی جسے خط شناسی کی کوئی خاص تربیت یا مشق حاصل

نہ ہو ایک بوڑھے اور ایک جوان کے خط میں واضح فرق محسوس کرے گا۔

اگر ان امور کو مدّنظر رکھا جائے تو یہ فیصلہ کرنے میں تاخیر نہیں ہوگی کہ یہ نسخہ غالب ہی کے قلم سے لکھا ہوا ہے۔ نسخہ امروہہ کے بخط غالب ہونے کا دوسرا ثبوت اس کا ترقیمہ ہے:۔

"تمت تمام شد۔ بتاریخ چاردہم رجب المرجب یوم سہ شنبہ "سنہ ہجری" وقت دوپہر روز باقیماندہ فقیر بیدل اسد اللہ خاں عرف میرزا نوشہ متخلص بہ اسد عفی اللہ عنہ از تحریر دیوان حسرت عنوان خود فراغت یافتہ بہ فکر کاوش مضامین دیگر رجوع بہ جناب روح میرزا علیہ الرحمۃ آورد۔ فقط"

اس دیوان کے آغاز میں "یا علیؑ" یا حسنؑ، یا حسینؑ" کے الفاظ اور اس ترقیمے میں "فقیر بیدل" یا "عفی اللہ عنہ" کا اندراج بعض حضرات کے ذہن میں شک پیدا کرسکتا ہے لیکن مجھے یہ الفاظ اتنے اہم معلوم نہیں ہوتے کہ ان کی وجہ سے کسی تحریر کو مرزا کی تحریر ہی نہ سمجھا جائے۔ انسان کا ذہن و افکار بہت سے تقلبات سے گذرتے ہیں، غالب عقیدے کے اعتبار سے اثنا عشری تھے اور ابتداء میں میرزا عبدالقادر بیدل کے انداز سے غیر معمولی طور پر متاثر تھے۔ یہ دونوں باتیں ان الفاظ سے ثابت ہوتی ہیں۔ رہا یہ کہ انھوں نے بعد میں کبھی اس طرح کے الفاظ اپنی تحریروں میں نہیں لکھے۔ تو بیدل کا تاثر بعد میں کم ہو چکا تھا۔ اور اس کی تقلید کا خیال مرزا نے آہستہ آہستہ ترک کردیا تھا۔ مگر عبارت کے خاتمے پر بارہ کا ہندسہ وہ آخر تک لکھتے رہے۔ یہ بحساب ابجدی "حد" کے اعداد بھی ہیں، اور ائمہ کرام کی تعداد بھی۔ غالب نے خود ایک خط میں لکھا ہے:

"صاحب بندہ اثنا عشری ہوں۔ ہر مطلب کے خاتمے پر بارہ کا ہندسہ کرتا ہوں۔ خدا کرے میرا بھی خاتمہ اسی عقیدے پر ہو[1] ۱۲"

اس طرح کے اور بھی حوالے غالب کی تحریروں میں جابجا ملیں گے جن سے ان کی عقیدت اور محبت اہل بیت اطہار کا اندازہ ہوتا ہے۔ صرف لکھنے کا انداز بعد میں تبدیل ہوگیا کہ سرنامے پر "یا حسنؑ یا حسینؑ" نہ لکھا، عبارت کے خاتمے پر ۱۲ کا ہندسہ کردیا۔

---

[1] مہر خطوط غالب / ۲۲۱

ترقیمے کا ہندسہ یہ بتاتا ہے کہ غالب نے تقلید بیدل میں اپنا پہلا دیوان یہی مرتب کیا تھا اور اس کی حد سے بڑھی ہوئی فارسی لَے نے بعد میں خود انھیں مجبور کیا کہ اسے ہلکا کریں۔ چنانچہ فارسی کے مصدر تک وہ بے تکلف استعمال کرتے ہیں۔ اور تڑپنا کی جگہ "بسمل کا طپیدن" لکھتے ہیں ـــــ خود انھوں نے حکِّ اصلاح کے بعد "نسخہ حمیدیہ" تیار کیا، اور جب وہ یا اُن کے احباب اس سے بھی مطمئن نہیں ہوئے تو متداول دیوان کی ترتیب وجود میں آئی۔

اب یہ سوال باقی رہ جاتا ہے کہ نسخۂ امروہہ کی ترتیب اور کتابت کا سنہ کیا ہے؟ ترقیمہ کی عبارت میں تاریخ تو درج ہے مگر بدقسمتی سے سنہ کے اعداد لکھنے سے رہ گئے ہیں۔ ویسے تقویم ہجری و عیسوی سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۴ رجب کو سہ شنبہ کا دن ۱۲۳۳ھ میں پڑا تھا جو ۲۰ مئی ۱۸۱۸ء کے برابر ہے۔ اسی تاریخ کو منگل کا دن ۱۸۲۱ء میں بھی تھا۔ لیکن اسے ہم نے اس وجہ سے تسلیم نہیں کیا[۱] کہ اس سے پہلے ۱۸۲۰ء میں نسخہ حمیدیہ وجود میں آچکا تھا۔ اسی نسخے کا سنہ لازماً نسخہ حمیدیہ سے پہلے کا ہونا چاہیئے۔ عرشی صاحب نے مقدمہ دیوانِ غالب میں لکھا ہے:۔

> "میرزا صاحب کی سخن سرائی کا آغاز ۱۲۲۲ھ (۱۸۰۷ء) ۱۲۲۴ھ (۱۸۰۹ء) اور ۱۲۲۷ھ (۱۸۱۲ء) میں سے کسی ایک سال میں ہوا تھا۔ ان میں سے راجح قول یہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ تقریباً دس برس کی عمر سے شعر گو تھے کیونکہ کلیات فارسی کا اظہار جو سب سے قدیم ہے، یہی ثابت کرتا ہے۔"[۲]

---

[۱] ایک اندرونی شہادت سے اتنا طے ہے کہ یہ نسخہ یکم صفر ۱۲۳۵ھ (مطابق ۱۹ نومبر ۱۸۱۹ء) سے پہلے وجود میں آچکا تھا۔ اس لئے کہ ورق ۱۴ الف کے حاشیے پر ایک مختصر سی یادداشت ملتی ہے جس میں صاف ہندسوں میں لکھا ہے: "لعل خاں بتاریخ اوّل صفر سنہ ۱۲۳۵ھ درماہہ ع‍‍ــہ" اس سے ظاہر ہے کہ مذکورہ تاریخ کو غالب نے لعل خاں نامی کسی شخص کو ڈھائی روپے ماہوار تنخواہ پر ملازم رکھا تھا، اور بطور یادداشت اپنے دیوان کے حاشیے پر اس کے تقرر کی تاریخ درج کرلی تھی۔ یہ اسی وقت ممکن ہے جب ہم یہ فرض کریں کہ یکم صفر ۱۲۳۵ھ سے پہلے دیوان کا مسودہ لکھا جاچکا تھا۔ اور ایسا تسلیم کرنے میں کوئی امر مانع نہیں ہے۔ غرض ۱۸۱۸ء ہماری نظر میں زیادہ قرین قیاس تاریخ ہے۔

[۲] مقدمہ دیوان غالب نسخہ عرشی /۱۳

ہم اگر یہ بھی تسلیم کرلیں کہ مرزا نے پندرہ سال کی عمر سے ۱۸۱۲ء میں شعر گوئی کا آغاز کیا، اور انھیں دیوان فراہم کرنے کا خیال آیا تو چھ سال کی مدت میں ۱۸۱۸ء تک ان کا پہلا دیوان مرتب ہو جانا بالکل خدا لگتی بات ہے اس کے تعین میں ان کے تخلص سے بھی مدد مل سکتی ہے۔ مرزا غالب نے لکھا ہے:

"میں نے تو کوئی دو چار برس ابتدا اسدؔ تخلص رکھا ہے، ورنہ غالبؔ ہی لکھتا رہا ہوں۔" [۱]

دو چار برس تو غالب نے یونہی لکھ دیا ہے۔ نسخۂ امروہہ میں ہر جگہ اسدؔ تخلص آیا ہے۔ اور جہاں کہیں غالب ہے وہ مصرع بعد میں کاٹ کر تبدیل کیا گیا ہے۔

دیوان غالب کی تدوین سے بحث کرتے ہوئے مولانا عرشی تحریر فرماتے ہیں:-

"مرزا صاحب نے ردیف وار اردو دیوان صفر ۱۲۳۷ھ (۱۸۲۱ء) میں صاف کرایا تھا۔ اسکی اصل کوئی مردّف دیوان تھا یا وہ بیاض تھی جس میں بترتیب نظم اشعار لکھے گئے تھے۔ اس سوال کا جواب دینے کیلئے ابھی تک کوئی مالہ نہیں مل سکا۔ لیکن یہ بات پایۂ ثبوت کو پہونچ چکی ہے کہ میرزا صاحب نے ۱۲۳۷ھ سے قبل کے کہے ہوئے متعدد شعر اس میں شامل نہیں کئے تھے۔ چنانچہ "یادگار نالہ" کے وہ شعر جو عمدہ منتخبہ عیار الشعراء اور دوسرے قدیم ماخذوں سے نقل کئے گئے ہیں، اس دعوے کا بین ثبوت ہیں۔" [۲]

"نسخہ امروہہ" وہی اصل دیوان ہے جس سے ۱۲۳۷ھ والا نسخہ صاف ہوا تھا۔ اور یہی وہ گمشدہ کڑی ہے جس کے منظرِ عام پر آنے سے مندرجۂ بالا سوالوں کا جواب بخوبی مل جائے گا۔ اور یہ عقدہ بھی حل ہو جائیگا کہ قدیم تذکروں میں جو اشعار ایسے ملے ہیں جن سے نسخہ حمیدیہ خالی ہے وہ کہاں سے نقل ہوئے تھے،

تادمِ تحریر یہ دُرِ بیش بہا جناب توفیق احمد صاحب قادری امروہوی کی ملکیت ہے اور ابھی یہ کہنا مشکل ہے کہ کس خوش نصیب فرد یا ادارے کے پاس یہ محفوظ ہو گا؟"

(ماہنامہ آجکل دہلی جون ۱۹۶۹ء)

---

[۱] اردوئے معلیٰ ۱/ ۱۳۷ (طبع لاہور) [۲] مقدمہ دیوان غالب نسخہ عرشی ۱۹/

جیسا کہ خود مولانا نثار احمد فاروقی نے اپنے مذکورہ بالا خط (بنام نادم سیتاپوری) میں تحریر فرمایا ہے۔

"میں نے "آجکل" والا مضمون تو سرسری لکھا تھا اس میں بعض غلطیاں بھی رہ گئی ہیں۔۔۔۔۔۔!"

غلط نہیں ہے اس مضمون کی تکمیل کے وقت ان کے سامنے صرف "نسخۂ عرشی" تھا نسخۂ حمیدیہ نہیں تھا ورنہ شاید یہ سہو نہ ہوتا۔ فاروقی صاحب نے "نو دریافت" دیوان سے نسخۂ حمیدیہ کا تقابل کرتے ہوئے یہ دو شعر بھی نسخۂ حمیدیہ کے حوالے سے لکھے ہیں۔

خموشی خانہ زادِ چشمِ بے پروانگاہاں ہے
غبارِ سرمہ یاں گردِ سوادِ "برگستان" ہے

جہاں تک نسخۂ حمیدیہ کا تعلق ہے اس میں (برگستان) نہیں "نرگستان" ہے۔
اسی طرح یہ شعر ــــــ!

دیوانگاں ہیں حاملِ رازِ نہانِ عشق
اے بے تمیز گنج کو "پروانہ" چاہئے

نسخۂ حمیدیہ میں "ویرانہ" ہے پروانہ نہیں؟

مولانا نثار احمد فاروقی کے بیان میں کچھ تضاد بھی معلوم ہوتا ہے۔ مثلاً انھوں نے نسخۂ امروہہ میں تقریباً پندرہ[۱۵] غیر مطبوعہ غزلوں کی نشاندہی کی ہے ــــ لیکن مولانا امتیاز علی خاں عرشی کا ارشاد ہے۔

"غزلوں میں سے بیس غیر مطبوعہ ہیں ان میں سے کچھ پر خطِ تنسیخ کھینچ دیا گیا ہے جو اس کی علامت ہے کہ اس سے جو نسخہ نقل کیا جائے اس میں یہ غزلیں شامل نہ ہوں مگر ایک قلمزد غزل آئندہ نقل ہوئی ہے۔۔۔۔۔" (ماہنامہ آجکل دہلی جولائی ۱۹۶۹ء)

یہ اور اسی قسم کی دوسری باتیں یقیناً ایسی نہیں ہیں جن کے بارے میں "نسخۂ امروہہ" دیکھے بغیر کوئی صحیح رائے قائم کی جائے ــــ لیکن مولانا فاروقی نے اس مضمون میں "آبِ حیات" کی جس روایت کی تردید ضروری سمجھی ہے کم از کم میں تو ان کے اس

استدلال کو غیر ضروری اور بے محل سمجھنے کے علاوہ غیر منطقی بھی سمجھتا ہوں۔ فاروقی صاحب نے لکھا ہے :-

"ایک اور غلط فہمی نسخۂ امروہہ کی دریافت کے بعد دور ہو جانی چاہیئے۔ یہ جو سمجھا جاتا ہے کہ غالبؔ کا متداول دیوان مولانا فضل حق خیر آبادی اور مرزا خانی (خان) کوتوال کی فرمائش بلکہ "فہمائش" سے تیار ہوا — اسے ذرا احتیاط کے ساتھ قبول کیا جائے۔ ان حضرات کے مشورے یا غالبؔ کے دوسرے احباب کی صلاح ممکن ہے کسی حد تک معاون ثابت ہوئی ہو؛ لیکن یہ بالکل عمر کی پختگی کے زمانے میں ہوا۔ اور نسخۂ امروہہ کی ترتیب یقیناً ۱۸۱۶ء اور ۱۸۱۸ء کے درمیان ہو چکی تھی اس وقت غالبؔ آگرے سے (دہلی میں) نو وارد تھے — اور ان حضرات سے ملاقات کئی برس کے بعد ہوئی نسخۂ امروہہ میں جو کانٹ چھانٹ ہے اسے دیکھئے بلکہ نسخۂ حمیدیہ اور اس سے آگے بڑھ کر نسخۂ شیرانی اور "گلِ رعنا" کو دیکھئے — بلکہ نسخۂ امروہہ سے لے کر نظامی پریس کانپور میں طبع ہونے والے ایڈیشن تک — جو غالبؔ کی زندگی میں شائع ہونے والا آخری ایڈیشن ہے — حک و اصلاح اور ترمیم و تبدل کا عمل برابر جاری رہا ایسا محض احباب کے مشورے سے نہیں"؛

مولانا فاروقی نے آب حیات اور یادگار غالب کی جن روایتوں کی تردید کے لئے "نسخۂ امروہہ" کے موضوع کا استعمال فرمایا ہے اسے صحت مند زاویۂ استدلال قرار نہیں دیا جاسکتا۔ آزاد اور حالی کی ان روایات سے کبھی یہ مترشح نہیں ہوتا کہ مولانا فضل حق خیر آبادی اور خانی خان کوتوال "ہمہ وقت" غالب کی فہمائش (بقول فاروقی) کیا کرتے تھے۔ نسخۂ امروہہ۔ نسخۂ حمیدیہ۔ گل رعنا، غالب کی زندگی میں چھپنے والے پانچویں ایڈیشن — اور خود غالب کے خطوط سے ثابت ہے کہ غالب کی فکر انگیزیوں پر خود ان کے قلم سے برابر جلا ہوتی رہی۔ فن شعر میں چونکہ انھوں نے کبھی کسی استاد کے سامنے زانوئے تلمذ تہ نہیں کیا تھا اس لئے اپنے کلام کی دیکھ ریکھ اور نظر ثانی کا فرض ہمیشہ خود ہی انجام دیتے رہے۔ مولانا فضل حق خیر آبادی سے انھیں جو فطری لگاؤ تھا اس میں ایک اعتماد بھی تھا۔

اور ایسا احترام بھی کہ انھوں نے اپنے استاد کی فضیلت علمی کی مثال کے لئے مولانا خیر آبادی کے نام کا انتخاب کیا۔ کہیں کہیں ایسی مثالیں بھی ملتی ہیں کہ انھوں نے مولانا خیر آبادی کے "مشورہ سخن" کو بلا کم و کاست قبول بھی کر لیا ہے۔ لیکن اس کے باوجود آج تک کوئی بھی یہ نہ کہہ سکا کہ مولانا فضل حق خیر آبادی یا خانی خان کو توال سے غالب کو "افتخار تلمذ" حاصل تھا! پھر ــ غالب کے اس نو دریافت مخطوطے پر غالب کے قلم کی اصلاحیں ــ "نسخہ حمیدیہ" اور 'گل رعنا' میں رد و بدل ـ مطبوعہ دواوین کی ترمیمات! سمجھ میں نہیں آتا کہ ان سے یہ نتیجہ کس طرح نکالا جا سکتا ہے کہ حالی اور آزاد نے متداول دیوان کے انتخاب کا واقعہ غلط لکھدیا ــ؟ اور یہ روایت سرتاپا غلط ہے کہ مروجہ اردو دیوان کا انتخاب مولانا فضل حق خیر آبادی اور خانی خان کے دوستانہ مشورے سے کیا گیا؟

اس کے برعکس یہی ترمیمات تبدیلیاں اور نظر ثانی کے شواہد دراصل اس حقیقت کے غماز ہیں کہ غالب کی مشکل پسندی کو ابتداء ہی میں جس تنقیدی دور کا سامنا کرنا پڑا ذہنی طور پر اس کا رد عمل برسہا برس جاری رہا ــ وہ بار بار اپنے کلام پر نظر ثانی کرتے رہے۔ کچھ اشعار کو قلمزد بھی کیا۔ کچھ نئے اضافے بھی کئے اور "ذہنی ارتقاء" کے اس ماحول میں انھیں کافی مدت تک اپنے فن کا جائزہ لینا پڑا! اس کا ایک ردعمل اور بھی ہوا۔ اور خاص طور پر اس وقت جب ان کے دیوان کی اشاعت (۱۸۴۱ء) کا مسئلہ سامنے آگیا؟ ان حالات میں "احباب" سے مشورہ بھی کوئی تعجب خیز بات نہیں؟ اور نہ یہ امر کہ ان کی صلاح و مشورے سے ابتدائے مشق سخن کا کچھ حصہ انتخاب سے نکال دیا گیا؟

اب رہا مولانا نثار احمد فاروقی کا یہ ارشاد ــ!

> "لیکن یہ بالکل عمر کی پختگی کے زمانے میں ہوا۔ اور نسخہ امروہہ کی ترتیب یقیناً ۱۸۱۶ء اور ۱۸۱۸ء کے درمیان ہو چکی تھی۔ اس وقت غالب آگرے سے نو وارد تھے اور ان حضرات سے ملاقات کئی برس بعد ہوئی۔ نسخہ امروہہ میں جو کانٹ چھانٹ ہوئی ہے اسے دیکھئے۔ پھر نسخہ حمیدیہ اور اس سے آگے بڑھکر نسخہ شیرانی اور گل رعنا کو دیکھئے بلکہ نسخہ امروہہ سے لیکر

نظامی پریس کانپور میں چھپنے والے ایڈیشن تک جو غالب کی زندگی میں شائع ہونے والا آخری ایڈیشن ہے "حک و اصلاح" اور ترمیم و تبدیل کا عمل برابر جاری رہا۔ ایسا محض احباب کے مشورے سے نہیں۔"

حالی اور آزاد کی روائتیں متعلق ہیں اردو دیوان غالب کے پہلے مطبوعہ ایڈیشن سے! اور مولانا فاروقی نے اس کی "سرحد نتائج"، کو نسخۂ امروہہ سے ملا دیا ہے۔ پھر ستم یہ کہ اشعار سے اس کا جو ثبوت پیش کیا ہے وہ ان کے نکالے ہوئے نتائج کی نفی کرتا ہے: اگر نسخۂ امروہہ اور نسخۂ حمیدیہ کی تمام غزلیں جوں کی توں اردو دیوان کے پہلے ایڈیشن میں شامل کردی گئیں ہوتیں تو یقیناً "انتخاب" کا واقعہ من گھڑت ثابت ہو جاتا — لیکن جب ایسا نہیں ہے تو ظاہر ہے کہ پہلے ایڈیشن کی اشاعت کے وقت تک جو کچھ کلام موجود تھا اس سے انتخاب کر لیا گیا۔ ترمیم و نظرِ ثانی کا میدان اس کے بعد بھی وسیع تھا جس کا سلسلہ زندگی بھر جاری رہا۔ یہ اور بات ہے کہ غالب کے آخری ایام زندگی کے مسودات آج دستیاب نہیں ہیں۔

مستقل طور پر غالب نے آگرہ چھوڑ کر دلی کب بسائی۔؟ اس کی صحیح تاریخ کا تعین تو نہیں کیا جا سکتا مگر ۱۸۱۱ء - ۱۸۱۲ء تک دلی آجانا ثابت ہے۔ اس سے قبل سات آٹھ سال کی عمر سے وہ برابر دلی آتے جاتے رہے؟ غالب کا خاندان بھی اس دور کی دلی میں نامور تھا اور مولانا فضل حق خیر آبادی کا گھرانہ بھی؛ مولانا فضل حق خیر آبادی کے والد ماجد مولانا فضل امام خیر آبادی نہ محض دلی کے اکابرین و عمائدین میں تھے بلکہ ان کی علمی فضیلت اور ایشیا میں معقولات کی سب سے بڑی درسگاہ ایسی نہ تھی جو اس عہد کی دلی میں مرکز نگاہ نہ ہو! غالب اور فضل حق ایک ہی سال پیدا ہوئے دونوں میں جو مخلصانہ اور عزیزانہ رکھ رکھاؤ تھا وہ اس کا عکاس ہے کہ شعور کی آنکھ دونوں نے ایک ہی ماحول میں کھولی۔ قیاس یہی کہتا ہے کہ غالب جب دلی پہنچے تو ان کے ابتدائی ہم عمروں میں مولانا فضل حق اور مفتی صدر الدین آزردہ دو ہی شخصیتیں ایسی تھیں جنکی یاد ساری زندگی انھیں تڑپاتی رہی۔ یوں تو غالب اتنے "وسیع المشرب" انسان تھے کہ دلی پہنچتے ہی انھوں نے ایک اچھا خاصا حلقۂ احباب قائم کر لیا تھا جن میں صہبائی بھی تھے، مومن بھی — اور

نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ وغیرہ۔

مگر جیسا ربط ضبط مفتی صدر الدین مولانا فضل حق خیر آبادی اور ناظر حسین مرزا سے تھا اس کی مثال شاید ہی ملے۔

"نسخۂ حمیدیہ" کے سلسلے میں آج جیسی جیسی قیاس آرائیاں کی جاری ہیں انھیں دیکھتے ہوئے یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ "نسخۂ امروہہ" کے سلسلے میں مولانا امتیاز علی خان عرشی رام پوری کا وہ مضمون بھی پیش کر دیا جائے جو کسی وقت بھی "غالبیات" میں دستاویزی اہمیت حاصل کر سکتا ہے۔

"غالب کی یہ انتہائی خوش قسمتی ہے کہ انتقال پر سو برس گذر جانے کے باوجود ہر سال اس کے یا اس کے کلام کے بارے میں ہماری معلومات میں اضافہ ہو جاتا ہے ابھی کچھ دن پہلے تک غالب دوستوں کا علم یہ تھا کہ دیوانِ غالب اُردو کا سب سے پُرانا مخطوطہ وہ ہے جو ریاست بھوپال کے سرکاری کتب خانے میں دستیاب ہوا اور مفتی انوار الحق مرحوم کی تصحیح و ترتیب کے ساتھ ۱۹۲۱ء میں چھاپ کر شائع کیا گیا تھا۔ اس کی کتابت حافظ معین الدین خوشنویس نے ۵ صفر ۱۲۳۷ھ (یکم نومبر ۱۸۲۱ء) کو انجام کو پہنچائی تھی۔

غالب کی اپنی تحریروں کے مطابق وہ رجب ۱۲۱۲ھ[1] (دسمبر ۱۷۹۷ء) میں پیدا ہوئے تھے، اس حساب سے نسخۂ بھوپال میں جو کلام مندرج ہوا، وہ ان کی تقریباً ۲۴ برس کی عمر تک کا کہا ہوا تھا۔ چونکہ اس نسخے میں تصحیح و ترمیم اور حذف و اضافہ اشعار و غزلیات کا عمل جا بہ جا کیا گیا تھا، اس لئے اس کی اہمیت بہت تھی۔ میں

---

[1] یہاں ضمناً یہ عرض کرتا چلوں کہ مرزا صاحب نے اپنی تاریخ پیدائش یکشنبہ ۸ رجب ۱۲۱۲ھ بتائی ہے نیز کلیاتِ فارسی میں شائع شدہ زائچے میں اسے آغاز ۱۷۹۸ء کے مطابق کہا گیا ہے ازروئے حساب نہ تو ۸ رجب کو یکشنبہ پڑتا ہے، اور نہ یہ تاریخ آغاز ۱۷۹۸ء کے مطابق ہوتی ہے۔ مختلف اہلِ علم نے اس بارے میں مختلف توجیہیں کی ہیں، میری دانست میں مرزا صاحب کی تاریخ پیدائش ہشتم نہیں بلکہ ہژدہم رجب ہے اس تاریخ کو یکشنبہ بھی تھا اور یہ ۷ جنوری ۱۷۹۸ء کے مطابق ہوتی ہے، جو بقولِ غالب آغازِ سال قرار دیا جا سکتا ہے۔

نے جنوری ۱۸۴۹ء میں ناگپور سے واپسی پر دو روز بھوپال میں قیام کرکے اس کے نوٹ لئے تھے، جن کا حوالہ نسخۂ عرشی میں موجود ہے اور جن کی بنیاد پر میں ایک مضمون بھی لکھ چکا ہوں۔ غالب کاروں کی بدقسمتی کہ ریاست مرجر کے زمانے میں یہ جوہرِ نایاب گم ہوگیا۔ انا اللہ۔

اہل علم کا خیال تھا کہ مذکورہ نسخہ پہلا مردف دیوان ہے؛ جو غالب نے اپنی ابتدائی بیاض سے مرتب کیا۔ چنانچہ عمدہ منتخبہ وغیرہ کے ان شعروں کے بارے میں جو اس نسخے میں نہ تھے یہ گمان کیا گیا یا نسخۂ مذکور میں انھیں شامل نہیں کیا گیا یا اُس ترتیب کے بعد کہے گئے تھے۔

چند دن ہوئے امروہہ کے ایک نوادر فروش توفیق احمد صاحب قادری چشتی کو کہیں سے دیوان غالب کا اس سے بھی زیادہ نادر اور اہم نسخہ دستیاب ہوا ہے۔ اِس نسخہ میں ۶۳ ورق ہیں۔ غزلوں کا اندراج بیشتر ترچھا بیاض نما ہے۔ مکتوبہ حصّے کا طول ۶،۴ اور عرض ۴،۲ انچ ہے۔ اگر حاشیے کو بھی ناپ میں شامل کرلیا جائے تو طول ۹ انچ اور عرض ۶،۲ انچ ہے۔ ابھی حال میں اکبر خاں سلمہٗ نے اس مخطوطہ کا نسخۂ حمیدیہ سے مقابلہ کرنے سے پہلے نئی جلد بندی کرائی اور نیا حوصہ ڈلوایا اس طرح یہ مخطوطہ زیادہ محفوظ ہوگیا۔ چنانچہ نئی جلد بندی کے باعث طول ۵،۱۲ انچ اور عرض ۷،۹ انچ ہوگیا ہے۔ اس میں غزلوں کی تعداد ۲۵۴ ہے ان میں سے ۲۴۰ متن میں مندرج ہیں۔ اُردو رباعیاں گیارہ ہیں، مگر خدا جانے کیوں، ۱۳ فارسی رباعیاں بھی اُردو رباعیوں سے قبل تحریر کردی ہیں۔

غزلوں میں سے ۲۰ غیر مطبوعہ ہیں۔ ان میں سے کچھ پر خطِ تنسیخ کھینچ دیا گیا ہے جو اس کی علامت ہے کہ اس سے جو نسخہ نقل کیا جائے، اس میں یہ غزلیں شامل نہ ہوں، مگر ایک قلمزد غزل آئندہ نقل ہوئی ہے۔ نسخۂ زیرِ بحث میں مطبوعہ غزلوں کے کچھ نئے شعر بھی دستیاب ہوئے ہیں، بارہ فارسی رباعیاں ہیں — جو کلیات نظم فارسی کے کسی قلمی یا مطبوعہ نسخے میں موجود نہیں ان میں اس انداز کی

بھی ہیں ؂

گفتم کہ اسد گفت دل آشفتۂ من
گفتم بنفش، گفت : بخوں خفتۂ من
گفتم سخنش بایں نزاکت گفتن
گفت : ایں ہمہ مدعائے ما گفتۂ من

مرد آں کہ بوہم خود ہراساں نبود
دربندِ طلسم نفع نقصاں نبود
ہمواریٔ وضع را تغافل شرط است
اے مدعیان، کریم نے مدن نبود

یہ اردو رباعیاں پہلی بار اس نسخے سے غالب دوستوں کی خدمت میں پیش کی جاتی ہیں۔

بے گریہ کمال ترجبینی ہے مجھے
در بزمِ وفا خجل نشینی ہے مجھے
محروم صدا رہا بغیر از یک یار
ابریشمِ ساز موے چینی ہے مجھے

گلخن شرر اہتمام بستر ہے آج
یعنی تب عشق شعلہ پرور ہے آج
ہوں دردِ ہلاکِ نامہ بر سے بیمار
قارورہ مرا خونِ کبوتر ہے آج

جن غزلوں کو متروک قرار دیا ہے ان کے چیدہ چیدہ شعر ملاحظہ کیجئے: ؂

تنک ظرفوں کا رتبہ حد سے بڑھ کر نہیں ہوتا
حبابِ مے بصد بالیدنی ساغر نہیں ہوتا

نہ رکھ چشمِ حصولِ نفع صحبتہائے مُمسک سے
لبِ خشکِ صدف آبِ گہر سے تر نہیں ہوتا

عمر بھر ہوش نہ یک جا ہوئے میرے کہ اسدؔ
میں پرستندۂ روئے صنمِ چند رہا

عیاں کیفیتِ میخانہ ہے جوئے گلستاں میں
کہ مے عکسِ شفق ہے، اور ساغر ہے حباب اس کا

کہاں ہے دیدۂ روشن کہ دیکھے بے حجابانہ
نقابِ یار ہے از پردہ ہائے چشمِ نابینا

آتی نہیں نیند اے شبِ تار افسانۂ زلفِ یار سر کر

پریشانی اسدؔ در پردہ ہے سامانِ جمعیت
کہ ہے آبادیٔ صحرا، ہجوم خانہ بر دوشاں

چمنِ دہر میں ہوں سبزۂ بیگانہ، اسدؔ
وائے اے بیخودی وتہمتِ آرامیدن

رہنے دو گرفتار بزندانِ خموشی
چھیڑو نہ مجھ افسردۂ دزدیدہ نفس کو

اشک چکیدہ، رنگ پریدہ
ہر طرح ہوں میں از خود رمیدہ
جوشِ جنوں سے جوں کوتِ گل
سر تا بپا ہوں جیب دریدہ

یارو، اسد کا نام و نشاں کیا
بیدل فقیر آفت رسیدہ
کرے کیا دعویٰ آزادیٔ عشق
گرفتار الم ہائے زمانہ
دیکھ اے اسد بدیدۂ باطن کہ ظاہرا
ہر ایک ذرّہ غیرتِ صد آفتاب ہے

پے بہ مقصد بردنی ہے خضر مے سے اے اسد
جادۂ منزل ہے خطِّ ساغرِ گل کے تلے

دیکھا نہیں ہے ہم نے بہ عشقِ بتاں اسد
غیر از شکستہ حالی و حسرت کشیدگی

تماشائے جہاں مفتِ نظر ہے — کہ یہ گلزار باغِ رہ گزر ہے
ہوئی یک عمر صرفِ مشقِ نالہ — اثر موقوف بر عمرِ دگر ہے

اِس بیان سے یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ نودریافت نسخہ از روئے زمانہ نسخۂ حمیدیہ سے مقدم ہے، اس دعوے کا مزید ثبوت یہ ہے کہ جو غزلیں نسخۂ مذکور اور حمیدیہ میں مشترک ہیں، ان کے مختلف شعروں کا متن زیرِ بحث نسخے میں پہلے اور تھا، بعد میں مرزا صاحب نے ترمیم کردی۔ حمیدیہ میں وہ شعر ان ترمیم شدہ الفاظ کے ساتھ لکھے گئے ہیں، مثلاً:

۱۔ نسخۂ حمیدیہ میں ہے ؎

مرے دِل نے مرے تارِ نفس سے غالب
ساز پہ رشتہ پئے نغمۂ بیدل باندھا

نودریافت نسخے میں مصرعِ اوّل پہلے یوں تھا:

"وہ نفس ہوں کہ اسد زمزمۂ فرصت نے"

پھر اسے قلمزد کر کے دوسرے مصرع کے نیچے لکھا:

"وہ نفس ہوں کہ اسد مطرب دل نے مجھ سے"

حمیدیہ کا مصرع اِن دونوں کی اصلاح کے بعد کہا گیا ہے۔ بہرحال دوسرا مصرع نسخۂ مذکور میں پہلے اس طرح تھا:

"رشتہ بر سازِ پئے نغمۂ بیدل باندھا"

بعدازاں اسے حمیدیہ کے مصرعِ ثانی کے مطابق کر دیا۔ جب کہ حمیدیہ میں متنِ اوّل نہیں متنِ ثانی ہے تو اس کا مطلب نکلتا ہے کہ حمیدیہ کا متن بعد کا ہے۔

۲- حمیدیہ کا شعر ہے:

اسیرِ بے زباں ہوں، کاش کے صیادِ بے پروا
بدامِ جوہرِ آئینہ ہو جائے شکار اپنا

موجودہ نسخے میں پہلے مصرع اول یوں تھا:

"گرفتارانِ الفت بیزباں ہیں کاش صیاد ے"

پھر اسے قلمزد کر کے حاشیے پر لکھا ہے "اسیرِ بے زبانی ہوں، مگر صیاد بے پروا" اس سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ حمیدیہ میں تبارہ اصلاح ہوئی ہے۔

۳- حمیدیہ میں ہے ؎

تمنائے زباں محوِ سپاسِ بیزبانی ہے
مٹا جس سے تقاضا شکوۂ بیدست و پائی کا

نسخۂ امروہہ میں پہلے "بیزبانی ہا" تھا۔ اسے کاٹ کر "بے زبانی ہے" بنایا ہے دوسرے مصرع میں موجودہ نسخے کے اندر "مٹا" کی جگہ "گیا" ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بعد کی اِصلاح ہے۔

۴- حمیدیہ میں ہے ؎

اُگے اک پنبۂ روزن سے بھی چشمِ سفید آخر
حیا کو انتظارِ جلوہ ریزی کے گمیں پایا

نسخۂ نو دریافت میں پہلے یوں تھا "اُگے چشمِ سفید از پنبۂ روزن تماشا ہے"

پھر آخری الفاظ قلمزد کر کے جو متن قرار دیا۔ حمیدیہ میں وہی نقل ہوا ہے۔

۵۔ حمیدیہ میں ہے ؎

لکھی یاروں کی بدمستی نے میخانے کی پامالی
ہوئی قطرہ فشانی ہائے مے باران سنگ آخر

نسخۂ مذکور میں مصرع اوّل پہلے یوں تھا:

"زبدمستیٔ مینوشاں ہوا ویرانہ مے خانہ"

اسے قلمزد کر کے حاشیہ پر وہ مصرع لکھا ہے جو حمیدیہ کے متن میں ہے۔

اس نسخے کے حمیدیہ سے اقدم ہونے کی ایک اور دلیل ہے کہ اس کی ہر غزل میں اسد تخلص لکھا گیا ہے۔ غالب تخلص کی کوئی ایک غزل بھی متن کے اندر نظر نہیں آتی۔ اس کے برخلاف حمیدیہ میں دونوں تخلص استعمال ہوئے ہیں ہاں اس نسخے کے کچھ مقطعوں میں میرزا صاحب نے اصلاح کر کے بجائے اسد کے غالبؔ تخلص ڈالا ہے۔ حمیدیہ میں یہ مقطعے غالبؔ تخلص کے ساتھ نقل ہوئے ہیں، جو اس بات کا ثبوت ہے کہ حمیدیہ عمر میں چھوٹا ہے۔ مثلاً:

۱۔ نسخۂ مذکور میں پہلے تھا ؎

شمع ہوں تو بزم میں جا پاؤں مانندِ اسد
بے محل، اے مجلس آرائے نجف جلتا ہوں میں

بعد ازاں مانند اسد کو قلمزد کر کے اوپر لکھا: "غالبؔ کی طرح" نسخۂ حمیدیہ میں یہ آخری شکل ملتی ہے۔

۲۔ نسخۂ مذکور میں پہلے تھا ؎

جنونِ فرقتِ یارانِ خستہ ہے کہ اسد
بہ رنگِ دشتِ دلِ پُرغبار رکھتے ہیں

بعد ازاں "کہ اسد" کی جگہ غالب بنا دیا۔ حمیدیہ میں غالب ہی ہے۔

۳۔ نسخۂ مذکور میں پہلے تھا ؎

اسد وہ گل کرے جس گلستاں میں فرمائی چٹخنا غنچۂ گل کا صدائے خندۂ دل ہے

اس کے بعد پہلے مصرع کو قلمزد کر کے حاشیئے پر لکھا ہے
"وہ گُل جس گلستاں میں جلوہ فرمائی کرے غالبؔ"

حمیدیہ میں یہی مصرع نقل ہوا ہے۔

۴۔ مذکورہ نسخے میں پہلے تھا ؎

وہ دیکھ کے حُسن اپنا ہوتا ہے اسدؔ مغرور
صد جلوۂ آئینہ یک صبحِ جُدائی ہے

پھر "اسد مغرور" کو قلمزد کر کے بین السطور میں لکھا: "اپنا مغرور ہوا غالبؔ"۔ حمیدیہ میں یہی الفاظ ملتے ہیں۔

۵۔ نسخۂ مذکور میں تھا ؎

اسدؔ، اس فصل میں کوتاہیِ نشو و نما سمجھو
اگر گُل بہ قد شمشاد پیراہن نہ ہو جائے

پھر اس کو یوں کر دیا ؎

سمجھ اس فصل میں کوتاہیِ نشو و نما غالبؔ
اگر گُل سرو کی قامت پہ پیراہن نہ ہو جائے

اوپر جو کچھ میں نے عرض کیا ہے اس کے پڑھنے والوں کو یہ معلوم ہو گیا ہو گا کہ نسخۂ مذکور زمانے کے لحاظ سے حمیدیہ سے پرانا ہے اور یہ کہ اس میں غالبؔ کی ترمیمیں بھی ہیں جس کا مطلب یہ نکلتا ہے کہ یہ خود شاعر کا نسخہ ہے۔ یہاں مجھے دو دلچسپ باتیں کہنا ہیں۔

پہلی یہ کہ برخلاف حمیدیہ اس نسخے کی تمام اصلاحیں بالیقین غالبؔ کے معروف خط میں خود اپنے ہاتھ کی ہیں۔ دوسری بات یہ کہ نہ صرف اس کی ترمیمیں اور اصلاحیں بلکہ پورا نسخہ شاعر کے قلم کا نوشتہ ہے۔ چنانچہ نسخے کے آخر میں حسبِ ذیل عبارت ملتی ہے:۔

"بتاریخ چہاردہم رجب المرجب یوم سہ شنبہ سنہ ہجری وقت دوپہر روز باقی ماندہ فقیر بیدل اسد اللہ خاں عرف مرزا نوشہ

متخلص بہ اسد عفی عنہ از تحریر دیوان حسرت عنوان خود فراغت یافتہ بہ فکر کاوش مضامین دیگر رجوع بجناب روح میرزا علیہ الرحمۃ آورد۔ فقط"

اس عبارت سے صراحت کے ساتھ معلوم ہو جاتا ہے کہ نسخۂ زیر بحث کا کاتب خود غالب ہے اور یہ ایسا شرف ہے جو اس کے قلمی نسخہ ہائے دیوان میں سے کسی کو بھی حاصل نہیں ہوا۔

اس خاتمے کے اوپر لفظ سنہ کے اوپر ہندسے لکھے ہوئے نہیں ہیں، غالب نے ایسا کیوں کیا۔ اس کی وجہ سمجھ میں نہیں۔ الّا یہ کہ کتاب ختم کرتے وقت سرخوشی کے عالم میں ہوں، اور سنہ یاد نہ رہا ہو، بہرحال انھوں نے دن تاریخ اور ماہ کی صراحت کردی ہے کہ منگل کے دن ۱۴ رجب کو اس کام سے فراغت پائی، ہمارے علم میں یہ تو آچکا ہے کہ یہ نسخہ صفر ۱۲۳۷ھ (۱۸۲۱ء) سے پہلے کا ہے، جو حمیدیہ کی تاریخ کتابت ہے۔ خود اس دیوان کے ورق ۱۴۱ الف کے بائیں حاشیے میں بخط غالب تحریر ہے "لعل خاں بتاریخ اوّل صفر ۱۲۳۵ھ درماہیہ عہ۸" اس تحریر سے جہاں ان کی جوانی کے ایک ملازم کا نام اور تنخواہ کا علم ہوتا ہے وہاں یہ بھی یقین ہو جاتا ہے کہ دیوان مذکور یکم صفر ۱۲۳۵ھ سے پہلے کا مکتوبہ ہے۔ جنتری بتاتی ہے کہ سنہ سے چار برس پہلے ۱۲۳۱ھ میں منگل کے دن رجب کی ۱۴ تاریخ تھی، لہٰذا ہم باطمینان یہ کہہ سکتے ہیں کہ نسخۂ مذکور میرزا صاحب نے منگل ۱۴ رجب ۱۲۳۱ھ کو تمام کیا، جو ۱۱ جون ۱۸۱۶ء کے مطابق ہے۔

یہ بات اوپر بیان کی جاچکی ہے کہ میرزا صاحب رجب ۱۲۱۲ھ میں پیدا ہوئے تھے اور اس دیوان کے اتمام کے وقت ان کی عمر قمری حساب سے ۱۹ برس ہوگی۔ دیوان کی غزلوں کو پڑھ کر حیرت ہوتی ہے کہ اتنی کم عمری میں خاصے مقامات پر شاعر کا تخیل کتنا گہرا اور طرز ادا کتنی دلآویز اور پختہ ہے۔ اگر نسخہ حمیدیہ گم نہ ہوا ہوتا تب بھی یہ نسخہ اس لئے قابل قدر تسلیم کیا جاتا کہ یہ اقدم بھی تھا اور خود بقلم شاعر بھی۔ لیکن اب تو صرف یہی نسخہ ہے جو ہر لحاظ سے

بے بہا اور نایاب ہے۔"

(ماہنامہ آجکل دہلی جولائی ۱۹۶۹ء)

نو دریافت نسخۂ امروہہ بلاشبہ غالب صدی کی ایک ایسی دین ہے جسے حاصل کر کے غالب شناس اور غالب پرست غالبیات کی اس منزل پر پہنچ گئے ہیں۔ جہاں غالب کے فن کا ارتقائی جائزہ آسانی کے ساتھ لیا جا سکے گا۔

عزیزی جناب اکبر علی خاں کے خط سے معلوم ہوا کہ مذکورہ بالا نسخۂ امروہہ کا نام بدل کر "نسخۂ عرشی زادہ" کر دیا گیا ہے۔ اور اس مخطوطہ کا ایک عکسی ایڈیشن اسی نام سے جناب اکبر علی خاں نے شائع کر دیا ہے۔

کتاب پریس جا رہی ہے اور "نسخۂ عرشی زادہ" کا مطبوعہ ایڈیشن ہنوز میری نظر سے نہیں گذرا، اس لئے یہ چند سطور صرف نام کی تبدیلی کے سلسلے میں اضافہ کر دی گئی ہیں۔

نادم سیتاپوری
یکم نومبر ۱۹۶۹ء

تحقیق طلب

یہ ایک قطعہ اور ایک غزل غالب کے غیر مطبوعہ کلام کی حیثیت سے ماہنامہ "ماہ نو" کراچی کے دو مختلف شماروں میں شائع کی گئی تھی جن پر تفصیلی نوٹ بھی دیئے گئے ہیں۔

پہلا قطعہ جناب فکری سلطان پوری کو کسی قلمی بیاض میں دستیاب ہوا تھا لیکن اس بیاض کے سلسلے میں ضروری تفصیلات فراہم نہیں کی گئیں۔ مدیر "ماہ نو" نے اپنے نوٹ میں قاسم اور تپاں کے بارے میں جو تفصیلات پیش کی ہیں وہ اس ثبوت کے لئے یقیناً ناکافی ہیں کہ یہ غالب ہی کا کلام ہے؟ مدیر "ماہ نو" نے اسے غالب سے منسوب کرنے کے لئے صرف رنگ سخن اور وجدان ذوق کا سہارا لیا ہے۔

جناب فکری سلطانپوری سے مجھے نیاز حاصل ہے وہ ایک اچھے شاعر تو ضرور ہیں مگر "تحقیق و ریسرچ" کی ذمہ داریوں کا بار ڈالنا میں سمجھتا ہوں ان پر ظلم ہوگا۔ جناب فکری سلطان پوری کا قیام ابھی چند مہینے ادھر تک لکھنؤ میں تھا پتہ ذیل پر ان سے رجوع کیا جا سکتا ہے اور اس قدیم بیاض کے متعلق ضروری تفصیلات پر ان سے معلومات حاصل کی جا سکتی ہیں۔

پتہ: جناب فکری سلطان پوری کلرک بابو ہرگووند دیال ایڈوکیٹ، کچہری روڈ لکھنؤ (یو۔پی) انڈیا

دوسری نامکمل غزل میرے مرحوم دوست جناب مولانا عبدالرزاق راشد حیدرآبادی کی دریافت ہے۔ مولانا راشد مرحوم کا قلمی نام "ناظر عالم" بھی تھا مرحوم سے میرے تعلقات کا آغاز بھی اسی قلمی نام (ناظر عالم) کے توسط سے ہوا تھا بعد میں جب تعلقات زیادہ بڑھ گئے تو مرحوم نے اس راز کا انکشاف فرمایا کہ ناظر عالم اور عبدالرزاق راشد حیدرآبادی دو علیحدہ شخصیتیں نہیں ہیں بلکہ ایک ہی شخصیت کے

دو نام ہیں۔ میرے پاس راشد مرحوم کے کئی ایسے خطوط بھی موجود ہیں جو انھوں نے "ناظر عالم" کے نام سے مجھے لکھے تھے۔

راشد مرحوم کو غالب اور ڈاکٹر اقبال کے فن فکر سے جو گہرا لگاؤ تھا اس کا ادنیٰ ثبوت یہ ہے کہ انھوں نے اپنی زندگی کا بڑا حصہ "غالبیات اور اقبالیات" کی جستجو میں صرف کیا اور انھیں یہ امتیاز بھی حاصل تھا کہ انھوں نے تقریباً نصف صدی ادھر اقبال کا کلیات شائع کر کے انھیں ان کے صحیح مقام تک پہنچانے میں اہل علم و ادب سے اشتراک عمل کیا۔

زیر بحث غزل کے بارے میں جو تفصیلات راشد مرحوم کے ذریعہ دستیاب ہونا ظاہر کی گئی ہیں۔ ان پر کوئی رائے زنی کرنا اس وقت تک دشوار ہے جب تک کہ اس مخطوطے کی تفصیلات فراہم نہ کر لی جائیں۔

افسوس کہ راشد حیدر آبادی اب ہم میں موجود نہیں ہیں۔ پھر بھی حیدر آباد (دکن) کے ارباب تحقیق اس سلسلے میں کچھ نہ کچھ ضرور کر سکتے ہیں۔

———(۱)———

دیکھنے میں ہیں گرچہ دو۔ پھر بھی ہیں دونوں یار ایک
وضع میں گو ہوئی دو سر۔ تیغ ہے ذوالفقار ایک

ہم سخن اور ہم زباں حضرت قاسم و تپاں
ایک طپش کا جانشیں درد کی یادگار ایک

نقد سخن کے واسطے ایک عیار آگہی
شعر کے فن کے واسطے مایۂ اعتبار ایک

ایک وفا و مہر میں تازگئی بساط دہر
لطف و کرم کے باب میں زینت روزگار ایک

گل کدۂ تلاش کو ایک ہے رنگ ایک بو
عرصۂ قیل و قال کو خسرو نامدار ایک

گلشن اتفاق میں ایک بہار بے خزاں
میکدۂ وفاق میں بادۂ بے خمار ایک

زندۂ شوق شعر کو ایک چراغِ انجمن
کشتۂ ذوق شعر کو شمع سر مزار ایک
دونوں کے دل حق آشنا۔ دونوں رسولؐ پر فدا
ایک محب چار یار۔ عاشق ہشت و چار ایک
جان وفا پرست کو ایک شمیم نو بہار
فرق ستیزہ مست کو ابرِ تگرگ بار ایک
لایا ہے کہکے یہ غزل شائبہ ریا سے دور
کرکے دل و زباں کو آج غالب خاکسار ایک

کلام غالب ـ ایک نادر قطعہ

"ذیل کی "غزل" جو در اصل قاسم و تپاں نامی دو حضرات کی توصیف میں ایک قطعہ ہے ہمیں جناب فکری سلطانپوری نے ایک قلمی بیاض سے نقل کرکے بھیجا ہے اب سے پہلے بھی غالب کے بعض ایسے اشعار برآمد ہوئے ہیں۔ جو انھوں نے خوش طبعی کے لئے یا ایسے عنوانات پر کہے جو براہ راست ادبی عنوانات میں شمار ہو سکتے ہیں. ظاہر ہے اس قطعہ بند کی شان بھی ایسی نہ تھی کہ غالب اسے اپنے دیوان میں شامل کرتے ـ مگر یہ اپنی جگہ پرلطف اور من وعن غالب کے لب و لہجے میں ہے اور اس لحاظ سے بڑی نادر چیز ہے۔

شان نزول اس قطعہ کی تحقیق طلب ہے۔ یہاں قاسم سے مراد غالباً وہی میر قاسم علی ہیں جن کا ذکر غالبؔ نے تفتہؔ۔ منشی نبی بخش حقیر اور مولوی عبدالرزاق شاکر کے نام اپنے خطوں میں کیا ہے۔ "نادرات غالبؔ" مؤلفہ آفاق دہلوی میں تحریر ہے کہ میر صاحب ایک عرصے تک آگرہ اور ہاتھرس میں منصف رہے بعد میں صدر امین کے عہدے پر فائز کردیئے گئے۔ شعر گوئی کا بھی شوق تھا دہلی بھی آتے رہتے تھے۔

ناظرین تپاںؔ کا کچھ سراغ بتائیں تو دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ خم خانہ جاوید مولفہ سری رام میں اس تخلص کے دو شاعروں کا ذکر ہے۔

طپش جن سے ممدوحین میں سے ایک کو تلمذ تھا غالباً مرزا محمد اسمٰعیل عرف طپش ہیں جن کے متعلق اس تذکرہ میں ذیل کا حوالہ ملتا ہے۔

"مرزا محمد اسمٰعیل معروف بہ مرزا جان ۔ والد مرزا یوسف بیگ دراصل بخارا کے رہنے والے تھے۔ طپش کی ولادت شاہجہاں آباد دہلی میں ہوئی ۔ نسبی سلسلہ سیّد جلال الدین جلال بخاری سے ملتا ہے۔ بقول فیلن ۱۱۸۲ھ میں ولادت ہوئی خواجہ میر درد سے تلمذ ہے۔ سنسکرت میں فی الجملہ مہارت تھی۔ (مدیر)

(ماہ نو کراچی فروری ۱۹۵۶ء جلد ۸ شمارہ ۱۱)

(۲)

غالبؔ کی ایک غیر مطبوعہ غزل

نسخہ سوزشِ دل در خورِ عنّاب نہیں
سرِ سودا زدہ آتشکدۂ تاب نہیں

ہمّت و حوصلۂ شورشِ شبنم معلوم
قلزم اشکِ نم دیدۂ خوننناب نہیں

. . . .

شب تاریک خیالِ دل مہتاب نہیں
پرسشِ عشق سے ہے ان کو فراغت مقصود
ہدیۂ پارۂ دل نازشِ جلباب نہیں

. . . .

شمع یہ زیب دہِ مجلس احباب نہیں
ہمّت و شوقِ طلبگاریٔ مقصود کہاں
برق خرمن زنِ بے تابیٔ سیماب نہیں

. . . .

تار تمکین حریفِ سر مضراب نہیں

گلشن ہستی عالم ہے دبستان نشاط
نقشِ گُل رونقِ بے مشقیٔ طلاب نہیں

. . . .

غم ہی اک چیز ہے دنیا میں جو کمیاب نہیں

غالب کی ایک غیر مطبوعہ غزل

استدراک (صفحہ ۱۲)

"پچھلے صفحہ پر غالب کی جو "مبینہ" غزل درج ہے ہمیں جناب ناظرؔ عالم نے حیدر آباد دکن سے ارسال کی ہے۔ موصوف نے اس سلسلے میں ایک خط بھی لکھا ہے جس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ یہ کس حد تک مستند ہے۔ خط حسب ذیل ہے۔

مکرمی۔ تسلیم! آپ کے کرم نامہ مورخہ ۲۵ر اپریل کا جواب کل کی ڈاک سے روانہ کر چکا ہوں۔ آج میں نے اس وابستگی کے مدنظر جو آپ کو غالب کے کلام و کمال سے ہے حضرت راشد (مولوی عبدالرزاق صاحب راؔشد) سے عرض کیا کہ کچھ غیر مطبوعہ کلام غالب عنایت فرمائیں تاکہ جناب خاور (رفیق خاور ایڈیٹر ماہ نو) کو ارسال کیا جائے۔ موصوف نے کہا کہ بہت سا کلام جو بڑی محنت و جانفشانی سے جمع کیا تھا ضائع ہو چکا ہے ایک دو غزلیں نسخہ حمیدیہ مطبوعہ بھوپال کے سادہ اوراق پر میں نے لکھ لی تھیں ان میں سے ایک غزل بھیجدو۔ میں نے اسے غنیمت جانا اور ایک ایسی غزل کی نقل لی ہے جس میں نو شعر ہیں مگر چار شعر کے مصرعے نہیں ہیں۔ اس کا سبب پوچھنے پر حضرت راشد نے فرمایا کہ سنو۔ یہ غزل مجھے کیسے ملی۔ میاں دادخاں سیاحؔ شاگرد میرزا غالب کے ایک رشتہ دار ظفر یاب خاں نامی ریاست حیدرآباد دکن کے صیغہ تعمیرات میں ملازم تھے۔ آج سے ۴۰۔ ۴۲ سال پہلے رسالہ ادیب نکالتے تھے۔ خانصاحب موصوف کے کتب خانے میں ایک مجلہ کتاب ملی جس کے اندر دیوان

غالب اور دیوان ذوق کے علاوہ ناسخ۔ آتش۔ آباد کا کلام تھا۔ دیوان غالب کے ایک حاشیے پر غزل غیر مطبوعہ غالب دہلوی کے عنوان سے ۹ شعر لکھے تھے مگر کسی بیداد جلد ساز نے جلد بناتے وقت حاشیہ کا ایک حصہ بری طرح کتر دیا تھا کہ چار مصرعے کٹ گئے جو اشعار اور مصرعے باقی تھے ان کی نقل کرلی گئی۔ اس تحقیق کے لئے کہ یہ کلام میرزا غالب ہی کا ہے؟ ظفریاب خاں اڈیٹر ادیب سے رجوع کیا گیا۔ خاں صاحب موصوف نے اثبات میں جواب دیا اور کہا غالب کے سوا ایسے شعر اور کون تصنیف کرسکتا ہے۔ ان کی بات چیت سے یہ بھی ترشح تھا کہ میرزا غالب کا قلمی دیوان ان کے پاس تھا جو میاں داد خان سیاح سے ملا ہوگا۔ مگر وہ اس کو بہت چھپاتے تھے۔ جب کبھی دیوان کا ذکر آتا وہ موضوع سخن بدل دیتے۔ افسوس کہ چند سال پہلے ان کا انتقال ہوگیا اور ان کی مجلد کتاب بھی غتر بود ہوگئی۔ تلاش کے باوجود نہیں ملی۔ تحقیق کا دوسرا ذریعہ یہ تھا کہ حضرت استاذی علامہ نظم طبا طبائی شارح غالب سے رجوع کیا جائے موصوف نے غزل دیکھکر فرمایا کہ یہ یقینی مرزا غالب کا کلام معلوم ہوتا ہے۔ غزل اس کی پشت پر لکھکر بھیج رہا ہوں آپ چاہیں تو مزید تحقیق کرکے اس کو شائع کردیں اور دلدادگان غالب کو دعوت دیں کہ کسی کے پاس پوری غزل ہو تو وہ مطلوبہ چار مصرعے بہم پہنچائیں۔"

آخری سطور میں دلدگان غالب سے جو التماس کی گئی ہے اس میں ہم بھی بھی شریک ہیں اور امید کرتے ہیں کہ ارباب نظر اس غزل کے غالب کی تصنیف ہونے پر بھی رائے زنی کریں۔ (مدیر)

(ماہنامہ "ماہ نو" کراچی۔ فروری ۱۹۵۳۔ جلد ۵ شمارہ ۱۱)

(ختم شد)

طابع: سید صابر علی مشہور آفسٹ لیتھو پریس کراچی